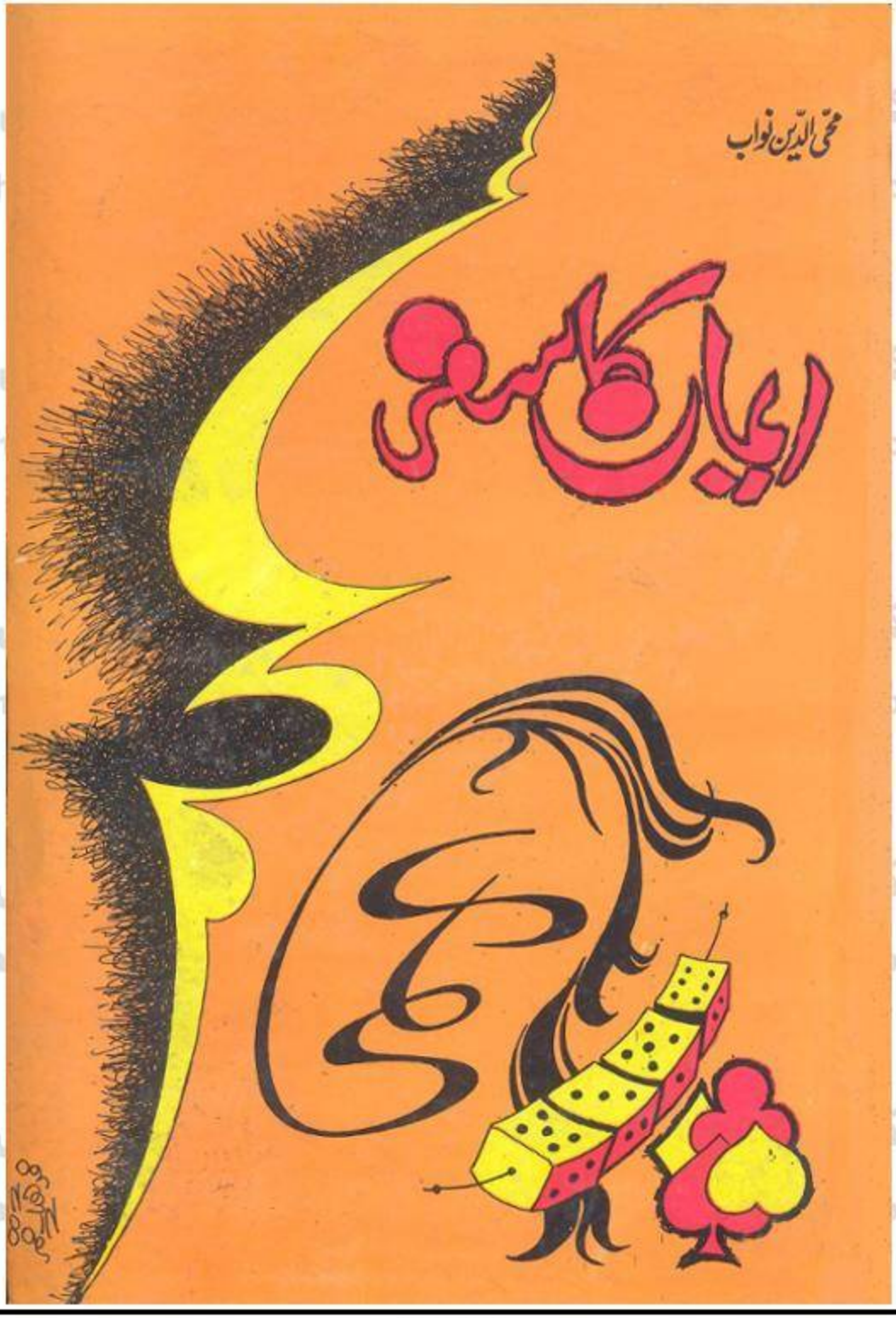
محی الدین نواب
ایمان کا سفر

محی الدّین نواب کے نشتر سے تیز قلم کا شاہکار.....خوبصورت نقابوں کے پیچھے گھناؤنے چہروں کو بے نقاب کرتی
ہمارے اپنے معاشرے میں بکھرے ہوئے اچھے برے کرداروں پر مشتمل 5 خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com

ایمان کا سفر

محی الدّین نواب

کتابیات پبلی کیشنز، کراچی

نوٹ:

اس کتاب کے جملہ حقوق بحق مصنف (محی الدین نواب) اور پبلشرز (کتابیات پبلی کیشنز، کراچی) محفوظ ہیں۔ جناب محی الدین نواب نے اردو زبان اور ادب کی ترویج کیلئے اس کتاب کو kitaabghar.com پر شائع کرنے کی خصوصی اجازت دی ہے، جس کے لئے ہم انکے بے حد ممنون ہیں۔

(مطبوعہ مجموعے میں 10 کہانیاں شامل ہیں، یہاں پہلی 5 کہانیاں پیش کی جارہی ہیں، باقی 5 کہانیاں الگ سے پیش کی جائیں گی)

کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com

محی الدین نواب کی تازہ ترین تصاویر (مارچ 2010)

فہرست

نمبر شمار		صفحہ نمبر
01	حرف اول	05
02	انتساب	06
03	ایمان کا سفر	07
04	چور رشتہ	77
05	سدا سہاگن	105
06	میٹھا زہر	131
07	آئینہ خانہ	152

آپ کے اشتہار / پیغام کی جگہ

کیا آپ کتاب گھر ذریعے ہزاروں لوگوں تک اپنا پیغام پہنچانا چاہتے ہی؟؟؟ کیا آپ اس جگہ پر اپنا اشتہار/ پیغام دیکھنا چاہتے ہیں؟؟؟ آپ اپنی کتاب، ویب سائٹ، فورم (میسج بورڈ) کاروبار یا کسی بھی قسم کے اشتہار/ پیغام کے لیے رابطہ کر سکتے ہیں۔ رابطہ کے لیے kitaabghar.com پر موجود Contact Us فارم استعمال کیجئے یا پھر kitaab_ghar@yahoo.com پر ای۔میل کیجئے۔

حرف اول

کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com

محی الدین نواب ایک زندہ اور روشن ادب پیش کرنے والے قلمکار کا نام ہے۔ دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جہاں جہاں اردو زبان کی کہانیاں پڑھی جاتی ہیں وہاں محی الدین نواب کو لوگ پڑھتے ہیں اور یاد رکھتے ہیں۔

اگرچہ زیرِ نظر کہانیاں پچھلے سالوں کے دوران ماہ بہ ماہ شائع ہو چکی ہیں تاہم کتابی صورت میں انہیں اس لئے محفوظ کیا جا رہا ہے تاکہ آئندہ نسلیں کہانیوں کے اس البم کو کھول کر پچھلے دور کے مزاج کو سمجھ سکیں۔

انسان پہلے بھی محنت کش تھا، اب بھی ہے۔ فرق صرف اتنا ہو گیا کہ وہ پہلے مزدور تھا، اب مشین بن گیا ہے۔ خواہ غریب ہو یا سرمایہ دار، سب ہی وقت کی رفتار کے ساتھ تیز رفتار بن گئے ہیں۔ اب ان کے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ وہ کہانیوں میں پیش کیے جانے والے مناظر کی تفصیلات ٹھہر ٹھہر کر پڑھ سکیں۔ وہ اپنے حالات کو اپنی تیز رفتاری کے مطابق پڑھنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نواب اس معاشرے کی کسی بھی ٹیڑھی رگ کو اپنی کہانی کا موضوع بناتا ہے تو لہو کی گرمی اور روانی کی طرح تیزی سے اپنے پڑھنے والے کو اس ٹیڑھی رگ کے آس پاس پہنچا دیتا ہے۔

عمر کی پختگی آدمی کو بے حد سنجیدہ بنا دیتی ہے پھر اس میں شوخی برائے نام رہ جاتی ہے۔ نواب نے اپنی عمر کے پچاس برس گزارے ہیں۔ نصف صدی کا چہرہ دیکھا ہے۔ زندگی کے بے شمار طمانچے کھائے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم، قحط بنگال اور قیام پاکستان ایسے تاریخی موڑ آئے جب وہ آگ اور خون کے دریاؤں سے گزرتا رہا۔ ان حالات میں آدمی ضرورت سے زیادہ سنجیدہ اور خشک مزاج ہو جاتا ہے لیکن نواب کی تحریر کی شوخیاں شاہد ہیں کہ وہ کانٹوں کے بستر سے گلاب کی شوخی رنگارنگی اور خوشبو نچوڑتا ہے اور اسے اپنے پڑھنے والوں تک پہنچاتا ہے۔

حالات نے اسے اتنا موقع نہیں دیا کہ وہ تحریر کا فن حاصل کرنے کے لئے کسی استاد کے آگے زانوئے ادب تہ کرتا۔ اس نے اپنے بزرگوں اور ہم عصروں کو پڑھ کر یہ مقام حاصل کیا ہے۔ رابندر ناتھ ٹیگور، پریم چند، بمل مترا، کرشن چند، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی وغیرہ اس کے غائبانہ استاد رہے۔ زندگی بہت کچھ سکھاتی ہے لیکن ان ادیبوں نے اسے سماجی شعور کو قلم کی نوک سے برتنے کا سلیقہ سکھا دیا ہے۔

نواب کے پاس نہ خیالات کی کمی ہے نہ الفاظ کی۔ لکھتے لکھتے نواب کا ہاتھ تھک جاتا ہے اور انگلیاں دکھنے لگتی ہیں لیکن خیالات کی فراوانی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اسی لئے نواب کو ٹیپ ریکارڈر کی مدد لینے پر مجبور ہونا پڑا۔ میری دانست میں نواب اردو کا واحد مصنف ہے جو اپنی کہانی ٹیپ ریکارڈ پر ٹیپ کراتا ہے اور اس ٹیپ سے یہ کہانیاں صفحۂ قرطاس پر منتقل ہوتی ہیں۔

نواب کی ایک اور خصوصیت اس کے کرداروں کی مانوسیت ہے۔ یہ کردار آفاقی یا تخیلاتی نہیں بلکہ زندہ اور مجسم ہیں۔ ہمیں اپنے اردگرد چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ نواب قارئین کو خواب دکھانے نامعلوم دنیا میں لے جانے کا قطعاً قائل نہیں۔ نواب کی باریک بین نگاہیں جس طرح

معاشرے اور افراد کا مشاہدہ کرتی ہیں اور ذہن ان کا تجزیہ کرتا ہے وہی بزبان قلم قارئین کے سامنے آجاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بہت مختصر سے عرصے میں نواب کی تحریر کی دھوم مچ گئی ہے اور اس نے ہر خاص و عام سے قبولیت کی سند حاصل کر لی ہے۔

موجودہ کہانیاں اگر آپ پہلے پڑھ چکے ہیں تو دوبارہ پڑھنے میں ایک نیا لطف محسوس کریں گے اور اگر پہلے نہیں پڑھ چکے تو آپ کو افسوس ہوگا کہ اتنی خوبصورت کہانیوں سے آپ اب تک کیوں محروم رہے۔

معراج رسول

کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com

☆ ☆ ☆

انتساب

اپنے جواں مرگ بیٹے جمیل الدین نواب کے نام

بیٹے!

تمہاری ماں اپنی مردہ کوکھ کے کتبے سے سر ٹیکے ابھی تک رو رہی ہے۔ وہ تخلیق کے کرب کو نہیں بھولے گی۔ روتے روتے ایک دن مر جائے گی۔

مگر میرے پاس آنسوؤں کے لئے زیادہ جگہ نہیں ہے۔ میں تمہارے بعد زندہ رہوں گا۔

اس بڑھاپے میں ان سے لڑتا رہوں گا جو تمہاری چھوڑی ہوئی دنیا کی خوبصورتی کو مٹانا چاہتے ہیں۔

محی الدین نواب

کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com

ایمان کا سفر

''میں ایک مسافر
سماج کے چکلے سے
برہنہ پا گزر رہا ہوں
اس لیے کہ ہزار ہا صدی سے
کانٹوں کی راہگزر سے
ایمان گزر رہا ہے''

اس کا نام ایمان علی رکھتے وقت اس کے باپ کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ ہوگی کہ وہ اس قدر ایمان دار نکلے گا۔ وہ ایسا ایمان دار تھا کہ سچ بول بول کر اپنوں کو دشمن بنا چکا تھا اور رزق حلال کے انتظار میں کئی کئی وقت فاقے کرتا رہتا تھا۔ ایمان اچھی چیز ہے فی زمانہ، اگر اس سے منافع حاصل ہو۔ مگر جہاں نقصان اٹھانا پڑتا وہاں بھی وہ ایمان ہی کی بات کرتا تھا۔ یہ آئے دن کی ایمانداری اسے ایک بے مصرف سوکھے پتے کی طرح ادھر سے ادھر اڑائے پھر رہی تھی۔

وہ سوکھا پتا حالات کے تھپیڑے کھاتا ہوا، شاہ پور کی ایک مسجد کے دروازے پر آ گرا تھا۔ مسجد کا بند دروازہ اپنی زبان بے زبانی سے کہہ رہا تھا ''مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے''۔ وہ پچھلی شام سے فاقے کرتا آ رہا تھا۔ صحت پہلے ہی ماشاءاللہ تھی، پانی پیتا تو وہ بھی خالی پیٹ میں ہلتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ تھوک نگلنا چاہتا تو حلق میں کانٹے چبھنے لگتے۔ اس کا سر چکرا رہا تھا، وہ بے دم ہو کر کہیں گر جانا چاہتا تھا لیکن ایمان والے کو گرنے کے لئے کسی پاک صاف جگہ کی ضرورت تھی لہذا وہ مسجد کے دروازے پر آ گرا۔

گرنے کے بعد بھی اس میں اتنی قوت برداشت تھی کہ وہ ہوش میں تھا۔ ایسی حالت میں انسان روٹی اور صرف روٹی کے متعلق سوچتا ہے۔ اگر روٹی نہ ملے تو وہ کسی کے مکان کا دروازہ توڑ کر وہ روٹیاں حاصل کرنا چاہتا ہے جو بھوسی کے ٹکڑے کے لئے چھوڑ دی جاتی ہیں لیکن وہ کسی مکان کا دروازہ دیکھنے کی بجائے مسجد کے دروازے کو ہی دیکھ رہا تھا اور یہ سوچ رہا تھا۔

یہ دروازہ بند کیوں ہے؟ نماز کا وقت ہو چکا ہے، نمازی کہاں ہیں؟ یہ مسجد ویران کیوں ہے؟ یہ تمام سوالات اس کے ذہن میں چکرا رہے تھے۔ اس کا سر بھی چکرا رہا تھا، ایسے ہی وقت ایک ادھیڑ عمر چہرے نے اس پر جھک کر پوچھا۔

''مسافر تم کون ہو؟''

ایمان علی نے اپنے خشک ہونٹوں کو زبان سے بھگوتے ہوئے اپنا نام بتایا۔ اس اجنبی نے سر ہلا کر کہا۔

''تم حلیے سے مولوی نظر آتے ہو، تمہارا نام بھی ایمان علی ہے۔ اور ایمان علی مسجد کے دروازے پر ہی آتا ہے۔ کیا تم نماز پڑھاؤ گے؟''

ایمان علی کے بھوکے چہرے پر ایک دم رونق آ گئی۔ اس کی زبان تالو سے چپک گئی تھی پھر بھی اس نے بڑی مشکل سے زبان ہلا کر جواب دیا۔

''یہ سعادت نصیب والوں کو ہی حاصل ہوتی ہے۔ آپ مجھے ایک گلاس پانی پلا دیں، میں اذان دے کر لوگوں کو نماز کے لئے پکاروں گا''۔

''تمہارے چہرے اور تمہاری آواز سے پتہ چل رہا ہے کہ تم یا تو بھوکے ہو یا بیمار۔ اذان کیسے دو گے؟ اگر بھوکے ہو تو میں ابھی روٹی لے کر آتا ہوں۔ پہلے کھانا کھا لو تا کہ نماز کے لئے کھڑے ہونے کے قابل ہو جاؤ''۔

''نماز کے لئے کھڑے ہونے کے لئے کھانے کی نہیں، ایمان کی ضرورت ہوتی ہے۔ بفضل خدا اب بھی مجھ میں اتنی ایمانی قوت ہے کہ پہلے میں نماز پڑھاؤں گا اور پھر روٹی کی خواہش کروں گا''۔

''وہ ایمان علی کو ایسی نظروں سے دیکھنے لگا جیسے کسی احمق کو دیکھ رہا ہو۔ اس دنیا میں جہاں انسان روٹی کھاتے کھاتے زندہ رہتا ہے اور روٹی کھاتے کھاتے مر جاتا ہے، وہ احمق مرتے مرتے بھی روٹی کی بجائے نماز کی تمنا کر رہا تھا۔

چونکہ کسی ایماندار احمق کو اس کے منہ پر احمق نہیں کہا جاتا لہذا اجنبی نے بات بناتے ہوئے کہا۔

''تم انسان نہیں فرشتہ ہو۔ سنا ہے فرشتوں کو بھوک پیاس نہیں لگتی، وہ ہمہ وقت عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ مگر تمہیں تو پیاس لگ رہی ہے، میں ابھی پانی لے کر آتا ہوں۔ یہ لو چابی، جب تک تم دروازہ کھولو''۔

وہ چابی دے کر پانی لینے چلا گیا۔ ایمان علی بڑی مشکل سے دیوار کا سہارا لے کر اٹھ کھڑا ہوا پھر تالا کھولنے لگا۔ وہ فقر و فاقے کا عادی تھا، اس کے باوجود کبھی کبھی بھوک چٹکیاں لیتی تھی جیسے کبھی کبھی بھولے ہوئے زخموں سے ہولے ہولے ٹیسیں اٹھتی ہیں۔ اسی طرح ایمان کے ہاتھوں سے تھپک تھپک کر سلائی ہوئی بھوک اچانک ہڑبڑا کر بیدار ہو جاتی تھی اور پیٹ کی آنتیں سکڑ کر اسے اور بھی نقاہت سے آگے کی طرف سکیڑ دیتی تھیں۔

دروازہ کھولنے کے بعد وہ نقاہت سے جھکتا اور ڈگمگاتا ہوا مسجد میں داخل ہوا۔ صحن کے پختہ فرش پر گرد جمی ہوئی تھی اور سوکھے پتے اس کی طرح ادھر سے ادھر ڈگمگا رہے تھے اور کراہتے ہوئے لڑھکتے جا رہے تھے۔ اتنے میں وہ اجنبی اس کے لئے پانی لے آیا۔ پانی نگلتے وقت اس کا حلق دکھ رہا تھا۔ وہ پیٹ میں پہنچ کر ٹھنڈک پہنچا رہا تھا مگر بھوک نہیں مٹا رہا تھا۔ ایمان علی نے سوچا کہ عصر کی نماز مختصر ہوتی ہے، نماز ادا کرنے کے بعد اسے فوراً روٹیاں مل جائیں گی۔ عصر کی مختصر سی نماز کے متعلق سوچتے ہوئے اچانک اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ عابد کو عبادت کا حساب نہیں کرنا چاہئے۔ عبادت کو ناپنے اور تولنے کا مطلب یہی ہے کہ تھوڑی دیر بعد ملنے والی روٹی کو عبادت کے برابر اہمیت دی جا رہی ہے۔

''توبہ توبہ''

توبہ کرنے کے بعد اس نے چبوترے پر کھڑے ہو کر اذان دی۔ اذان دینے کے بعد وہ ایک جھاڑو اٹھا کر فرش صاف کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد چند نمازی آ گئے۔ نئے مولوی کو دیکھ کر انہوں نے سلام کرتے ہوئے اور مصافحہ کرتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔ یہ بات سبھی نے محسوس کی کہ نیا مولوی بہت کمزور ہے یا پھر اندر سے بیمار ہے۔ پہلی ملاقات میں کوئی اس کے فاقہ زدہ چہرے کو دیکھ کر اس کے پیٹ کی آگ کو نہ سمجھ سکا۔ جب سب لوگ اس کے پیچھے نماز کے لئے کھڑے ہوئے تو رب کریم کی حمد میں دو آیتیں پڑھتے وقت اس کی زبان لڑکھڑانے لگی اور آواز کی کمزوری بتانے لگی کہ وہ کئی وقت کا بھوکا ہے۔

نماز پڑھنے کے بعد سبھی کی یہ خواہش تھی کہ وہ نئے مولوی کے لئے اپنے گھر سے روٹی لے کر آئیں لیکن وہ اجنبی جس نے اسے پانی پلایا تھا اور مسجد کا دروازہ کھولنے کے لئے چابی دی تھی۔ اس کا ملازم نماز کے دوران ہی اس کے گھر سے روٹیاں لے آیا تھا۔ جب وہ دوسرے نمازیوں کے ساتھ صحن میں آ کر بیٹھا تو اپنے سامنے دیکھ کر سوال کیا!

''وہ خدا کا نیک بندہ کون ہے جس کے گھر سے مجھے میرے حصے کا رزق مل رہا ہے''۔

اس اجنبی نے جواب دیا۔

''میرا نام چوہدری برکت علی ہے، میں یہاں زمیندار ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔ میرے دل میں ایمان کا جذبہ ہے اس لئے میں نے یہ مسجد بنوائی ہے''۔

ایمان علی نے کہا۔

''صرف مسجد ہی بنوائی ہے یا نماز بھی پڑھواتے ہو۔ اگر میں نہ آتا تو یہ مسجد اسی طرح ویران رہ جاتی''۔

چوہدری برکت علی نے کہا۔

''ایسی بات نہیں۔ کل تک یہاں ایک پیش امام رہتے تھے وہی نماز پڑھاتے تھے اور پنڈ کے بچوں کو دینی تعلیم بھی دیتے تھے لیکن پچھلے دنوں اس مولوی کے دل میں شیطان پیدا ہو گیا۔ اسی جگہ ایک دس برس کی بچی کو تعلیم دینے کے دوران اس نے ایسی ذلالت کا مظاہرہ کیا کہ جس کا ذکر ہم نہیں کر سکتے۔ بہر حال ہم نے اسے بری طرح ذلیل کر کے نکال دیا ہے۔ ہم میں سے کوئی اس قابل نہیں ہے کہ پیش امام کے فرائض انجام دے سکے اس لئے یہ مسجد کل صبح سے ویران پڑی ہے''۔

''ایسے مقدس مقام تک پہنچنے کے لئے شیطان ایک مولوی ہی کے بھیس میں آتا ہے لیکن اپنی شیطانی حرکتوں سے پہچانا جاتا ہے۔ بڑے افسوس کی بات ہے کہ ایک مولوی اپنی ذلالت سے دوسرے مولویوں کو بدنام کر دیتا ہے''۔

چوہدری برکت علی نے کہا۔

''آپ بھوکے ہیں پہلے کچھ کھا لیں بعد میں باتیں ہوتی رہیں گی''۔

ایمان علی نے سامنے رکھی ہوئی روٹیوں اور سالن کی پلیٹ کو دیکھا پھر سر اٹھا کر پوچھا۔

''کیا آپ روٹی کھا چکے ہیں؟''

''جی ہاں''

''کیا آپ کے پڑوسیوں نے کھالیا؟''

یہ سوال سن کر چوہدری برکت علی ذرا چکرا سا گیا پھر اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''جی ہاں جی ہاں، پڑوسیوں نے یقیناً کھالیا ہوگا''

''تم یہ بات قیاساً کہہ رہے ہو جبکہ تمہیں اس بات کا یقین ہونا چاہئے کہ تمہارا کوئی پڑوسی بھوکا نہیں ہے''۔

نمازیوں میں سے ایک نے کہا۔

''مولوی صاحب! میں چوہدری کا پڑوسی ہوں۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ ان کے پڑوسیوں میں سے کوئی بھوکا نہیں ہے۔ چوہدری صاحب بہت ہی ایماندار اور بہت ہی رحمدل انسان ہیں۔ غریبوں کا بہت خیال رکھتے ہیں''۔

دوسرے چار نمازیوں نے بھی اس کی تائید کی اور چوہدری برکت علی کی حمایت میں بہت کچھ کہنے لگے۔ جب ایمان علی کو اس بات کا یقین ہوگیا کہ روٹی لانے والے کا کوئی پڑوسی بھوکا نہیں ہے اور اس کے پاس جو لوگ بیٹھے ہوئے ہیں، وہ سب پیٹ بھر کر کھا چکے ہیں تو وہ بسم اللہ پڑھ کر فاقہ کشائی کرنے لگا۔ مسجد کے ساتھ ایک چھوٹا سا حجرہ بنا ہوا تھا جہاں سے ایک مولوی کو پچھلے دنوں نکالا گیا تھا، اب وہاں نئے مولوی کو رہنے کے لئے جگہ مل گئی تھی۔ ایمان علی روٹیاں کھانے کے بعد حجرے میں آیا تو اسے نہایت صاف ستھرا پایا۔ زمیندار کا ملازم صفائی کر گیا تھا۔ اب تب میں شام کا اندھیرا پھیلنے ہی والا تھا۔ ایمان علی نے حجرے کی وہ کھڑکی کھولی جو کعبہ کی سمت کھلتی تھی۔ کھڑکی کھولتے ہی اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں کیوں کہ عین نگاہوں کے سامنے ایک مکان تھا اور اس کچے مکان کے دروازے پر ایک پکی ہوئی عمر کی نوجوان لڑکی کھڑی ہوئی تھی۔ وہ لڑکی کیسی تھی؟ اس کے حسن کی تمتماتی ہوئی رنگت کیسی بھلی لگ رہی تھی۔ اس کی جوانی کتنے درجہ حرارت پر تھی؟ یہ سب کچھ ایمان علی نہ دیکھ سکا کیونکہ وہ پرائی بہو بیٹیوں کو ایک شاعر کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہتا تھا اسی لیے اس نے آنکھ بند کرتے ہی کھڑکی بھی بند کردی۔ طویل بھوک، پیاس اور دربدر کی ٹھوکروں نے اسے تھکا ڈالا تھا۔ پیٹ بھر کر روٹی کھانے کے بعد اس پر غنودگی طاری ہو رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں درد سے اینٹھ رہے تھے۔ سارے بدن میں عجیب سی بے چینی تھی۔ ایسی حالت میں نیند کبھی نہ آتی لیکن جب وہ بستر پر لیٹا تو سارے بدن کی تھکن نے اسے تھپک تھپک کر فوراً ہی سلا دیا۔ اس دن سے ایمان علی کی زندگی میں ذرا ٹھہراؤ پیدا ہوگیا۔ وہ روزانہ پانچوں وقت کی نمازیں پڑھاتا تھا، پنڈ والوں کے سامنے دین و ایمان کی باتیں کرتا تھا اور وہاں کے کسانوں کو سمجھاتا تھا۔

''تم یہاں ایسے بیج بوتے ہو جس کی فصل کا ایک حصہ بھی تمہارے پیٹ میں نہیں جاتا۔ تم بھوکے رہتے ہو، پیٹ کی آگ بجھانے کے لئے ہل چلاتے ہو اور پھر بھی خالی ہاتھ رہتے ہو۔ جس کھیتی باڑی سے تمہاری عاقبت ہری بھری ہوتی ہے تم وہ محنت کیوں نہیں کرتے؟ کبھی مسجد میں بھی آیا

کرو اور ثواب کی فصل کاٹا کرو"۔

وہ پنڈ میں جہاں سے گزرتا تھا لوگ اسے جھک کر سلام کرتے تھے۔ عورتیں لمبا سا گھونگھٹ نکال کر سر جھکائے ہوئے اس کے سامنے سے گزر جاتی تھیں۔ پھر آپس میں سرگوشیاں کرتی تھیں کہ مولوی جوان ہے مگر نیت کا کھوٹا نہیں ہے، کبھی سر اٹھا کر پرائی بہو بیٹیوں کی طرف نہیں دیکھتا۔ ہاں وہ یہی کوشش کرتا تھا کہ کسی کی طرف نہ دیکھے مگر وہ کھڑکی والی کسی نہ کسی طرح نظر آجاتی تھی۔ اس وقت وہ توبہ کر کے فوراً ہی نظر جھکا لیتا تھا۔ گرمی کی راتوں میں تو سب ہی مکان کے باہر چارپائیاں بچھا کر سوتے تھے۔ زمیندار نے اسے بھی سونے کے لئے ایک چارپائی دی تھی لیکن وہ نماز عشاء کے فوراً بعد ہی سونے کا عادی نہیں تھا۔ نماز پڑھ کر وہ حجرے میں آتا تو چوہدری برکت علی کا ملازم اس کے لیے کھانا لے آتا۔ کھانے سے پہلے وہ عادتاً ملازم سے پوچھتا۔

"تم کھا چکے ہو؟"

"جی مولوی صاحب!"

"اچھا اب تم جاؤ، میں کھالوں گا"۔

ملازم کے جانے کے بعد وہ روٹی اور سالن کو ڈھانپ کر رکھ دیتا پھر حجرے سے باہر نکل کر مسجد کے آس پاس جتنے مکانات ہوتے ان کے دروازے پر پہنچ جاتا۔ ان کے مکینوں سے ان کی خیریت دریافت کرتا اور ان سے کہتا۔

"میرے پاس خوراک سے دو روٹیاں زیادہ ہیں اگر آپ میں سے کسی کو ضرورت ہو تو بلا تامل میرے کھانے میں شریک ہو جائے۔ دروازے دروازے گھومنے کے بعد وہ مطمئن ہو جاتا کہ اس کے پڑوس میں کوئی بھوکا نہیں سو رہا ہے۔ مگر یہ نیکی اور شرافت اسے مہنگی پڑتی تھی کیونکہ اس نیک کام کے لئے اسے اس دروازے پر بھی جانا پڑتا تھا جہاں وہ لڑکی پہلے دن نظر آئی تھی۔

اس لڑکی کے ماں باپ بہت بوڑھے تھے۔ باپ اتنا بوڑھا تھا کہ اس کے ہاتھ کانپتے تھے پھر بھی وہ زمیندار کے مویشیوں کی دیکھ بھال کرتا تھا اور وہ لڑکی اس کی حویلی میں جھاڑو دینے اور برتن مانجھنے کا کام کرتی تھی۔ جب ایمان علی اس کے دروازے پر پہنچتا تو اکثر وہ لڑکی اپنے باپ کے بجائے خود چلی آتی اور اس سے کہتی تھی۔

"مولوی صاحب! تیری بڑی مہربانی ہم نے پیٹ بھر کر کھا لیا ہے۔ تو ہم سب کا کتنا خیال رکھتا ہے، پہلا مولوی تو بہت ہی کمینہ تھا"۔

اس کے سامنے ایمان علی کی نظریں نہیں اٹھتی تھیں۔ وہ سر جھکا کر اسے نصیحت کرتا۔

"کسی کو اسکی پیٹھ پیچھے گالی نہیں دینا چاہیے۔ ہر شخص کو اسکے برے اعمال کی سزا مل جاتی ہے لہذا ہمیں اپنی زبان کو گندا نہیں کرنا چاہیے"۔

پھر وہ اس کی طرف سے منہ پھیر کر ہچکچا کر کہتا۔

"دوپٹہ سلیقے سے اوڑھا کرو، سر پر سے آنچل نہیں ڈھلکنا چاہئے۔ اچھی بہو بیٹیوں کو اچھے طور طریقے سیکھنے چاہئیں"۔ یہ کہہ کر جب وہ اپنے حجرے کی طرف جانے لگتا تو ہزار بار سوچنے کے باوجود یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی کہ وہ نظر اٹھا کر تو دیکھتا نہیں ہے پھر وہ کیسے سمجھ جاتا ہے

کہ دوپٹہ سینے پر نہیں تھا اور سر سے آنچل ڈھلکا ہوا تھا۔

یہ بات کبھی اس کی سمجھ میں نہ آئی کہ نہ دیکھنے کے باوجود غیر شعوری طور پر ممنوعہ چیزوں کو چور نظروں سے دیکھ لیتا ہے۔ سانس لیتا ہوا سینہ دھونکنی کی طرح ابھر ابھر کر ڈوب رہا ہو تو دیکھنے والی نظریں شرافت سے جھک جھک کر بھی اٹھ اٹھ جاتی ہیں۔ بعد میں گزرا ہوا منظر ایک جوان مولوی کی جوان آنکھوں کے سامنے آدھی بلیو فلم کی طرح گزر جاتا۔ وہ دن رات کئی بار توبہ کرتا تھا مگر یہ کمبخت جوانی توبہ سے نہیں مانتی۔ توبہ سے شراب کے پیالے ٹوٹ جاتے ہیں مگر شباب کا پیالہ خیالی ٹھوکروں سے نہیں ٹوٹتا۔ وہ قبر جیسے تنگ حجرے میں پسینہ پسینہ ہو جاتا تھا۔ یاد الٰہی کے لئے مراقبے میں بیٹھ جاتا تو ذرا پرسکون ہونے کے بعد یہ بات اس کی سمجھ میں آتی کہ حجرے کی کھڑکی بند کر دینے سے وہ لڑکی اس دنیا سے مر نہیں جائے گی۔ کھڑکی بند ہو جائے تو آنکھیں کھلی رہیں گی۔ وہ آنکھیں بند کرے گا تو خیال کے دریچے کھل جائیں گے، خیال کو توبہ کے طمانچوں سے بھگائے گا تو آنکھوں سے نیند اڑ جائے گی۔ جب وہ اس دنیا میں پیدا ہو چکا ہے اور گیہوں کا دانہ کھا چکا ہے تو جوانی کی اس چیختی ہوئی عمر میں خواہشات کی چڑیلیں ضرور اس کا پیچھا کریں گی۔ ایسے وقت وہ سجدے میں گر کر اپنے رب کریم کے سامنے گڑگڑاتا تھا۔

''میرے معبود! میں نے تیری عبادت کے لئے زندگی کی تمام ضروریات کو کچل کر رکھ دیا ہے۔ یہ ایک ضرورت ایسی ہے جو پیچھا نہیں چھوڑتی۔ یہ خواہش ایک بھرے ہوئے غبارے کی طرح ہے، اسے جتنا دباتا ہوں وہ اتنا ہی اچھلتی ہے۔ جب تک میں شرع کے مطابق کسی شریف زادی سے نکاح نہ پڑھوالوں اس وقت تک میرے پائے استقلال میں لغزش نہ آنے دے میرے معبود!''

اللہ میاں بعض اوقات عجیب مذاق کرتے ہیں۔ اس کے گڑگڑانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے ہی دن وہ لڑکی روٹیاں لے کر اس کے حجرے میں آنے لگی۔ اسے دیکھتے ہی ایمان علی بوکھلا گیا۔ اس نے جلدی سے نظریں جھکا کر ہکلاتے ہوئے پوچھا۔

''تت۔ تم یہاں کیوں آئی ہو؟''

اس نے روٹیوں کا چھابہ اس کے سامنے رکھتے ہوئے جواب دیا ''چوہدری صاحب کا حکم ہے کہ میں روٹیاں پہنچایا کروں''۔ جب وہ روٹیاں رکھنے کے لئے اس کے سامنے جھک رہی تھی تو ایمان علی کی نظریں بے اختیار اٹھ رہی تھیں مگر وہ نظریں اٹھتے ہی گڑ بڑا گئیں۔ ایمان علی نے چیخ کر لاحول پڑھتے ہوئے اپنی آنکھوں کو اتنی سختی سے میچ لیا جیسے وہ ان آنکھوں کو اپنی کھوپڑی میں چھپا لینا چاہتا ہو۔ آنکھیں نہ چھپ سکیں بلکہ بند ہوتے ہی کچھ اور روشن ہو گئیں۔ دماغ کے وسیع آسمان پر غبارے اڑتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ذرا سی دیر میں پسینہ پسینہ ہو گیا اور غصے سے تھرتھراتے ہوئے کہنے لگا۔

''میں نے کئی بار سمجھایا ہے کہ دوپٹے کو اچھی طرح بدن پر لپیٹا کر۔ تیرے ماں باپ تجھے سمجھاتے نہیں ہیں؟''

وہ معصومیت سے بولی۔

''میری ماں کو نظر نہیں آتا۔ میرے باپ کو چوہدری نے کام سے الگ کر دیا ہے کیونکہ وہ اتنا بوڑھا ہو گیا ہے کہ ادھر ادھر بکھرے ہوئے مویشیوں کو پکڑ کر ایک جگہ نہیں لا سکتا۔ غریبی اور پریشانی سے اس کا سر ہمیشہ جھکا رہتا ہے۔ اس لئے وہ بھی میری طرف نہیں دیکھتا اور جو لوگ دیکھتے

ہیں وہ روکتے ٹوکتے نہیں۔ مولوی صاحب ایک تو ہی ہے جو ٹوکتا رہتا ہے۔ یہ لے میں نے اسے ٹھیک کر لیا ہے۔ اب تو آنکھ کھول دے"۔

اس نے آنکھ کھول کر کہا۔

"اب تو یہاں سے چلی جا میں روٹی کھالوں گا"۔

"چلی جاؤں گی تیرے حجرے کے پیچھے ہی تو میرا گھر ہے۔ چوہدری صاحب نے یہاں روٹیاں پہنچانے کے لئے کہا تو میں خوش ہوگئی کہ اس بہانے تجھ سے اچھی اچھی باتیں سیکھتی رہوں گی"۔

"سیکھنے کے لئے تیرا یہاں آنا ضروری نہیں۔ وہ دینو کہاں ہے جو روز یہاں روٹیاں لایا کرتا تھا"۔

"چوہدری صاحب نے اسے دوسرے کام سے لگا دیا ہے۔ اب سکینہ یہاں روٹیاں لایا کرے گی"

"کون سکینہ؟"

"میرا ہی نام تو ہے۔ میں تیرے سامنے بیٹھی ہوں اور مجھ ہی سے پوچھ رہا ہے کون سکینہ؟"

"اچھا اب نہیں پوچھوں گا، جا یہاں سے"۔

"چلی جاتی ہوں مگر مجھے کوئی اچھی سی بات بتا دے۔ میں بہت بری لڑکی ہوں، کوئی اچھا سا کام کرنا چاہتی ہوں"۔

"اچھا کام کرنا چاہتی ہے تو پردہ کیا کر۔ تجھے غیروں کے سامنے اس طرح نہیں آنا چاہئے"۔

"پردہ کروں گی تو حویلی کا کام کیسے کروں گی۔ وہاں تو کتنے ہی غیر مرد آتے جاتے رہتے ہیں۔ وہاں حویلی میں کام کرنے والی کوئی لڑکی پردہ نہیں کرتی"۔

"اچھا تو جہاں بہت زیادہ مجبوری ہو، وہاں نہ کرنا مگر یہاں میرے سامنے تو کر سکتی ہے"۔

"اچھی بات ہے، اب میں تیرے سامنے نہیں آؤں گی"۔

وہ غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی دروازے تک گئی پھر پلٹ کر وہاں سے بولی۔

"میں جا رہی ہوں پھر نہ کہنا سکینہ غصہ ہو کر چلی گئی ہے"۔

ایمان علی جواب دینے کے بجائے منہ پھیر کر روٹیاں کھانے بیٹھ گیا۔ کپڑے میں لپٹی ہوئی روٹیاں کھولتے وقت اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے، کان پیچھے کی طرف لگے ہوئے تھے کہ وہ جا چکی ہے یا اب تک کھڑی ہوئی ہے؟

"جا چکی ہے..... نہیں کھڑی ہوئی ہے۔ نہیں جا چکی ہے۔ نہیں وہ میرے جواب کا انتظار کر رہی ہے"۔

اف! اک ذرا سا منہ پھیر لینے سے کتنا تجسس پیدا ہو گیا تھا۔ شیطان اپنی خالہ کو حجرے کے دروازے پر چھوڑ گیا تھا۔ اگر وہ پلٹ کر دیکھتا تو اس کی کمزوری ظاہر ہو جاتی نہ دیکھتا تو روٹی حلق سے نیچے نہ اترتی۔ وہ عجیب تذبذب میں مبتلا ہو گیا تھا۔ وہ کڑوانوالہ تھی، اسے نگل نہیں سکتا تھا۔ وہ رس بھری تمنا تھی، اسے اگل نہیں سکتا تھا۔ آخر اس نے جھلا کر پلٹتے ہوئے کہا۔

''چلی جاؤ یہاں سے دور ہو جاؤ''۔

وہ ایک جھٹکے سے رک گیا دروازے کی چوکھٹ تصویر کے فریم کی طرح خالی تھی۔ وہ وقت کی طرح گزر چکی تھی۔ ایک دم سے اس کی بھوک مر گئی، پیاس اڑ گئی، ہاتھ میں لقمہ تھا، اس کو منہ تک لے جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ بھوک نہ ہو تب بھی انسان کھا لیتا ہے لیکن خواہش نہ ہو تو کسی طرح بھی نہیں کھا سکتا۔ اس نے کتنی ہی بار دل کو سمجھایا کہ کھانا کھا لینا چاہئے، اچھا ہوا وہ چلی گئی۔ اب اسے اطمینان سے پیٹ بھرنا چاہئے مگر بھوک کے باوجود پیٹ بھرا ہوا تھا البتہ سینہ خالی ہو گیا تھا۔

ہائے یہ کیا ہو گیا ہے؟ پہلے تو کبھی سینہ خالی نہیں ہوا تھا، پہلے تو بھوک نہیں لگتی تھی، پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا کہ سارے کا سارا جسم ایک جگہ بیٹھا رہے اور دل دوسری طرف چلا جائے۔ حد یہ ہے کہ اس کے سامنے بھوک مٹانے کے لئے خدا کی بھیجی ہوئی نعمت ہے اور وہ اس نعمت سے انکار کر رہا ہے۔ اسے کفران نعمت کہتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ایسی باتوں سے ناراض ہوتا ہے۔

یہ سوچتے ہی اس نے پھر ایک بار توبہ کی اور بسم اللہ پڑھ کر لقمہ منہ میں رکھ لیا۔ پھر وہ لقمہ چباتے چباتے نگلتا رہا اور سکینہ کو چباتے چباتے، خیال ہی خیال میں اسے حجرے سے باہر اگلتا رہا۔ بڑی مشکل ہے نفرت سے بھی یاد کرو تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اسے یاد کیا جا رہا ہے۔ کھانے کے بعد جب سونے کے لئے منجی پر لیٹ گیا تو اس وقت بھی وہ اسے نفرت سے یاد کر رہا تھا اور بڑی عقیدت سے آیت الکرسی پڑھ رہا تھا۔ اس اطمینان نے اسے سلا دیا کہ سکینہ آئندہ پردہ کیا کرے گی۔ دوسری صبح ناشتہ اور دوپہر کا کھانا دینو لے کر آیا مگر رات کو وہ پھر آ گئی۔ مگر اس طرح آئی کہ پہلی نظر میں وہ اسے پہچان نہ سکا۔ وہ سر سے پاؤں تک سفید چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ جس ہاتھ سے اس نے روٹی کا چھابہ لا کر اس کے آگے رکھا، وہ ہاتھ بھی چادر میں چھپا ہوا تھا۔ روٹیاں سامنے رکھنے کے بعد اس کی آواز سنائی دی۔

''میں حکم کی بندی ہوں، اپنے مالک کے حکم سے مجبور ہو کر یہاں تک آئی ہوں۔ بس اسی طرح اب آیا کروں گی''۔

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ ایمان علی آنکھیں..... پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ مگر دیکھتا کیا، اس کا تو ایک ناخن بھی نظر نہیں آیا تھا صرف سفید چادر ہی نظر آئی تھی۔ تب اس کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔ اسے یوں لگا، جیسے اس نے جیتے جی اپنی خواہش کو کفن پہنا دیا ہو۔ اپنے ہاتھوں سے اپنی آرزوؤں کو کچل کر اور انہیں دفنا کر کچھ حاصل تو نہیں ہوتا مگر جہاں دفنایا گیا ہے اس جگہ کو بار بار کریدنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ زندگی گزارنے کے لئے کوئی تو اذیت ناک تفریح کا سامان ہوں۔ وہ ایک دم سے بے چین ہو گیا جسے وہ چھپانا چاہتا تھا اب وہ چھپی ہوئی حالت میں برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ نہ اس کروٹ قرار آ رہا تھا نہ اس کروٹ سکون تھا۔ وہ فرشتہ صورت انسان جس نے اپنی زندگی کو تمام ضرورتوں سے خالی کر دیا تھا وہی خالی زندگی اب کانٹوں کا بستر بن گئی تھی۔ صرف ایک منہ زور ضرورت تھی جو اس بچھونے میں کانٹے کی طرح چبھ رہی تھی۔

اب جو کچھ بھی ہو رہا تھا اس میں سکینہ کا قصور نہیں تھا۔ سراسر ایمان علی کی غلطی تھی۔ ایک جلوے کو چھپانے کی کیا ضرورت تھی اور جب چھپا دیا تھا تو دیکھنے کو دل کیوں مچل رہا تھا۔ اگر دل مچل رہا تھا تو اب اسے اپنے بس میں رکھنا اس کا اپنا کام تھا صرف سجدے میں گڑگڑانے سے بھٹکے ہوئے خیالات کو لگام نہیں دی جا سکتی تھی۔

اس نے تہیہ کرلیا کہ وہ اپنے نفس کو مارنے کی پوری کوشش کرے گا حالانکہ اسلام میں نفس کشی جائز نہیں ہے۔ وہ شرعی پابندیوں میں رہ کر سکینہ کو حاصل کرسکتا تھا لیکن حاصل کرنے تک نفس کو مارنا ضروری تھا لیکن اسے اپنا یہ فیصلہ پسند نہیں آیا کیونکہ وہ بیوی بچوں کے جھمیلے سے دور رہنا چاہتا تھا جب تک وہ تنہا تھا خود پر ظلم کرکے زندگی کی ضرورتوں سے دور رہ سکتا تھا۔ ایک بیوی آتی تو وہ اپنے جہیز میں ضرورتوں کا ہجوم لے آتی۔ پھر بچوں کی تعداد بڑھنے لگتی تو وہ اپنی تمام آرزوؤں سے منہ موڑ سکتا تھا لیکن بیوی بچوں کے آئے دن مطالبات سے ہمیشہ آنکھیں بند کرکے نہیں رہ سکتا تھا اسی لئے وہ ایک بیوی کی ضرورت سے بھی کترا رہا تھا۔ اس نے سوچا یہ آزمائش کی گھڑی ہے اگر اس نے کسی طرح اپنا من مار لیا اور سکینہ کو اپنے دماغ سے جھٹکنے میں کامیاب ہوگیا تو پھر وہ خواہشات کا غلام نہیں رہے گا۔ یہی غلامی عورت کی غلامی تک لے جاتی ہے۔ اب یہ بات اطمینان کا باعث تھی کہ وہ پردہ کرنے لگی ہے اب وہ اسی طرح چادر میں لپٹی آئے گی اور روٹیاں رکھ کر چلی جایا کرے گی نہ وہ اسے دیکھے گا نہ اس کے لئے دل مچلے گا۔

اس دن سے وہ اپنے طور پر سنبھل گیا۔ مصمم ارادہ کرلیا کہ اب اس کے خیالات کو دل میں جگہ نہیں دے گا۔ تیسری رات بھی وہ اسی طرح چادر میں لپٹی ہوئی آئی اس نے خود کو چھپا لیا تھا مگر بولنے سے باز نہیں آتی تھی۔ روٹیاں رکھنے کے بعد اس نے کہا۔

''پتہ نہیں لوگ عورت سے اتنا ڈرتے کیوں ہیں اپنے اوپر بس نہیں چلتا تو اسے برقعے کے کفن میں لپیٹ دیتے ہیں۔ مردانگی تو یہ ہے کہ خود پر قابو رکھیں یا پھر اپنی آنکھیں پھوڑ لیں''۔

کتاب گھر کا پیغام

ادارہ کتاب گھر اردو زبان کی ترقی و ترویج، اردو مصنفین کی موثر پہچان، اور اردو قارئین کے لیے بہترین اور دلچسپ کتب فراہم کرنے کے لیے کام کر رہا ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ ہم اچھا کام کر رہے ہیں تو اس میں حصہ لیجئے۔ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ کتاب گھر کو مدد دینے کے لیے آپ:

۱۔ http://kitaabghar.com کا نام اپنے دوست احباب تک پہنچائیے۔

۲۔ اگر آپ کے پاس کسی اچھے ناول/کتاب کی کمپوزنگ (ان پیج فائل) موجود ہے تو اسے دوسروں سے شیئر کرنے کے لیے کتاب گھر کو دیجئے۔

۳۔ کتاب گھر پر لگائے گئے اشتہارات کے ذریعے ہمارے سپانسرز کو وزٹ کریں۔ ایک دن میں آپ کی صرف ایک وزٹ ہماری مدد کے لیے کافی ہے۔

وہ جلی کٹی سنا کر کوئی جواب سنے بغیر چلی گئی۔ وہ گاؤں کی اس جاہل اور بے وقوف عورت کو کیسے سمجھاتا کہ پردہ کرانے کی وجہ مردانگی کی کمی یا جنس کا خوف نہیں بلکہ حکم خداوندی کی تعمیل ہے۔ آواز میں بھی تو ایک سر ہوتا ہے، ایک رسیلی کشش ہوتی ہے جو چھپے ہوئے وجود میں سے رس رس کر کانوں میں شہد کی طرح ٹپکتی ہے زبان سے کچھ نہ کہتے ہوئے بھی یہ سمجھا دیتی ہے کہ وہ چادر کے پیچھے کتنی رس بھری ہے اسی لئے مرد عورت کے درمیان بلاضرورت گفتگو کو اسلام ناپسند کرتا ہے۔

پاگل ہاتھی کو اور پاگل خواہش کو کوئی روک نہیں سکتا۔ کسی نہ کسی بہانے وہ دماغ میں چٹکیاں لیتی رہتی ہے۔ جب وہ چوتھی رات بھی آ کر چلی گئی تب ایمان علی کی سمجھ میں آیا کہ وہ چھپنے کے بعد اور زیادہ جلوہ گر ہوگئی ہے۔ طور کا جلوہ ایک ہی بار نظر آیا تھا، وہ بھی ایک رات نظر آ کر دوسری تمام راتوں کے لئے چھپ گئی تھی۔ اب یہ حقیقت واضح ہوگئی تھی کہ بار بار دیکھنے رہنے سے اتنی تڑپ پیدا نہیں ہوتی جتنی کہ صرف ایک بار دیکھنے سے ہوتی ہے۔ وہ تجلی صرف ایک بار دماغ کے کوہ طور سے جھلکتی ہے اور دل میں آ کر ہمیشہ کے لئے کھب جاتی ہے پھر وہ نظارہ بھلائے نہیں بھولتا۔ آخر اس نے پریشان ہو کر یہ فیصلہ کیا کہ دوسرے دن وہ چوہدری صاحب کے پاس جائے گا اور انہیں سمجھائے گا کہ وہ سکینہ کے لئے نامحرم ہے لہذا ایک جوان لڑکی کو روٹیاں لے کر اس کے حجرے میں نہیں بھیجنا چاہئے۔ اس رات وہ فیصلہ کرنے کے بعد کروٹیں بدلتے بدلتے ہی سو گیا۔

دوسری صبح نماز کے بعد اس نے چوہدری برکت علی سے کہا ''میں آپ سے تنہائی میں کچھ باتیں کرنا چاہتا ہوں''۔

چوہدری برکت علی نے کہا۔

''میں بھی آپ سے ضروری باتیں کرنا چاہتا تھا، چلئے اچھا ہے، آپ میری حویلی میں تشریف لے آئیں، اطمینان سے باتیں کریں گے۔ ابھی میں کھیتوں کی طرف جا رہا ہوں۔ دو گھنٹے بعد حویلی میں آؤں گا''۔

دو گھنٹے بعد ایمان علی حویلی جا پہنچا تو چوہدری اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے بڑی عزت سے اسے بیٹھک میں کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا پھر ملازم کو چائے لانے کا حکم دیا۔ ایمان علی نے ہاتھ اٹھا کر انکار کرتے ہوئے کہا۔

''میں چائے نہیں پیتا''۔

چوہدری نے مسکرا کر کہا۔

''آپ تو دودھ بھی نہیں پیتے۔ میرا ملازم کئی بار آپ کے لئے دودھ لے کر گیا مگر آپ نے پینے سے انکار کر دیا۔ آخر کیوں؟''

''جب روٹی اور چٹنی کھا کر پیٹ بھر جاتا ہے تو پھر فاضل خوراک کا عادی بننا کیوں ضروری ہے؟''

''اس لئے ضروری ہے کہ یہ سب خدا کی دی ہوئی نعمتیں ہیں، ان سے انکار نہیں کرنا چاہئے''۔

''بے شک انکار نہیں کرنا چاہئے اگر یہ نعمتیں اپنی محنت سے حاصل ہوں۔ میں پانچ وقت نماز پڑھتا ہوں اور پڑھاتا ہوں، اللہ تعالیٰ مجھے تین وقت کی روٹیاں انعام میں دیتا ہے۔ اگر میں نماز کے علاوہ لوگوں کو کلام پاک کی تعلیم دینا شروع کر دوں اور وہ معبود میرے انعام میں ایک گلاس دودھ کا اضافہ کر دے تب میں انکار نہیں کروں گا۔ اگر ابھی میں نے دودھ اور چائے جیسی غیر ضروری چیزوں کو منہ لگایا تو یہ اس طرح منہ لگ جائیں گی

کہ رفتہ رفتہ میری ضرورت بن جائیں گی۔ یہیں سے یہ ضرورت انسان کو رشوت اور حرام خوری کی طرف مائل کرتی ہیں۔ اگر ہم اپنی اس دنیا کو حرام خوری اور فریب کاریوں سے پاک رکھنا چاہتے ہیں تو اس کے لئے سب سے لازم عمل یہی ہے کہ ہم اپنی تمام ضرورتوں کو کچل دیں۔ صرف زہد اور پرہیز گاری سے ایمان کی تکمیل ہوسکتی ہے''۔

''آپ ایسی باتیں بتاتے ہیں جو زمانے میں قابل عمل نہیں ہوسکتیں۔ اب زمانہ بدل گیا ہے''۔

''کبھی بھی زمانے میں ایمان نہیں بدل سکتا بشرطیکہ ہم چاہیں۔ آپ زمانے کے بدلنے کی بات کہتے ہیں حالانکہ زمانہ کبھی نہیں بدلتا۔ انسان خود کو بدلتے بدلتے زمانے کو بدل دیتا ہے پھر اسی زمانے کا شکوہ بھی کرتا ہے۔ چوہدری صاحب صرف اپنی سوچ کو بدلنے کی ضرورت ہے، تیرہ سو سال پہلے کا معاشرہ آج بھی قائم ہوسکتا ہے''۔

''میں نے چالیس برس کی عمر میں آپ جیسا ایک ہی ایمان والا دیکھا ہے۔ ہم سب اپنی ضرورتوں میں اس طرح گھر چکے ہیں کہ زہد اور پرہیز گاری کے معاملے میں آپ کی طرح انتہا پسند نہیں بن سکتے۔ معاف کیجئے گا، کیا آپ تنہا اس معاشرے کو نہیں بدل سکتے ہیں؟''

''ایک ایک قطرے میں سمندر بہتا ہے۔ میں ایک قطرہ ہوں۔ آپ بھی ایک قطرے کی طرح مجھ میں مل جایئے پھر دیکھئے گا کہ ایمان کا سمندر کیسے ٹھاٹھیں مارتا ہے''۔

چوہدری نے ہنستے ہوئے کہا۔

''آپ اتنی اونچی باتیں اس لئے کرتے ہیں کہ اس دنیا میں بالکل تنہا ہیں۔ اگر آپ بیوی بچوں کے ساتھ زندگی گزاریں اور پورے ایک کنبے کی پرورش کریں تب آپ کو یہ حقیقت معلوم ہوگی کہ اس دنیا میں رہ کر آئے دن کی ضرورتوں سے پیچھا نہیں چھوٹ سکتا۔ تنہا تو جانور بھی جنگلوں میں زندگی گزار لیتے ہیں۔ دنیاداری کرتے ہوئے دین داری کرنا محال ہے''۔

''محال ہوسکتا ہے، ناممکن نہیں۔ انسان چاہے تو سب کر کچھ کرسکتا ہے''۔

''آپ زبانی دعویٰ نہ کریں۔ کیا آپ شادی کر کے بیوی بچوں کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے زہد اور پرہیز گاری کو عمل طور پر ثابت کرسکتے ہیں؟''

ایمان علی اس کا منہ تکنے لگا۔ اس نے کبھی شادی کے مسئلے پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا تھا۔ چونکہ شادی نہیں کرنا چاہتا تھا اس لئے اپنی ایمانداری کو عملی طور پر ثابت نہیں کرسکتا تھا۔ چوہدری نے الجھتے ہوئے کہا۔

''ایمان والے ہمیشہ اپنے عمل سے دوسروں کو اپنی طرف مائل کرتے ہیں۔ میں آپ کو عمل کی دعوت دیتا ہوں، آپ میرا مشورہ مان کر شادی کرلیں۔ سکینہ بہت اچھی لڑکی ہے''۔

ایمان علی کے ذہن میں جیسے دھماکہ سا ہوا۔ وہ کرسی پر بیٹھے بیٹھے گڑبڑا گیا۔ بے چینی سے ادھر ادھر پہلو بدلنے لگا۔ وہ تو یہ سوچ کر آیا تھا کہ سکینہ کو اپنے حجرے میں آنے سے روک دے گا اور چوہدری اس لڑکی کو اس کی دلہن بنانا چاہتا تھا۔

اچانک ہی وہ اس کی نگاہوں کے سامنے دلہن کے روپ میں آ گئی۔ سرخ جوڑے میں اور چاندی کے زیورات میں وہ ایسے جگمگا رہی تھی کہ اس پر نگاہ ہی نہیں ٹھہر رہی تھیں۔ وہ بظاہر خاموش بیٹھا ہوا تھا مگر اس کا دل سینے کی دیوار سے دیوانے کی طرح سر ٹکرا رہا تھا۔ دھک دھک..... سکینہ سکینہ..... دھک دھک..... سکینہ سکینہ.....

چوہدری نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا۔ اس نے فوراً ہی کہا۔ ''میں آپ کی طرح عالم دین نہیں ہوں مگر اولیائے اللہ کے حالات زندگی پر میں نے ایک کتاب پڑھی ہے۔ ایک جگہ لکھا ہے۔ حضرت بایزید بطامی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ میں نے اللہ تعالیٰ سے التجا کی کہ عورتوں سے مجھے بچائے رکھ۔ پھر میں نے سوچا کہ یہ التجا غلط ہے جبکہ ہمارے حضور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بڑے کنبے کے ساتھ زندگی گزارتے ہوئے زہد اور پرہیز گاری کو عملی طور پر ثابت نہیں کیا ہے؟''

چوہدری کی بات سن کر ایمان علی کا سر جھک گیا۔

O☆O

دجّال (شیطان کا بیٹا)

انگریزی ادب سے درآمد ایک خوفناک ناول۔ علیم الحق حقی کا شاندار اندازِ بیاں۔ شیطان کے پجاریوں اور پیروکاروں کا نجات دہندہ شیطان کا بیٹا۔ جسے بائبل اور قدیم صحیفوں میں بیسٹ (جانور) کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ انسانوں کی دُنیا میں پیدا ہو چکا ہے۔ ہمارے درمیان پرورش پا رہا ہے۔ شیطانی طاقتیں قدم قدم پہ اسکی حفاظت کر رہی ہیں۔ اسے دُنیا کا طاقتور ترین شخص بنانے کے لیے مکروہ سازشوں کا جال بنا جا رہا ہے۔ معصوم بے گناہ انسان، دانستہ یا نادانستہ جو بھی شیطان کے بیٹے کی راہ میں آتا ہے، اسے فوراً موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا ہے۔

دجّال..... یہودیوں کی آنکھ کا تارہ جسے عیسائیوں اور مسلمانوں کو تباہ و برباد اور نیست و نابود کرنے کا مشن سونپا جائے گا۔ یہودی کس طرح اس دُنیا کا ماحول دجال کی آمد کے لیے سازگار بنا رہے ہیں؟ دجالیت کی کس طرح تبلیغ اور اشاعت کا کام ہو رہا ہے؟ دجّال کس طرح اس دُنیا کے تمام انسانوں پر حکمرانی کرے گا؟ 666 کیا ہے؟ ان تمام سوالوں کے جواب آپ کو یہ ناول پڑھ کے ہی ملیں گے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ آپ اس ناول کو شروع کرنے کے بعد ختم کر کے ہی دم لیں گے۔ دجال کا پہلا اور دوسرا حصہ کتاب گھر پر دستیاب ہیں۔

قبر کی طرح تنگ و تاریک حجرہ گلاب کی خوشبوؤں سے مہک رہا تھا۔ لالٹین کی زرد روشنی میں سکینہ دلہن بنی بیٹھی ہوئی تھی۔ چارپائی کے سرہانے ایک صندوق کے اوپر دودھ کا ایک گلاس اور مٹھائی کی ایک پلیٹ رکھی ہوئی تھی۔ اس کی زندگی میں پہلی بار ایک دلہن آئی تھی اور اس کے ساتھ ہی غیر ضروری دودھ اور مٹھائیاں آ گئی تھیں۔ چوہدری نے اس کا انکار نہیں سنا تھا، یہ کہہ کر وہ چیزیں رکھوا دی تھیں کہ صرف ایک رات غیر ضروری خوراک استعمال کر لینے سے ایمان میں فرق نہیں پڑے گا۔

ایمان علی حجرے کے دروازے کو اندر سے بند کرنے کے بعد اسی دروازے سے چپک کر کھڑا رہ گیا۔ دلہن کی طرف قدم بڑھانے سے پہلے ہی دل بری طرح دھڑک رہا تھا۔ اس پر ایک عجیب سی گھبراہٹ طاری تھی۔ دروازے سے دلہن کی چارپائی تک صرف دو قدم کا فاصلہ تھا مگر اسے لگ رہا تھا کہ یہ فاصلہ طے کرتے وقت وہ لڑکھڑا کر گر پڑے گا۔ وہ بار بار کاندھے پر رکھے ہوئے رومال سے چہرے کا پسینہ پونچھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طرح آگے بڑھے اور آگے بڑھ کر کیا کرے؟

وہ گھبراہٹ میں ایک ہی جگہ کھڑا چھوٹے سے حجرے میں ادھر سے ادھر نظریں دوڑا رہا تھا جیسے ڈوبنے والا سہارا تلاش کر رہا ہو۔ کبھی کبھی بھوک، کمزوری یا بیماری کے باعث اس کی طبیعت گھبرانے لگتی تو وہ اگربتیاں سلگا لیا کرتا تھا۔ بچپن سے اگربتی کی مہک نے اسے اکثر سہارا دیا تھا لیکن اگربتی قبر یا کسی مقدس مقام پر جلائی جاتی ہے۔ آج تک کوئی اگربتی سلگا کر اپنی دلہن کے پاس نہیں گیا۔ یہ طریقہ رنگین اور رومانی ماحول کے بالکل خلاف ہے پھر وہ کیا کرے؟

وہ ساری رات ایک ہی جگہ کھڑا نہیں رہ سکتا تھا۔ دو قدم کا فاصلہ کسی نہ کسی صورت طے کرنا ہی تھا۔ اگرچہ اس کے گھٹنے کانپ رہے تھے پھر بھی اس نے ایک قدم آگے بڑھایا۔

دوسرے قدم پر ڈگمگاتا ہوا، جھکتا ہوا چارپائی کا سہارا لے کر دلہن کے قریب گرتے گرتے بیٹھ گیا۔ چارپائی نے چرچرا کر احتجاج کیا تو گھونگھٹ میں چھپی ہوئی سکینہ نے سمجھ لیا کہ مولوی کسی طرح کفن باندھ کر میدان میں آ گیا ہے۔ اب سے پہلے وہ کفن جیسی چادر میں لپٹی ہوئی آیا کرتی تھی، اس وقت سرخ جوڑے میں اس کی ساری شوخی اور تیز طراری ہوا ہو گئی تھی۔ وہ اپنے آپ میں حیا سے سمٹنے لگی۔ ادھر حیا تھی، ادھر گھبراہٹ۔ وہ ابھی تک ہانپتا ہوا سوچ رہا تھا کہ اپنی دلہن کو کس طرح مخاطب کرے۔ اس کا حلق خشک ہو رہا تھا۔ پہلے پیٹ کی بھوک سے حلق میں کانٹے پڑتے تھے، اب جذبات کی بھوک سے پڑ رہے تھے۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا کہ ایک گھونٹ پانی مل جائے مگر وہ مسرتوں کے ہجوم میں حجرے کے اندر پانی رکھنا بھول گیا تھا۔ اب دروازہ کھول کر باہر جانے کا حوصلہ نہیں تھا۔ اس نے دودھ کے گلاس کی طرف دیکھا پھر ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گیا۔ وہ گلاس کا دودھ اپنی دلہن کو پلانا چاہتا تھا۔

آخر اس نے اپنے آپ کو ٹٹولا کہ وہ گھبرا کیوں رہا ہے؟ وہ خدا کا نیک بندہ ہے، اسے خدا کے سوا کسی سے ڈرنا یا گھبرانا نہیں چاہئے اور وہ خواہ مخواہ ایک ایسی لڑکی سے گھبرا رہا ہے جو بیوی بن کر اس کی خدمت گزاری کے لئے آئی ہے۔ اس میں جب ذرا حوصلہ پیدا ہوا تو اس نے بسم اللہ پڑھ کر گھونگھٹ تھام لیا۔ پتا نہیں ایسے وقت بسم اللہ پڑھنا ضروری تھا یا نہیں مگر وہ عادت سے مجبور تھا۔

گھونگھٹ کو ہاتھ لگاتے ہی وہ ذرا سا کسمسائی پھر اپنے گھونگھٹ کو پکڑ کر خاموش اداؤں سے سمجھانے لگی کہ وہ اتنی آسانی سے گھونگھٹ نہیں اٹھانے دے گی۔ ایمان علی کو یاد آ گیا کہ ایسے وقت کچھ نہ کچھ دلہن کو منہ دکھائی کے لئے دینا پڑتا ہے۔

اس نے کرتے کی جیب سے عطر کی ایک شیشی نکالی اور اسے کھولتے ہوئے کہا۔

''پچھلے سال رمضان کی ستائیسویں شب کو تراویح مکمل کرنے کے سلسلے میں مجھے ایک جوڑا لباس اور عطر کی یہ شیشی ملی تھی۔ ابھی اس میں تھوڑا سا عطر باقی ہے، میں یہی منہ دکھائی کے طور پر دے سکتا ہوں''۔

یہ کہہ کر اس نے دلہن کے حنائی ہاتھوں پر تھوڑا سا عطر چھڑک دیا پھر شیشی کو بند کرنے کے بعد وہ لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اس کا گھونگھٹ اٹھانے لگا۔ سکینہ کے انکار کی ادائیں بڑی پیاری لگ رہی تھیں پھر بھی چمکتا دمکتا چہرہ گھونگٹ کی بدلی سے باہر آ گیا۔

ایمان علی دم بخود ہو کر اس کے حسین مکھڑے کو دیکھتا رہ گیا۔ اب سے پہلے بھی وہ اسے دیکھ چکا تھا لیکن ایک دلہن کے روپ سنگھار نے اسے حسین شاہکار بنا دیا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں کہا کہ جنت کی حور کا جو تصور ہوتا ہے، وہ آج نگاہوں کے سامنے مکمل ہو رہا ہے۔ اسے دیکھ دیکھ کر بے اختیار چھونے کو دل مچل رہا تھا۔ پہلے اس کے لرزتے ہوئے ہاتھ سکینہ کے حنائی ہاتھوں پر آئے اور بڑی دیر تک اس کی ملائمت کو محسوس کرتے رہے۔ وہاں سے آگے ہاتھ بڑھانے کی جرأت نہیں ہو رہی تھی۔ اپنے اندر جرأت پیدا کرنے کے لئے یہی بات سمجھ میں آئی کہ پہلے باتیں کر کے اپنی گھبراہٹ کو دور کیا جائے۔ اس لئے وہ لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہنے لگا۔

''تت..... تم بہت اچھی ہو''۔

اس کے حسن کی تعریف کے لئے اسے اس سے زیادہ الفاظ نہیں مل سکے۔ اس نے اب تک صرف خدا اور رسول کی تعریف کی تھی، ایک حسین عورت کے لئے وہ ایک شاعر کی زبان نہ لا سکا۔ اس لئے اس نے خدا کا ہی سہارا لیا اور بڑی عقیدت سے کہنے لگا۔

''اللہ تعالیٰ جب اپنے بندوں پر خوش ہوتا ہے تو انہیں اپنی سب سے پسندیدہ چیز انعام کے طور پر دیتا ہے۔ پہلی بار جب میں نے تمہیں حجرے کی کھڑکی سے دیکھا تھا تو اس وقت میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ میرا معبود تمہیں مجھ سے منسوب کرے گا۔ واقعی اس دینے والے کے انداز نرالے ہیں۔ یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ اس کی مرضی کے بغیر کسی کو ایسی خوشیاں نصیب نہیں ہوتیں۔ وہ چاہے تو دیتا ہے، چاہے تو چھین لیتا ہے.....''

وہ بول رہا تھا اور سکینہ کے حسین مکھڑے سے پسینہ پھوٹ رہا تھا۔ اس چھوٹے سے حجرے میں سخت گرمی تھی۔ کھڑکی اور دروازہ دونوں ہی بند تھے۔ اسی لئے سکینہ کی طبیعت گھبرا رہی تھی مگر وہ عورتوں کے معاملے میں اناڑی تھا اس لئے سکینہ کی گھبراہٹ کو نہ سمجھ سکا۔

جب اس نے دونوں کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اس کے چہرے کے گلاب کو چھو لیا تو اسے پتہ چلا کہ وہ بھی کانپ رہی ہے اور اسی کی طرح گھبرا رہی ہے۔ وہ لرزتے ہوئے بولا ''سکینہ میری شریک حیات آنکھیں کھولو۔ وہ آنکھ کھولنے کی بجائے اپنے ہاتھ سے حلق کے پاس گلے کو سہلانے لگی۔ ایمان علی نے پوچھا ''کیا پیاس لگ رہی ہے؟'' سکینہ نے ہولے سے اثبات میں سر ہلایا۔ ایمان علی نے آگے ہاتھ بڑھا کر دودھ کا گلاس اٹھایا اور اسے دیتے ہوئے کہا۔

''یہ لے، اسے پی لے.....'' اس نے سکینہ کا ہاتھ پکڑ کر اسے گلاس تھما دیا۔ اس کی آنکھیں بدستور بند تھیں۔ آنکھیں حیا سے بھی بند ہوتی ہیں اور خوف و دہشت سے بھی بند ہوتی ہیں۔ اگر حیا سے بند ہوتیں تو وہ دودھ پیتے ہوئے شرماتی۔ کوئی دہشت تھی جو اس کا گلا خشک کر رہی تھی۔

اس نے گلاس ہونٹوں سے لگا کر دو چار گھونٹ پیے، دودھ اس کے حلق میں پھنسنے لگا۔ سینے کے اندر سے کوئی چیز لاوے کی طرح ابل کر باہر آنا چاہتی تھی۔ سکینہ نے برداشت کرنے کی انتہائی کوشش کی لیکن کوشش کے باوجود لاوا ابل پڑا۔ گلاس سے دودھ کو چھلکتے دیکھ کر ایمان علی نے گلاس کو فوراً ہی اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ سکینہ یک بیک تڑپ کر چارپائی کے کنارے جھک گئی اور قے کرنے لگی۔

وہ اس صورتحال سے بوکھلا سا گیا۔ جلدی سے دودھ کا گلاس صندوق پر رکھ کر اس کی پیٹھ سہلانے لگا۔ وہ ہانپ رہی تھی اور گہری سانسیں لے رہی تھی۔ ایمان علی نے جلدی سے حجرے کی کھڑکی کھول دی پھر اس کے پاس آ کر اس کے چہرے پر پنکھا جھلنے لگا۔ سکینہ شرم و حیا کو بھول کر بستر پر لیٹ گئی تھی۔ ایک بار اس نے آنکھیں کھول کر ایمان علی کو دیکھا پھر دوسری بار آنکھ بند کی تو آنکھوں سے آنسو ڈھلک پڑے۔ ایمان علی نے اس کے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے کہا۔

''سکینہ اللہ کا نام لے، وہ تیری تکلیف دور کرے گا۔ میں تیرا مجازی خدا ہوں، مجھے بتا کیا پریشانی ہے؟''

وہ بدستور آنکھیں بند کئے انکار میں سر ہلاتی ہوئی بڑے کرب سے بولی۔

''میں تجھے پہلے کہہ چکی ہوں کہ میں بہت بری لڑکی ہوں۔ میں سمجھتی تھی کہ مجھے کوئی برا آدمی ملے گا مگر تیرے پاس آ کر میرا دل کانپ رہا ہے۔ دھوکا تو انسانوں کو دیا جاتا ہے، فرشتوں کو نہیں دیا جاتا۔ میں تجھے دھوکا نہیں دے سکتی''۔

ایمان علی نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''یہ تو کیسی بہکی بہکی باتیں کر رہی ہے؟''

''بہکنے والی بہکی ہوئی باتیں کر سکتی ہے۔ تو سمجھتا کیوں نہیں کہ مجھے متلی کیوں ہو رہی ہے، ابکائی کیوں آ رہی ہے؟''

ایمان علی ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگا۔ اب سکینہ کی باتیں اس کی سمجھ میں آ گئیں۔ اس نے بار بار سنا تھا کہ عورت کے پاؤں بھاری ہوتے ہیں تو اس کی یہی حالت ہوتی ہے جو اب سکینہ کی ہو رہی ہے مگر اس کی حالت ایسی کیوں ہو رہی ہے؟ یہ تو پہلی بار دلہن بنی ہے، میں بھی پہلی بار دلہا بن کر اس کی زندگی میں آیا ہوں۔ کیا میں اس کی زندگی کا پہلا دلہا نہیں ہوں؟ ہاں نہیں ہوں۔ یہ تو سامنے کی بات ہے جو حقیقت ہے وہ سامنے ہے اور سمجھنے کے لئے کیا رہ گیا ہے؟

وہ اس سے ذرا دور کھڑا اسی طرح پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ جب بات سمجھ میں آ گئی تو وہ ایک دم سے تھک کر فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ زیر لب بڑبڑانے لگا۔

''یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ میں ایک دلہن کی خواہش کو برسوں سے کچلتا رہا۔ میں ڈرتا تھا کہ کبھی میں نے شادی کی تو نہ جانے کیسی عورت ملے، وہ میری طرح ایمان والی ہوگی یا نہیں؟ یوں تو بظاہر سب ہی ایمان والیاں ہوتی ہیں لیکن کتنی ہی بے ایمانی، جھوٹ، مکر و فریب کے ہجوم

میں گھری ہوئی رہتی ہیں، یہ شادی کے بعد پتہ چلتا ہے اور مجھے پتا چل رہا ہے''۔

''آہ! سکینہ میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا۔ تو مجھے ایک ذہنی عذاب میں مبتلا کرنے کیوں آ گئی؟ میرا گناہ تو صرف اتنا ہی ہے کہ میں نے تیری تمنا کی تھی مگر خدا کی قسم ایک بہت اور خوشگوار زندگی کے لئے تیری آرزو کی تھی۔ اگرچہ میں نے عہد کیا تھا کہ خدا کے سوا کسی کی آرزو نہیں کروں گا لیکن اب میں دنیاداری کرتے ہوئے یہ مثال پیش کرنا چاہتا تھا کہ رشتے ناطوں کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہوئے بھی میں پوری ایمانداری سے زندگی گزار سکتا ہوں۔ میں دوسروں کے سامنے ایک مکمل ایمان پیش کرنے کے لئے تجھے اپنی دلہن بنا کر لایا ہوں۔ یہ جرم تو نہیں ہے کہ تو نے مجھے اتنی بڑی سزا دی ہے۔ بتا سکینہ میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا؟''

ایمان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے چارپائی پر لیٹی ہوئی بے ایمانی بھی رونے لگی۔ زندگی کے کسی موڑ پر جب ایمان اور بے ایمانی اچانک ہی ٹکرا جاتے ہیں تو ایسے وقت انسان کا ضمیر بہت کچھ سوچنے کی دعوت دیتا ہے۔ سکینہ بھی ایمان کی زد میں آ کر کانپ گئی تھی۔ اس فرشتے سے اپنی بے ایمانی نہ چھپا سکی تھی اور اس سے بے ایمانی کرنے کے بعد یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کی تلافی کیسے کرے۔ اسی لئے وہ بے بسی سے رو رہی تھی۔

''تیرا یہی قصور ہے کہ تو نے میرا کچھ نہیں بگاڑا، میں تنہائی میں آتی تھی تو بڑی ایمانداری سے شرافت کی چادر میں لپیٹ دیتا تھا۔ اس دنیا میں ایسے لوگوں کا بگڑتا ہے۔ تجھے تیری شرافت نے کمزور بنایا، مجھے میری غریبی نے۔ تیری طرح مجھ میں بھی اتنا دم خم نہیں تھا کہ میں کسی کا کچھ بگاڑ سکتی اسی لیے چوہدری نے مجھے بگاڑ دیا.....''

وہ چوہدری کا نام سن کر چونک گیا اور حیرانی سے اس کا منہ تکنے لگا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو شخص اتنا ایماندار ہو کہ ایمان والوں کے لئے ایک مسجد تعمیر کرائے، وہ دلوں کی مسجدوں کو یوں مسمار کر سکتا ہے اور اپنے سیاہ عمل کو دلہن کی طرح سنوار کر ایک مولوی کے حجرے میں بھیج سکتا ہے۔

''میں نے چوہدری کا کیا بگاڑا تھا؟''

''میں نے بھی تو چوہدری کا کچھ نہیں بگاڑا تھا؟ میں نے کہا نا اس دنیا میں ان کا ہی بگڑتا ہے جو بگاڑنا نہیں جانتے''۔

ایمان علی نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔

''اس کی غلطی میں تو برابر کی شریک ہے۔ اگر عورت نہ چاہے تو کوئی اس کی انگلی بھی نہیں پکڑ سکتا''۔

''ہاں تو ٹھیک کہتا ہے۔ جب تک میں نہیں چاہتی تھی، وہ میری انگلی بھی نہیں پکڑ سکا۔ مگر عورت کو سمجھانے کے لئے مردوں کے پاس جہاں دولت ہوتی ہے وہاں دین و ایمان کا سہارا بھی ہوتا ہے۔ چوہدری نے مجھے سمجھایا کہ جب ایک شخص کنیزوں، لونڈیوں اور باندیوں کے نان نفقے کا ذمہ دار ہوتا ہے تو اس کی پاؤں کی ایڑی سے چوٹی تک اس کا حق دار بھی ہوتا ہے۔ جب وہ ایمان دھرم سے یہ ثابت کر رہا تھا کہ جو کچھ وہ چاہتا ہے وہ درست ہے، تو پھر جو درست ہے اس سے میں انکار کیسے کر سکتی تھی۔ تو بڑا عالم ہے تو ہی ایمان سے بتا کیا ایک لونڈی کو اپنے آقا کا حکم نہیں ماننا چاہیے؟''

اس نے ایسا سوال کیا تھا کہ ایمان سوچتا رہ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے تائید میں سر ہلا کر کہا۔

''بے شک لونڈی اپنے آقا کے حکم کی پابند ہوتی ہے مگر یہ غلاموں اور لونڈیوں کی خرید و فروخت کا دور نہیں ہے۔ تو لاوارث نہیں ہے، بازار

میں بیچی نہیں گئی ہے اور نہ ہی وہ تجھے خرید کر لایا ہے۔ اگر تو اس کی ملکیت رہ چکی ہے تو اسلام میں کسی آقا کے لیے یہ حکم نہیں ہے کہ وہ اپنا گناہ کسی دوسرے کے سر تھوپ دے۔ اس آقا پر لازم ہے کہ جو بیج بویا ہے، اس کی فصل کاٹنے تک اپنی لونڈی کو اپنی امان میں رکھے۔ یہ نہیں کہ اسے مصیبت سمجھ کر اسے دوسرے کے کاندھوں پر ڈال دے اور اس طرح خود کو نیک نام بنا کر رکھے۔ بے شک تو بے قصور ہے، بہکائی گئی ہے۔ وہ بہکانے کا مجرم ہے، میں اس سے بات کروں گا اور ایمان کی رو سے اسے مجبور کروں گا کہ بچے کی پیدائش تک وہ تجھے اپنی امانت سمجھ کر اپنے پاس رکھے"۔

وہ یک بیک بستر سے اٹھ کر بولی۔

"میں اس کے پاس نہیں رہوں گی۔ میں تیری بیوی بن چکی ہوں، کیا تو سمجھتا ہے کہ ہمارا نکاح جائز نہیں ہے؟"

وہ اس سوال سے الجھن میں پڑ گیا۔ خاموش بیٹھے بیٹھے دماغ کی لائبریری میں تمام حدیثوں کو کھنگالنے لگا اور یہ اعتراف کرنے لگا کہ سکینہ سے اس کا نکاح جائز ہے۔ جب کوئی لونڈی حاملہ ہو کر کسی کے نکاح میں آئے تو وہ نکاح جائز ہوتا ہے لیکن شوہر اس وقت تک لونڈی سے صحبت نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ حمل سے فارغ نہ ہو جائے۔

یعنی سکینہ کتنا ہی ناقابل برداشت بوجھ ہو وہ اسی کے پاس رہے گی کیونکہ نکاح ہو چکا ہے۔ وہ اس کا مجازی خدا ہے اور مجازی خدا کے آگے ایک لونڈی کے آقا کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔ ہاں وہ جو بوجھ لے کر آئی ہے اس بوجھ کا اٹھانا چوہدری پر لازم ہے۔ اس نے کہا۔

"بے شک تو میری شریک حیات ہے۔ اب تیری عزت و آبرو اور تیرے جان و مال کی حفاظت میرے ذمے ہے۔ لیکن جو بچہ آنے والا ہے، میں اس کا ذمہ دار اور حق دار نہیں ہوں۔ چوہدری کو اس کی پرورش کرنی ہوگی"۔

"نہیں میں اپنا بچہ کسی کو نہیں دوں گی۔ جس کے لئے عورت لہولہان ہوتی ہے، جسے نو ماہ تک اپنا لہو پلاتی ہے، اس کے لئے اس سے زیادہ کوئی عزیز نہیں ہوتا۔ میرے جگر کا ٹکڑا پھینکنے کے لئے نہیں ہے۔ تو ایمان والا ہے، ہزار بار اپنی گردن کٹا کر بھی خدا کو پکارے گا۔ میں عورت ہوں، ہوس کی قربان گاہ پر ایک بار اپنی گردن کٹا کر ساری زندگی اپنے بچے کو پکاروں گی۔ وہ تیرا ایمان ہے، یہ میرا ایمان ہے"۔

اس نے سکینہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"یہ تیرا ایمان ہو سکتا ہے مگر میں تجھے کیسے سمجھاؤں کہ وہ بچہ کبھی میرے نام سے پکارا نہیں جائے گا"۔

"کسی کے بھی نام سے منسوب ہو، بچہ تو میرا ہی ہوگا۔ ابھی تو نے کہا ہے کہ مجازی خدا اپنی عورت کی جان و مال کا محافظ ہوتا ہے تو پھر میں ممتا کی جو دولت لے کر آئی ہوں تو اس کی حفاظت کیسے نہیں کرے گا۔ یہاں پہنچ کر تیرا ایمان کیوں ڈگمگا رہا ہے۔ تو نے ایمان کو عملی طور پر ثابت کرنے کے لئے مجھ سے شادی کی ہے"۔

ایمان علی کا سر جھک گیا۔ واقعی عمل اور آزمائش کی گھڑی تھی۔ بڑی سخت آزمائش تھی، وہ اندر ہی اندر بری طرح کانپ رہا تھا۔ کانپتے کانپتے اچانک وہ جوش اور جذبے کے تحت اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ایمان والے کا فرض ہے کہ وہ کسی بھی بے ایمانی کا محاسبہ کرے۔ وہ چوہدری کا محاسبہ کرنے کے لئے تیزی سے پلٹ کر ایک جھٹکے سے دروازہ کھولتے ہوئے حجرے سے باہر چلا گیا۔ سکینہ اسے آواز ہی دیتی رہی مگر وہ اس کی آواز سے دور ہوتا جا رہا

تھا۔اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے،سارے پنڈ میں سناٹا چھا گیا تھا۔مکانوں کے باہر چارپائیوں پر لوگ گہری نیند سو رہے تھے۔جب وہ حویلی کے دروازے پر پہنچا تو اتنی اونچی حویلی کے سامنے اتنے چھوٹے آدمی کو دیکھ کر ایک خارش زدہ کتا بھونکنے لگا۔اب تک کتنی ہی خارش زدہ بے ایمانیاں اس پر بھونکتی چلی آرہی تھیں۔وہ بھونکنے والوں کو پیچھے چھوڑتا ہوا ایمان کے راستے پر چلتے چلتے ایک بے ایمان کے دروازے پر آ گیا۔

دروازے کو پیٹنے لگا۔وہ بری طرح حواس باختہ ہو گیا تھا۔وحشت اور جنون میں یہ بھول گیا تھا کہ وہ گوشت پوست کے ایک کمزور ہاتھ سے دولت کے فولادی دروازے کو توڑ رہا ہے۔ایک ملازم نے جھلاتے ہوئے دروازے کو کھولا۔

''کون گدھا دروازے کو اس طرح پیٹ رہا ہے؟''

مولوی کو دیکھتے ہی ملازم ایک دم سے گھبرا گیا۔پھر جلدی سے ہاتھ جوڑ کر بولا۔

''معاف کیجئے گا مولوی صاحب! مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ ہیں۔مگر آپ اس طرح دروازہ کیوں پیٹ رہے ہیں؟ چوہدری صاحب کی آنکھ کھل گئی ہے،وہ ہم پر غصہ دکھا رہے ہیں''۔

''تم چوہدری سے جا کر کہو میں اچھی طرح اس کی آنکھ کھولنے آیا ہوں۔جاؤ،اسے یہاں بھیج دو''۔

ملازم وہاں سے چلا گیا۔ایمان علی باہر کھڑا رہا۔چوہدری وہاں آیا تو اسے دیکھ کر حیرانی کا اظہار کرنے لگا۔

''ارے مولوی صاحب آپ ہیں۔آیئے اندر تشریف لایئے''۔

''نہیں میں خدا سے ڈرتا ہوں اور ہمیشہ اس سے پناہ مانگتا ہوں کہ وہ مجھے شیطان کے دروازے سے دور رکھے''۔

چوہدری کے تیور بدل گئے۔اس نے ذرا سخت لہجے میں پوچھا۔

''تم شیطان کس کو کہہ رہے ہو؟''

''تمہیں کہہ رہا ہوں۔کیا تم ایمان والوں کے ساتھ لین دین میں دیانت داری سے کام لیتے ہو؟ کیا تم ایک کھوٹا سکہ چکا کر دھوکے سے اسے دوسرے کے حوالے نہیں کرتے ہو؟''

چوہدری سمجھ گیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا۔

''میں کسی دیوانے کے ساتھ اپنی حویلی کے اندر بیٹھ کر بات نہیں کر سکتا۔میرے ساتھ آؤ''۔

وہ دونوں حویلی سے دور جانے لگے۔کچے سے ویران راستے پر ان کے پیچھے خارش زدہ کتا دم ہلاتا ہوا چل رہا تھا۔چوہدری نے کہا۔

''یہ کتا ہے۔میں اسے ٹھوکریں مارتا ہوں،اس کے باوجود یہ میرے پیچھے دم ہلاتا پھرتا ہے''۔

ایمان علی نے غصے سے کپکپاتے ہوئے کہا۔

''میں انسان ہوں مگر تم نہیں۔تم اپنا جھوٹا کھانا کتے کو دیتے ہو اور جھوٹی عورت میرے حوالے کرتے ہو۔کیا یہ شرافت ہے؟''

چوہدری نے ڈھٹائی سے کہا۔

''میں نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جس سے مجھے بدنام ہونا پڑے۔ سکینہ کے باپ دادا برسوں سے میری ملازمت کرتے آئے ہیں۔ یہ غلامی، یہ خدمت گزاری سکینہ کو ورثے میں ملی ہے۔ میں اس کے پورے خاندان کی کفالت کرتا ہوں، انہیں روٹی کپڑا دیتا ہوں، رہنے کے لئے مکان دیتا ہوں۔ کیا ایک آقا اپنی لونڈی کا ہر طرح سے حقدار نہیں ہوتا؟''

''تم اس مسئلے کی گہرائی کیوں نہیں سمجھتے کہ لونڈی کس وجہ سے آقا کے لئے جائز قرار دی گئی تھی اس لئے کہ وہ بازار میں بیچی جاتی تھی۔ دس ہاتھوں میں جانے کی بجائے اسے ایک آقا کے پاس محدود کر کے اس کی ملکیت بنا دی گئی۔ ایسی صورت میں آقا اپنی لونڈی کا ہر طرح سے حقدار ہوتا ہے مگر سکینہ تو بازار میں بیچی نہیں گئی تھی''۔

''تم سکینہ کے حالات سے واقف نہیں ہو۔ اس کا ایک بھائی آوارہ اور بدچلن ہے۔ لاہور کی ہیرا منڈی میں رہتا ہے۔ ایک بار یہاں آ کر سکینہ کو اپنے ساتھ زبردستی وہاں لے جانا چاہتا تھا مگر میں نے اسے مار بھگایا اور سکینہ کو بازار میں فروخت ہونے سے بچانے کی خاطر میں نے اسے کنیز کے طور پر رکھ لیا۔ اب بتاؤ میں نے کون سا گناہ کیا ہے؟''

ایمان علی اس بات پر چکرا گیا۔ اس دقیق مسئلے کو سمجھاتے وقت وہ بھول گیا تھا کہ لونڈیاں آج بھی بازاروں میں بیچی جاتی ہیں۔ آج بھی عورت کو خریدنے اور فروخت کرنے کا دستور ہے۔ ایمان علی نے سوچا کہ وہ کس لیے محاسبہ کرنے آیا ہے، وہ کون سی بات ہے کہ جس نے اسے بے حد دکھ پہنچایا ہے اور اندر سے اس کے سارے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ تب اسے پتا چلا کہ انسان احمق بننے کے بعد جھنجھلاتا ہے اور احمق بنانے والے پر غصہ کرتا ہے۔ اس نے کہا ''میں تمہاری بے ایمانی کی شکایت کرنے آیا ہوں۔ تم نے سکینہ کو دھوکے سے میری دلہن کیوں بنایا؟ نکاح سے پہلے ہی کیوں نہیں بتایا کہ وہ تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہے؟''

چوہدری نے اثبات میں سر ہلا کر کہا ''ہاں کسی حد تک میں اپنی اس غلطی کو تسلیم کرتا ہوں۔ مجھے نکاح سے پہلے تمہیں سب کچھ بتا دینا چاہیے تھا لیکن میں تمہاری طرح صرف دیندار تو نہیں ہوں، دنیادار بھی ہوں۔ میں جانتا ہوں کسی چیز میں کھوٹ پیدا ہو جائے تو انسان اسے فراخدلی سے قبول نہیں کرتا۔ اگر اس کھوٹ کا علم تمہیں ہو جاتا تو تم بھی ایک غریب لڑکی کا سہارا نہ بنتے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مجھے سکینہ سے بہت زیادہ ہمدردی تھی اور میں اس کے لئے تمہارے جیسا ایک سہارا پیدا کرنا چاہتا تھا۔ نہیں، ہم اس دنیا میں رہ کر صرف اپنے مفاد کو اور اپنی عزت کو دیکھتے ہیں۔ میں زمیندار ہوں۔ زمین فصل پکاتی ہے تو میں اسے کبھی نہیں بیچتا۔ عورت فصل پکائے تو میں اسے کھوٹے سکے کے عوض بھی بیچ دیتا ہوں۔ میں نے تم سے ایک پیسہ نہیں لیا۔ تمہارے جیسے مولوی کو جو تین وقت کی روٹیوں کے سوا زندگی کی دوسری ضرورتیں پوری کرنے کے لئے ایک پیسہ نہیں رکھتا، اسے سکینہ جیسی خوبصورت لڑکی مفت میں مل گئی ہے۔ میں اب بھی چاہوں تو اسے طلاق دلا کر اور اسے تم سے چھین کر اپنے کسی دوسرے ملازم کو دے سکتا ہوں''۔

ایمان علی غصے سے مٹھیاں بھینچ بھینچ کر اسے دیکھنے لگا۔ ابھی کچھ دیر پہلے جب سکینہ گھونگھٹ میں چھپی ہوئی اس کے سامنے بیٹھی ہوئی تھی تو اس نے اسے پا کر بڑی خوشی کا اظہار کیا تھا اور کہا تھا کہ اللہ جب کسی سے خوش ہوتا ہے تو اسے اپنی سب سے عزیز چیز انعام کے طور پر دیتا ہے۔ وہ اپنی کہی ہوئی بات پر خود حیران اور پریشان تھا اور سوچ رہا تھا کہ کیا سکینہ اللہ کی طرف سے دیا ہوا انعام ہے؟ اس کا عقیدہ تھا کہ اللہ چاہے تو دیتا ہے اور

اللہ چاہے تو چھین لیتا ہے۔ مگر چوہدری اس بات کو غلط ثابت کر رہا تھا۔

اس دنیا میں اسے جو بھوک ملی وہ انسانوں کی دی ہوئی تھی۔ یہ انسان ہی ہے جو بابا بلیک شیپ کی انگریزی تعلیم دینے کی سو روپے فیس دیتا ہے اور کلام پاک کے سوا روپے دیتا ہے۔ ایمان کا یہ ریٹ خدا نے مقرر نہیں کیا، ایمان والوں کو بھوکا رکھنے کی سازش انسان ہی کرتا ہے۔ وہ چپ چاپ کھڑا غصے مٹھیاں بھینچ رہا تھا۔ چوہدری کچھ دیر تک اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا پھر اس نے کہا۔

''مولوی صاحب خاموش کیوں ہو؟ اگر تمہیں میرا دیا ہوا انعام پسند نہیں آیا تو میں اسے واپس بھی لے سکتا ہوں اور اس خوبصورت سے انعام کو کسی دوسرے ملازم کے حوالے بھی کر سکتا ہوں مگر اچھی طرح سوچ لو اس میں مجھ سے زیادہ تمہاری بدنامی ہوگی۔ میں تمہیں اتنا موقع نہیں دوں گا کہ تم مجھے بدنام کر سکو۔ یہاں چاروں طرف میری زمینیں پھیلی ہوئی ہیں، یہاں کے کسان میرے محتاج ہیں، اس پنڈ میں میری حکومت ہے۔ تم میرے منہ لگو گے تو منہ کی کھاؤ گے اور یہاں سے بدنام ہو کر جاؤ گے کہ تم مولوی تھے مولوی رہے، کسی عورت کے قابل نہ بن سکے۔ کیا تم اپنے سے پہلے والے مولوی کا حشر بھول گئے؟ تمہارے ساتھ بھی یہی کچھ ہو سکتا ہے.....''

وہ بولتا جا رہا تھا اور ایمان علی اس کی بات کے وزن کو سمجھتا جا رہا تھا۔ وہ سچ مچ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ اس نے غصے سے کہا۔

''یہ بات میری سمجھ میں آ گئی کہ انسان اپنے جیسے کسی انسان کو کچھ دیتا ہے تو اس دینے کے پیچھے کوئی غرض پوشیدہ ہوتی ہے یا کوئی فریب چھپا ہوتا ہے۔ تم مفاد پرست ہو تم جو کچھ بھی کرتے ہو صرف اپنے فائدہ اور اپنی عزت کے لئے کرتے ہو۔ وہ مسجد بھی تم نے کسی لالچ یا کسی خاص غرض کے لئے تعمیر کرائی تھی اور اس مسجد میں آنے والے کسی بھی پیش امام کو تم اپنے مفاد کے لئے استعمال کرتے ہو۔ میں سوچتا ہوں ایسی مسجد میں نماز پڑھانا اور پڑھنا کہاں تک درست ہے؟''

چوہدری زیر لب مسکراتے ہوئے بولا۔

''مولوی صاحب تم نادان ہو۔ مسجد کس نے بنوائی؟ کیوں بنائی؟ یہ سوچ کر کیا کرو گے؟ اسے بنانے والے کی نیت پر چھوڑو۔ تم یہ دیکھو کہ وہاں خدا کی عبادت ہوتی ہے یا نہیں؟ لوگوں کو سجدہ کرنے کی ایک جگہ مل گئی ہے یا نہیں؟ تمہارا کام نماز پڑھانا ہے، تم اپنا کام کرو۔ دوسرا کیا کرتا ہے، دوسرا کس حد تک ایمان والا ہے اور کس حد تک بے ایمان ہے؟ تم دوسروں کے متعلق کیوں سوچتے ہو؟ صرف اپنے ایمان کو کیوں نہیں دیکھتے۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ جب صحیح معنوں میں زندگی کا بوجھ اٹھاؤ گے، ایک سے دو اور دو سے چار ہوتے رہو گے، ایک کنبے کی پرورش کرو گے تب تمہیں پتہ چلے گا کہ ایمان کو سلامت رکھنا کتنا مشکل کام ہے۔ تمہیں ابھی صرف ایک بیوی ملی ہے تم اس مسجد کو چھوڑ کر جانا چاہتے ہو اور اس بیوی سے بھی کترانا چاہتے ہو۔ راستے میں کوئی ٹھکرایا ہوا انسان تمہیں نظر آئے تو کیا تم اسے اور زیادہ ٹھوکر مار کر آگے بڑھ جاؤ گے یا اسے اٹھا کر سہارا دو گے۔ اگر اسے سہارا دینا تمہارا ایمان ہے تو پھر تمہیں سکینہ کو اٹھا لینا چاہئے، اگر اس ایمانی آزمائش سے گھبرا گئے تو پھر راتوں رات یہاں سے کہیں دور چلے جاؤ۔ سکینہ کو چھوڑ دو اور صاحب ایمان ہونے کا دعویٰ نہ کرو''۔

ایمان علی نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اور سر جھکا کر وہاں سے جانے لگا۔ وہ کہاں جائے گا؟ اور کیا کرے گا؟ وہ خود نہیں جانتا تھا۔ وہ تو

بری طرح الجھ کر رہ گیا تھا۔ اگرچہ چوہدری نے ایک برا انسان ہونے کے باوجود یہ اچھی بات کی تھی کہ مسجد آخر مسجد ہے اور عبادت کے لئے بنائی گئی ہے۔ یہ نہ دیکھا جائے کہ اسے بے ایمان نے بنایا ہے، یہ دیکھا جائے کہ اسے ایمان کے لئے بنایا گیا ہے۔ ایمان علی کا اختلاف چوہدری سے ہونا چاہیے، مسجد سے نہیں۔ مگر اس کا دل نہیں مانتا تھا۔ چوہدری کی بے ایمانیوں اور مکاریوں کو دیکھ کر وہ اندر ہی اندر نفرت اور غصے سے تلملا رہا تھا۔ اس کا دل یہی کہہ رہا تھا کہ جب بھی نماز کے اوقات میں سجدے میں سر جھکائے گا تو چوہدری کے فریب کی پوری داستان سجدے میں اس کے سر میں گھومتی رہے گی۔ وہ بظاہر سجدہ کرے گا اور باطن میں اپنے احمق بننے پر اور چوہدری کے احمق بنانے پر کڑھتا رہے گا۔ نہیں وہ ایسی جگہ نماز نہیں پڑھا سکتا۔ پھر وہ کیا کر سکتا ہے؟

یہی بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ اب وہ کیا کرے گا؟ کہاں جائے گا؟ حالانکہ اس کے قدم بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ بعض اوقات انسان ارادے سے نہیں چلتا، غیری ارادی طور پر اس کے قدم اسے منزل مقصود تک لے جاتے ہیں۔ اس کے قدم حجرے کے دروازے کے پاس پہنچ کر رک گئے۔ وہ گھبرا کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ کیا یہی منزل مقصود تھی؟ اس نے تو یہاں آنے کا ارادہ نہیں کیا تھا پھر کون سا جذبہ اسے یہاں تک کھینچ لایا۔ یہاں کون سی ایسی ہستی تھی جو اس کا انتظار کر رہی تھی؟ جب وہ یہاں سے گیا تھا تو وہ اسے پکار رہی تھی۔ وہ جو التجا آمیز پکار تھی، وہ اب تک اس کے ذہن کے کسی گوشے میں چھپی ہوئی تھی جو اسے کشاں کشاں واپس لے آئی ہے۔

دروازے پر آہٹ سن کر سکینہ نے سر اٹھایا تو اسے دیکھتے ہی خوشی سے کھل اٹھی۔ آہ کیا اسے دیکھ کر کسی لڑکی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ سکتی ہے؟ کسی کا چہرہ انتظار کی طوالت کے بعد اسے دیکھ کر گلاب کی طرح کھل سکتا ہے؟ ہاں یہ جذبے، یہ خوشیاں اسے مل رہی ہیں۔ وہ جو اس کے سامنے تھی وہ سر سے پاؤں تک اس کی تھی۔ اس کے لئے مسکرا رہی تھی، اس کے لئے کھل رہی تھی اور اس کے انتظار میں اپنی بیماری سے زرد ہونے کے باوجود جاگ رہی تھی۔ اب اس لڑکی کے دماغ میں جتنی سوچیں تھیں، جتنے جذبے تھے، جتنی آرزوئیں تھیں، جتنی مسرتیں تھیں، وہ سب ایک انسان کے لئے تھیں۔ وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اک دم سے اسے اتنی ساری جائیداد مل جائے گی اور یہ جائیداد ایک لڑکی کے وجود میں چھپ کر آئے گی۔ وہ پھر اک دم سے تھک کر فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا۔

''آہ! یہ میرے ساتھ کیسا مذاق ہو رہا ہے؟ مجھے خوشیاں بھی دی گئی ہیں تو ایسی جنہیں میں ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ یہ میری ہے مگر میں اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنا نہیں سکتا جب تک کہ یہ پرائے بچے کی ماں نہ بن جائے۔ مجھے کب تک انتظار کرنا ہوگا؟ نو مہینے، دس مہینے، ایک سال۔ میں کیسی سزا کاٹوں گا۔ کنوئیں کے پاس بیٹھا رہوں گا، پیاس کی شدت سے کنوئیں کا طواف کرتا رہوں گا مگر پانی نہیں پی سکوں گا۔ میرے ساتھ کیسا مذاق ہو رہا ہے؟ جس نے پیاس کے متعلق سوچا تو اسے یاد آیا کہ جب وہ پہلی بار دلہن کے قریب جانا چاہتا تھا تو اس وقت اسے شدت سے پیاس لگ رہی تھی مگر حجرے میں پانی نہیں تھا صرف دودھ کا ایک گلاس تھا جس میں تھوڑا سا دودھ سکینہ نے پیا تھا۔ وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے بولا۔

''مجھے پیاس لگ رہی ہے''۔

یہ سن کر سکینہ چارپائی سے اتر کر کھڑی ہوگئی اور دودھ کا گلاس اٹھاتی ہوئی بولی۔

''یہاں پانی نہیں ہے۔ پتا نہیں تو کہاں چلا گیا تھا، اب تھک ہار کر آ رہا ہے۔ میں تجھے بلاتی رہی مگر تو نے جواب نہیں دیا۔ یہ لے دودھ پی لے''۔

ایمان علی نے ہاتھ اٹھا کر دودھ لینے سے انکار کرتے ہوئے کہا۔

''میں یہ دودھ نہیں پیوں گا، یہ ایک بے ایمان آدمی کے گھر سے آیا ہے''۔

سکینہ نے اس کے قریب اکڑوں بیٹھتے ہوئے کہا۔

''میں سمجھتی ہوں کہ تو بہت ایمان والا ہے مگر تو اس دنیا میں لوگوں کی دی ہوئی کس کس چیز کو ٹھکرائے گا۔ یہاں جو بھی چیز تیرے سامنے آئے گی، اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی بے ایمانی چھپی ہوگی۔ یہ زمین جہاں تو بیٹھا ہوا ہے، یہ بھی اسی بے ایمان آدمی کی ہے۔ یہ مسجد بھی اسی کی ہے، یہ پنڈ بھی اس کا ہے، یہاں کی زمینوں میں اگنے والا اناج بھی اسی کا ہے، یہاں کے کنوؤں سے نکلنے والا پانی بھی اسی کا ہے، تو کتنی چیزوں سے انکار کرے گا''۔

ایمان علی نے بڑی بے بسی سے اسے دیکھا پھر کہا۔

''تو ٹھیک کہتی ہے میں بھی یہی سوچتا آ رہا ہوں کہ میں یہاں زمین کے جس حصے پر قدم رکھوں گا، مجھے وہ بے ایمان آدمی یاد آتا رہے گا اور میں کڑھتا رہوں گا۔ اس لیے اب میں یہاں نہیں رہوں گا، یہاں سے دور چلا جاؤں گا''۔

''تو کہاں جائے گا اور کیسے جائے گا؟ اور کہیں جائے گا تو اکیلے جانے کی بات کیوں کرتا ہے؟ میں تو تیری زندگی کا ایک حصہ بن چکی ہوں، سائے کی طرح تیرے ساتھ رہنے آئی ہوں۔ تو جو فیصلہ کرے گا میں اس سے انکار نہیں کروں گی۔ تو ساری زندگی دھوپ میں چلنے کے لئے کہے گا تو میں تیرے ساتھ چلتی رہوں گی۔ بول کہاں جانا چاہتا ہے؟ میں بھی تیرے ساتھ چلوں گی لیکن اتنا ضرور کہوں گی کہ تو جہاں بھی جائے گا، تجھے ایک کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا چوہدری ملتا جائے گا۔ تیری عمر مجھ سے زیادہ ہے مگر میری غلامی کا تجربہ تجھ سے زیادہ ہے۔ میں جانتی ہوں کہ غریبوں اور ایمان والوں کی کمزوری سے یہ دنیا والے کس طرح فائدہ اٹھاتے ہیں''۔

وہ سکینہ کا منہ دیکھنے لگا۔ اس کی عمر بہ مشکل بیس برس ہوگی اور اس عمر میں وہ پکی ہوئی عمر کے تجربے بیان کر رہی تھی۔ عورت ایک بار ہانڈی کی طرح آگ پر چڑھتی ہے تو چاول کا صرف ایک دانہ نہیں گلاتی، ایک ہی ابال میں وہ تجربات کے سارے دانوں کو پرکھ لیتی ہے۔ اس نے ایک چوہدری کو گلا کر دنیا کے سارے گلے سڑے چوہدریوں کے چہرے دیکھ لئے تھے۔ اس کے برعکس ایمان علی زمانے بھر کی ٹھوکریں کھاتا ہوا شاہ پور تک آیا تھا اور تمام تلخ تجربوں کو بھلاتا آیا تھا۔ وہ سیدھا سادہ انسان اپنے دشمنوں کو معاف کر دینے کا عادی تھا کیونکہ رسول خدا ﷺ بھی اپنے دشمنوں کو معاف کر دیا کرتے تھے اور اپنے دشمنوں کو سر جھکا کر سوچنے پر مجبور کر دیا کرتے تھے۔ مگر اس اندھیر نگری میں اسے کوئی دشمن سر جھکا کر سوچتا ہوا اور نادم ہوتا نظر نہیں آیا۔ آج تک کسی دشمن نے بھی ندامت سے یہ نہیں کہا تھا کہ مولوی صاحب تم راستی پر ہو۔ وہ یہی کہتے رہے کہ جو زمانے کے ساتھ نہیں چل سکتا، وہ اس زمانے کا سب سے احمق انسان ہے۔ اس دور میں زندہ رہنے کے لئے تھوڑی تھوڑی ایمانداری اور تھوڑی تھوڑی بے ایمانی دونوں ہی ہونی چاہئیں۔ یعنی مسجد کی چھوٹی سی دنیا میں حسب حیثیت تھوڑا تھوڑا مکر و فریب ضرور ہو۔ ایک کے منہ سونے کا نوالہ چھیننے کے لئے

دوسرے کے منہ میں جھوٹا لقمہ ٹھونسنے کے لئے یا دوسرے لفظوں میں خود کو اونچی سطح پر زندہ رکھنے کے لئے دوسروں کو اپنی سطح سے نیچے گرانا پڑتا ہے۔ انسانوں کے درمیان یہ عمل ایک مدت سے جاری ہے اور کتنی مدت تک جاری رہے گا یہ کوئی نہیں کہہ سکتا۔ ایمان علی نے کہا۔

''تو ٹھیک کہتی ہے۔ میں بھی اب تک جہاں جہاں گیا، وہاں سجدے کرنے والے ملے مگر ایمان کو ایمان کی طرح برتنے والا کوئی نہ ملا۔ مگر اس شاہ پور کی مسجد سے آگے بھی بہت بڑی دنیا ہے اور بہت سی مسجدیں ہیں۔ آگے جا کر کہیں تو شریف اور ایماندار لوگ ملیں گے۔ ہم آگے جائیں گے جہاں ایمان کو سمجھنے والے ملیں گے وہاں ٹھہر جائیں گے مگر تو میرے ساتھ کیسے چلے گی۔ یہاں تیرے بوڑھے ماں باپ بے یار و مددگار رہ جائیں گے''۔

سکینہ نے جواب دیا'' شادی کے بعد عورت اپنے گھر کی ہو جاتی ہے اور میکے والوں کو چھوڑ کر صرف اپنے مجازی خدا کے پیچھے چلتی ہے۔ یوں بھی میرے بوڑھے ماں باپ کو تین وقت کی روٹیاں ملتی رہیں گی۔ چوہدری میں بہت سی برائیاں ہیں مگر بہت سی اچھائیاں بھی ہیں۔ اس کے جو ملازم بوڑھے یا بیمار ہو جاتے ہیں اور کام کے قابل نہیں رہتے، وہ ان کے گھر تینوں وقت کی روٹی بھجوا دیتا ہے''۔

یہ تو ایمان علی نے بھی دیکھا تھا کہ چوہدری ایک ہاتھ سے برائی کرتا تھا اور دوسرے ہاتھ سے نیکی کرتا تھا۔ اس دنیا میں ایسے لوگوں کی اکثریت ہے جو خدا سے ڈرتے بھی ہیں، گناہ بھی کرتے ہیں پھر اس کا بوجھ کم کرنے کے لئے نیکی بھی کرتے ہیں۔ کسی کے دکھ مصیبت میں کام آجاتے ہیں۔ کسی کے بڑھاپے میں روزی کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ بہت زیادہ دولت مند ہوں تو حج کرنے چلتے جاتے ہیں تاکہ گناہ دھل جائیں۔ گناہ وہ ضرور کرتے ہیں، کسی کے ساتھ برائی ضرور کرتے ہیں، کسی کو لوٹتے گھسوٹتے ہیں لیکن اس کے ساتھ کچھ نہ کچھ نیکی بھی کر جاتے ہیں۔ بس چوہدری ایسا ہی تھا۔ پنڈ والوں کے برے وقت میں کام آتا رہتا ہے سکینہ نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس کے بوڑھے ماں باپ کو تین وقت کی روٹیاں ضرور ملتی رہیں گی۔

لیکن سکینہ کی روٹیوں کا انتظام اب اسے کرنا تھا اور وہ یہ حماقت کر رہا تھا کہ ایک عورت کا بوجھ لاد کر روٹی حاصل کرنے کی جگہ چھوڑ کر جا رہا تھا۔ اس نے کل کی فکر کبھی نہیں کی تھی لیکن اب وہ سکینہ کے لئے سوچ رہا تھا کہ کل وہ اسے روٹی کہاں سے کھلائے گا؟ سوچنے سے تو روٹی نہیں مل جاتی۔ وہ پھر سکینہ کا منہ تکنے لگا۔ گلابی گلابی سا مکھڑا عین نگاہوں کے سامنے تھا۔ ایک پوری عورت اس کے حصے میں آئی تھی۔ اس کی جائیداد بن گئی تھی۔ وہ جس طرح چاہتا اس عورت کو رکھ سکتا تھا مگر بھوکا تو نہیں رکھ سکتا تھا اور اسے چھوڑ بھی نہیں سکتا تھا۔ اتنی حسین عورت کو چھوڑنے کا دل بھی نہیں چاہتا تھا پھر شرعی طور پر نکاح ہو چکا تھا۔ وہ دل اور دماغ میں بھی سما گئی تھی۔ ہر طرح سے اسے سکینہ کے آنچل سے بندھا رہنا تھا۔

وہ اس طرح اکڑوں بیٹھی ہوئی تھی جیسے اس کے سامنے شباب کی گٹھری بندھی رکھی ہو۔ ایک شوہر ہونے کے ناطے وہ گٹھری کھول سکتا تھا لیکن چھونے کا مطلب یہ ہوتا کہ خواہشات سر ابھارتیں اور وہ آگے اور آگے بہکتا چلا جاتا جبکہ حاملہ دلہن کے ساتھ بہکنا ممنوع تھا۔ وہ اندر ہی اندر جیسے پک رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس عورت کے ساتھ کس طرح آزمائشی زندگی گزارے گا، کب تک پاس رہ کر بھی دور دور رہے گا۔ حجرے کی تنہائی اسے رہ رہ کر صرف ایک جوان عورت کے بارے میں بہت دور تک سوچنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس نے پریشان ہو کر کہا۔

''اب ہمیں یہاں سے چلنا چاہئے''۔

سکینہ نے پوچھا۔

''ہم اس وقت کہاں جائیں گے؟ راستے کا علم تو ہونا چاہئے''۔

''بس کہیں بھی جائیں گے۔ مگر یہاں نہیں رہیں گے۔ کسی دوسرے پنڈ میں ہوسکتا ہے، ہمیں سر چھپانے کی جائے مل جائے''۔

''وہ تو ٹھیک ہے۔ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ تو جہاں جہاں جائے گا، میں تیرے ساتھ چلوں گی مگر تو ایک جوان عورت کو لے کر اندھیری رات میں سفر کرے گا تو کیا راستے میں چور بدمعاش نہیں ملیں گے۔ تو ہمیشہ یہ کیوں سوچتا ہے کہ تجھے اتنی رات کو بھی تیرے ہی جیسے ایماندار لوگ راستے دینے کے لئے کھڑے رہیں گے، تیری کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگائیں گے، مجھے تجھ سے چھین کر نہیں لے جائیں گے۔ تو یہ سب سوچتا کیوں نہیں ہے؟''

''کیا مصیبت ہے!'' ایمان علی سر تھام کر سوچنے لگا۔ پہلے وہ بڑی بے فکری سے اندھیری راتوں میں سفر کرتا تھا۔ اس کے پاس نہ کھانے کے لئے روٹی ہوتی تھی، نہ روٹی خریدنے کے لئے جیب میں پیسہ ہوتا تھا۔ اس کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہوتی تھی جسے چور ڈاکو راستے میں لوٹ سکیں۔ مگر اب ایک جوان عورت ایک لچکتے ہوئے خزانے کی طرح اس کے ساتھ ساتھ چلنے والی تھی اور اسے فکر اور پریشانی میں مبتلا کر رہی ہے۔ اب وہ آزاد نہیں تھا، اس کے پر کاٹ دیئے گئے تھے۔ وہ بے پر کا پروانہ جو کبھی صرف شمع الٰہی کا طواف کرتا تھا، اب شمع حسن کی حفاظت کے لئے فکر مند ہو گیا تھا۔

ایسے وقت پتا چلتا ہے کہ مصلحت اندیشی کسے کہتے ہیں۔ وقت اور حالات کے مطابق انسان کو کام کرنا پڑتا ہے اور حالات کا تقاضہ یہ تھا کہ وہ اپنی جوان بیوی کو لے کر رات کے اندھیرے میں نہیں نکل سکتا تھا۔ لہٰذا اسے ایک بے ایمان کی زمین پر رات گزارنی تھی۔ جب وہ ایک رات گزار سکتا تھا، چوہدری کی مسجد میں ایک وقت کی نماز پڑھا سکتا تھا تو پانچوں وقت کی نمازیں بھی پڑھا سکتا تھا۔ پھر بات کیا رہ جاتی ہے؟ کس بات کا جھگڑا رہ جاتا ہے؟ سوچا جائے تو جھگڑا کسی بات کا نہیں تھا اور بہت سی باتوں کا تھا۔ لیکن مسجد سے کسی قسم کا اختلاف نہیں تھا، مسجد بنانے والے سے تھا۔ اب حالات اسے سوچنے پر مجبور کر رہے تھے کہ سکینہ کی حفاظت کی خاطر اسے یہاں ٹھہر جانا چاہیے اور اس بات کو تسلیم کر لینا چاہئے کہ مسجد کے معاملات اپنی جگہ ہیں اور انسانی جھگڑے اپنی جگہ۔ لہٰذا اسے اسی مسجد میں نماز پڑھنا اور پڑھانا چاہئے۔ اس نے سر اٹھا کر کہا۔

''سکینہ میں اسی مسجد میں نماز پڑھاؤں گا۔ ہم یہاں سے نہیں جائیں گے''۔

سکینہ خوش ہو کر اسے دیکھنے لگی۔ اسے اس بات کی خوشی تھی کہ اس نے ایمان علی کے ایمان میں ذرا سی لچک پیدا کر دی تھی اور پہلی بار اسے حالات سے سمجھوتہ کرنا سکھا دیا تھا۔ وہ خوشی سے دودھ کا گلاس بڑھاتے ہوئے بولی۔

''لے اسے پی لے، تجھے بہت پیاس لگ رہی تھی نا؟''

اس نے سکینہ کا ہاتھ ہٹاتے ہوئے کہا۔

''میں اسے منہ نہیں لگاؤں گا۔ میں اسے اپنے لئے حرام سمجھتا ہوں اور حرام اس لئے کہ چوہدری کے گھر سے آیا ہے۔ میں چوہدری کے گھر کا کھانا بھی نہیں کھاؤں گا''۔

سکینہ نے حیرانی سے کہا ''تو پھر ہم روٹی کہاں سے کھائیں گے؟''

اس نے جواب دیا ''کل صبح نماز کے بعد میں پنڈ والوں سے کہوں گا کہ وہ ایک مسجد کمیٹی بنائیں اور سب مل کر مسجد اور پیش امام کے اخراجات اٹھائیں۔ اس طرح سب لوگ اپنے اپنے گھروں سے حسب حیثیت چندے کے طور پر چھوٹی بڑی رقمیں یا اناج دیں گے اس طرح ہمارا گزارا ہو جائے گا''۔

اس کی بات ختم ہوتے ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک کے ساتھ چوہدری کی آواز آئی۔

''مولوی صاحب باہر آؤ، میں ابھی تمہارے لیے ایک مسجد کمیٹی بناتا ہوں''۔

اس کی آواز سنتے ہی ایمان علی فوراً اٹھ کر کھڑا ہو گیا لیکن سکینہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور سہمے ہوئے لہجے میں کہنے لگی۔

''میں چوہدری کا لہجہ سمجھتی ہوں۔ اس کی آواز بتا رہی ہے کہ وہ غصے میں ہے۔ تو اس وقت نہ جا، میں اس سے بات کر لیتی ہوں''۔

ایمان علی نے اس کا ہاتھ جھٹک کر کہا۔

''خبردار! اب کبھی چوہدری کے سامنے جانے کی بات نہ کرنا۔ تو میری بیوی ہے اور میرے سوا ہر مرد سے پردہ کرے گی۔ یہ ہم مردوں کا جھگڑا ہے، میں خود ہی نمٹ لوں گا۔ تو حجرے سے باہر قدم نہ رکھنا''۔

یہ کہہ کر وہ دروازہ کھولتے ہوئے باہر آ گیا۔ باہر پانچ ہٹے کٹے جوان ہاتھوں میں لاٹھیاں لیے کھڑے تھے۔ جیسے ہی وہ باہر آیا چوہدری نے اس کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔

''کیا یہ مسجد تیرے باپ کی ہے کہ تو مسجد کمیٹی بنائے گا؟ آج مسجد کمیٹی بنانے کی بات کر رہا ہے، کل کھیت کمیٹی بنانے کی کوشش کرے گا اور لوگوں کو سمجھائے گا کہ سب مل کر کھیتوں کا بھی انتظام کریں۔ جس طرح ایک مولوی کے لئے ہر گھر سے تھوڑا تھوڑا اناج آئے گا اسی طرح اس پنڈ کے لئے اناج کی منصفانہ تقسیم ہوگی۔ تو جس طرح مسجد سے ایک آدمی کی اجارہ داری ختم کرنا چاہتا ہے اسی طرح میری دولت، میری جائیداد اور میرے کھیتوں پر سے بھی مجھ جیسے ایک آدمی کی اجارہ داری ختم کرنے کی کوشش کرے گا۔ تو بے حد خطرناک ہے۔ تو شیطان ہے اور مولوی کے روپ میں آیا ہے۔ میں تجھے یہاں نہیں رہنے دوں گا۔ اگر تو اپنی خیریت چاہتا ہے تو ابھی اور اسی وقت چپ چاپ یہاں سے چلا جا ورنہ یہ جوان تیری لاش کو اٹھا کر یہاں سے دور کہیں پھینک دیں گے''۔

ایمان علی نے بوکھلا کر کہا۔

''چوہدری..... یہ تم کیا کر رہے ہو۔ ایک شریف آدمی کا گریبان پکڑنا کہاں تک مناسب ہے۔ میں لڑنے جھگڑنے والا آدمی نہیں ہوں۔ سیدھی طرح باتیں کرو۔ میں خود یہاں نہیں رہنا چاہتا تھا لیکن دو باتوں نے فی الحال یہاں رہنے پر مجبور کیا تھا۔ ایک سکینہ کا تحفظ..... دوسری بات یہ ہے کہ مسجد کو ویران چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ ہاں یہ درست ہے کہ میں حلال روٹی کھانے کے لئے یہاں مسجد کی کمیٹی بنانا چاہتا تھا جو تجھے پسند نہیں ہے۔ اس ناپسندیدگی کے بہانے تو کس گناہ پر پردہ ڈالنا چاہتا ہے اور کس طرح خود کو آنے والی بدنامیوں سے بچانا چاہتا ہے، میں یہ اچھی طرح سمجھتا

ہوں مگر میں تجھ سے بحث نہیں کروں گا، یہاں سے چپ چاپ سکینہ کو لے کر چلا جاؤں گا۔ تو میرا گریبان چھوڑ دے، میں ابھی جا رہا ہوں“۔

چوہدری نے اس کا گریبان چھوڑ دیا۔ وہ فوراً ہی پلٹ کر حجرے میں آیا اور سکینہ سے بولا۔

”فیصلہ ہو چکا ہے ہم ابھی یہاں سے جا رہے ہیں۔ میرے ساتھ کوئی سامان نہیں ہے۔ یہ کپڑا جو میں نے پہنا ہوا ہے بس یہی میرا اپنا ہے۔ تیرے پاس تیرا اپنا جو لباس ہے، اسے پہن لے اور یہ دلہن کا سرخ جوڑا اتار دے کیونکہ چوہدری نے اپنے گناہ کو اس حجرے میں دفن کرنے کے لئے تیرے لئے یہ سرخ کفن سلوایا تھا۔ میں اب اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ میں باہر جا رہا ہوں اور جتنی جلدی ہو سکے لباس بدل لے“۔

یہ کہہ کر وہ اس کا جواب سنے بغیر واپس آ گیا اور چوہدری سے تھوڑی دیر کی اجازت چاہی تاکہ اس کی دلہن اپنا لباس بدل لے۔ چوہدری نے سر ہلا کر اسے اجازت دے دی لیکن وہ اپنے آدمیوں کے ساتھ وہاں کھڑا رہا جب تک کہ سکینہ اپنے پرانے لباس میں چادر لپیٹ کر باہر نہیں آ گئی۔ ایمان علی نے اسے پردہ کرنے کا حکم دیا تھا اسی لئے وہ سر سے پاؤں تک چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔

چوہدری اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔ ایمان علی نے فوراً ہی اپنی دلہن کا ہاتھ تھام لیا اور وہاں سے دور ہوتا چلا گیا۔

O☆O

زندان میں پھول
علی میاں پبلیکیشنز

قلم کے نواب محی الدین نواب کا ایک طویل ناول
اندھیر نگری
محی الدین نواب
قیمت فی جلد 150 روپے
چار جلدوں میں مکمل
الرفاعی پبلشرز
علی میاں پبلیکیشنز

اسلام کے ایک گمنام مجاہد کی ایمان افروز سرگزشت
اباقہ
طاہر جاوید مغل
دو جلدوں میں مکمل
قیمت فی جلد 400 روپے
علی میاں پبلیکیشنز
20 عزیز مارکیٹ، اردو بازار لاہور 7247414
علی بکسٹال

رات کالی تھی اور وہ زندگی کے کالے سفر پر رواں دواں تھے ان کے پیچھے دور اندھیرے میں شاہ پوری کی بستی گم ہو چکی تھی۔ ان کے آگے دور اندھیرے میں ان کی کوئی نا معلوم منزل چھپی ہوئی تھی۔ اس کی ہم سفر بے حد حسین تھی لیکن اس کے حسن کی چاندنی آگے جانے والے راستے کو روشن نہیں کر سکتی تھی۔ ایمان علی کے ایمان کا نور بھی اس راستے کی تاریکی کو دور نہیں کر سکتا تھا کیونکہ حسن کا چاند دل کے آسمان پر چمکتا ہے اور ایمان کی روشنی تہذیب کے راستوں کو اجاگر کرتی ہے۔ اس سے پہلے کالی تہذیب کے کالے راستوں پر خود کو گھسیٹتے رہنا پڑتا ہے۔

سکینہ چلتے چلتے تھوڑی دیر کے لئے رک گئی اور پلٹ کے پیچھے کی طرف دیکھنے لگی۔ پیچھے اس کا پنڈ نظر آ رہا تھا مگر چشم تصور میں۔ وہ اپنے بوڑھے ماں باپ کو اور اپنے بوڑھے مکان کو دیکھ رہی تھی۔ جس مٹی میں وہ بچپن سے کھیلتی آ رہی تھی، اس مٹی کی مہک اسے محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ایک سرد آہ بھر کر رہ گئی۔

ایمان علی نے پوچھا ''کیا واپس جانا چاہتی ہے؟''

سکینہ نے نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں! میں واپس جانے کے لئے نہیں آئی ہوں، بس دل میں ایک بے چینی سی ہے۔ جہاں ہم پیدا ہوتے ہیں کیا اس جگہ کو چھوڑتے وقت دکھ نہیں ہوتا؟ کیا عورت اپنے میکے سے رخصت ہوتے وقت روتی نہیں ہے؟ بس یہ میکہ چھوڑنے کے آنسو ہیں۔ یہ صدمہ رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گا۔ ہاں میں یہ کہنا چاہتی تھی کہ اگر تو پسند کرے تو میں تجھے اپنے ماموں کے یہاں لے جاؤں۔ یہاں سے تیس میل دور وہ کھڈیالا میں رہتے ہیں۔ جب ہماری کوئی منزل نہیں ہے تو ہمیں وہاں چل کر دو چار روز کے لئے پناہ لینی چاہیے۔ پھر ہم سوچیں گے کہ ہمیں کہاں جانا ہے''۔

ایمان علی نے اس کے ساتھ آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''اگر وہ تیرے ماموں ہیں تو میں تیرے ساتھ وہاں چلوں گا۔ تجھے دو چار دن کے لئے وہاں چھوڑ دوں گا اور اپنے لئے روزی کا ذریعہ تلاش کروں گا۔ تیرا ماموں دو چار روز کے لئے تجھے بوجھ تو نہیں سمجھے گا؟''

''نہیں جب انہیں معلوم ہوگا کہ تو میرا خاوند ہے تو وہ تیری بڑی عزت کریں گے اور وہ.....''

وہ کہتے کہتے رک گئی اور ذرا سر گھما کر اپنے ساتھ چلنے والے مجازی خدا کو دیکھنے لگی، پھر سر جھکا کر بڑی آہستگی اور درد بھرے لہجے میں بولی۔

''کیا آج ہماری سہاگ رات ہے؟''

اس کے لہجے میں ایسا درد تھا جو ایمان علی کے دل کو چھو کر گزر گیا۔ واقعی وہ کیسی سہاگ رات تھی، دلہا نے اچھی طرح اپنی دلہن کا گھونگھٹ بھی نہیں اٹھایا تھا۔ وہ چہرہ دیکھ رہا تھا، اسے چھو نہیں رہا تھا۔ دلہن اس کے ساتھ تھی مگر سیج کا سفر نہیں تھا۔ ایمان علی نے پہلے کبھی سہاگ رات نہیں دیکھی تھی لیکن وہ جانتا تھا کہ شب وصال آج کی طرح کالی نہیں ہوتی تھی۔ آج کی رات جذبات کے الاؤ روشن ہوتے ہیں اور خواہشیں دھوم مچاتی ہیں۔ وہ سب کچھ سمجھ رہا تھا اور اپنے ساتھ چلتے ہوئے بدن کی آنچ محسوس کرتا جا رہا تھا۔ تڑپ رہا تھا، تڑپ کا اظہار نہیں کر رہا تھا۔ اس نے بڑی بے بسی سے کہا۔

''ہاں سکینہ آج سہاگ رات ہے۔ مگر چوہدری کی باتوں میں آ کر تو نے جو غلطی کی ہے، اس کی سزا تجھے مل رہی ہے اور میں بھی سزا کاٹ

رہا ہوں۔ میں تجھے ابھی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ ہمارے درمیان کوئی فاصلہ نہیں ہے اس کے باوجود میرے اور تیرے درمیان چوہدری کا گناہ سفر کر رہا ہے۔ جب تک وہ گناہ ایک بچے کے روپ میں تجھ سے الگ نہیں ہوگا، اس وقت تک تو مجھ پر حرام ہے"۔

وہ چل رہی تھی اور جل رہی تھی۔ ایسے جل رہی تھی جیسے بھری برسات میں گھر جلتا ہے۔ گھر جلتا بھی ہے اور برسات میں بجھتا بھی ہے اور اپنی راکھ کے ڈھیر کے اندر بجھنے کے باوجود کہیں کہیں سے سلگتا بھی رہتا ہے۔ جیسے وہ شرم وحیا کے تحت اوپر سے بجھی بجھی تھی اور اندر کہیں کہیں سے سلگ رہی تھی۔

وہ چلتے چلتے کنکھیوں سے ایمان علی کو دیکھنے لگی۔ ہر جوان لڑکی کی طرح اس نے بھی ایک گبھرو جوان کا سپنا دیکھا تھا۔ ایمان علی کسی حد تک اس کے خواب کی تعبیر تھا۔ اچھے اور لانبے قد، چوڑی ہڈی کا آدمی تھا۔ اگر آئے دن فاقے نہ کرتا، بدن پر گوشت ہوتا اور خوب بھاری بھرکم نظر آتا۔ مگر ایمان داری نے اسے سکھا دیا تھا کہ وہ لانبے بانس کی طرح نظر آتا تھا۔ اب اس کی ایمانداری سکینہ کو سکھا رہی تھی۔ سارے جذبات پر اوس پڑ رہی تھی۔ ابھی تک وہ اسی انتظار میں تھی کہ یہ ایمان علی اگر حسن کا تمنائی ہوگا تو ایک پروانے کی طرح آئے گا۔ اگر جوانی کی مٹھاس پکارے گی تو آس پاس مکھی کی طرح بھنبھنائے گا مگر نہ پروانے کی طرح آرہا تھا، نہ مکھی کی طرح بھنبھنا رہا تھا بلکہ ایک بزدل مچھر کی طرح کانوں کے قریب گنگناتے ہوئے گزر رہا تھا کہ تو مجھ پر حرام ہے۔

سکینہ کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ شادی سے پہلے وہ کس طرح حلال کر دی گئی اور شادی کے بعد کس طرح حرام ہوگئی۔ یہ درست ہے کہ مکھیاں بیماری کا گھر ہوتی ہیں، مٹھاس پر بیٹھ جائیں تو مٹھائی کو ضائع کر دینا چاہیے مگر مہنگائی کے اس دور میں مٹھائی پھینکی نہیں جاتی صرف مکھیاں اڑا دی جاتی ہیں۔ اسی طرح سے چوہدری اس پر سے اڑ چکا تھا۔ پر ایمان علی کیوں اس مٹھائی سے پرہیز کر رہا تھا، یہی بات سکینہ کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔ وہ شرم وحیا کے باعث کچھ پوچھ نہیں سکتی تھی، اس مسئلے پر بحث نہیں کر سکتی تھی اس لئے چپ چاپ چل رہی تھی۔ اس کے چاروں طرف تاریکی منہ پھاڑے کھڑی تھی اور اسے قدم قدم نگلتی جا رہی تھی۔ موسم گرما کی ہوائیں تھم تھم کر بہہ رہی تھیں۔ چادر میں لپٹے رہنے کے باعث اسے پسینہ آرہا تھا۔ ٹھنڈی ہوا کا کوئی جھونکا گزر جاتا تو اس کی جان میں جان آتی۔ اس نے پریشان ہو کر چادر کو سر سے ہٹا دیا اور کھلی فضا میں گہری گہری سانسیں لینے لگی۔ اس وقت اسے پتا چلا کہ اس کے ساتھ خاموشی سے چلنے والا اس کی زندگی کا ہم سفر زیر لب گنگناتے ہوئے کچھ کہہ رہا ہے یا کچھ پڑھ رہا ہے۔

"کیا تو کچھ کہہ رہا ہے؟"

ایمان علی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر اسے گردن تک بے پردہ دیکھ کر چاروں طرف نظریں دوڑانے لگا کہ کہیں کوئی اس کی دلہن کو بے پردہ تو نہیں دیکھ رہا ہے۔ صرف اندھیرا دیکھ رہا تھا اور اندھیرے میں کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کچے ویران راستے پر کسی کے نظر آنے کی توقع بھی نہیں تھی۔ اس نے مطمئن ہو کر جواب دیا۔

"میں کلام پاک کی تلاوت کر رہا ہوں۔ جب میں تنہا ہوتا ہوں یا لمبے سفر پر نکلتا ہوں تو قرآن خوانی میں مصروف ہو جاتا ہوں۔ پھر پتا نہیں چلتا کہ اتنا لمبا سفر کیسے کٹ گیا"۔

وہ یہ کہہ کہ پھر پڑھنے لگا۔ کچھ اس طرح مصروف ہو گیا کہ زبان پڑھتی جا رہی تھی اور دماغ سوچتا جا رہا تھا۔ اکثر رٹا ہوا سبق زبان سے دہراتے وقت دماغ کچھ اور ہی سوچتا رہتا ہے، کسی اور طرف بھٹکتا رہتا ہے۔ ایمان علی بہت دیر سے اندر ہی اندر ایک جنگ میں مصروف تھا۔ وہ پوری توجہ سے پڑھنا چاہتا تھا مگر دماغ تھا کہ ساتھ چلنے والی کی طرف سرکتا جا رہا تھا جو ایک نئی نویلی دلہن تھی، جو تازہ تازہ کھلے ہوئے پھول کی طرح خوشبو لٹاتی جاتی تھی۔ ایسا نہ ہوا کہ اس اندھیرے میں اور اس ویران راستے میں اس خوشبو کو لوٹنے والا کوئی لٹیرا آ جائے۔

کسی لوٹنے والا کا اتنا زیادہ ڈر نہیں تھا جتنا کہ وہ اپنے آپ سے ڈر رہا تھا اور اپنی ہم سفر سے توجہ ہٹانے کے لئے اللہ کا کلام پڑھ رہا تھا تا کہ شیطان ہمکلام نہ ہو۔ مگر ایسی جگہ شیطان بھی نہیں بولتا جہاں عورت بولتی ہے۔ وہ بولنے لگی۔

''مگر تو اس وقت تنہا نہیں ہے، میں تیرے ساتھ چل رہی ہوں۔ مجھ سے باتیں کرے گا تو کیا یہ راستہ نہیں کٹے گا؟ میں تیری بیوی ہوں، بلا تو نہیں ہوں کہ پڑھ پڑھ کر پھونکتا جا رہا ہے''۔

وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ اس بات کو وہ اچھی طرح سمجھتا تھا کہ جب شادی کر کے دنیاداری شروع کی ہے تو اسے اپنی بیوی کے جذبات اور احساسات کو بھی سمجھنا چاہئے، اس سے باتیں کرنا چاہئے، اس کی دلجوئی کرنا چاہئے تا کہ اس بے چاری کو تنہائی کا احساس نہ ہو۔ وہ یہ سب کچھ سمجھتا تھا مگر اپنے آپ کو بہکنے اور بھٹکنے سے بچانے کے لئے اور اس سے کترانے کے لئے اس وقت یاد الٰہی میں مصروف رہنا چاہتا تھا۔ ہر کام کے لئے ایک وقت مقرر ہوتا ہے۔ انسان وقت کو مختلف جذبوں اور مختلف عقیدتوں میں تقسیم کرنے کے بعد خدا سے بھی محبت کرتا ہے اور خدا کی بندی سے بھی لہذا وہ خدا کی بندی کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے تھک ہار کر کہا۔

''اچھی بات ہے، ہم باتیں کریں گے مگر اچھی اچھی باتیں کریں گے''۔

سکینہ نے دور آسمانوں کے کنارے دیکھتے ہوئے کہا۔

''وہ دیکھ آسمان کا کنارہ سرخ ہو رہا ہے، اب چاند نکلنے والا ہے۔ ہر طرف چاندنی پھیل جائے گی اور ہمیں اندھیرے میں یہ ڈوبی دنیا نظر آنے لگے گی۔ میں تیرا چہرہ دیکھ سکوں گی اور تو میری صورت دیکھ سکے گا۔ کیا یہ اچھی باتیں نہیں ہیں؟''

ایمان علی نے گڑبڑا کر اسے دیکھا۔ چادر سر سے ہٹی ہوئی تھی مگر تاروں کی روشنی میں اس کی صورت صاف نظر نہیں آئی۔ وہ ہچکچاتے ہوئے بولا۔

''ہاں اس سے بھی اچھی باتیں ہو سکتی ہیں۔ کیا تجھے کچھ آیتیں یاد ہیں؟''

سکینہ کی بوجھل سی آواز سنائی دی۔

''بچپن میں یاد تھیں۔ جوانی میں چودھری نے بھلا دیں''۔

''میں تجھے پھر سے یاد کراؤں گا چل پڑھ''۔

سکینہ نے جھنجھلا کر کہا۔

''جب مجھے پڑھانا ہی تھا تو مدرسے میں بلایا ہوتا، حجرے میں کیوں بلایا تھا؟''

''عورتوں کی یہ بہت بری عادت ہوتی ہے۔ اچھی باتیں سکھاؤ تو حجت کرنے لگتی ہیں''۔

''عورتوں کی نہیں مولویوں کی بری عادت ہوتی ہے۔ ہمیشہ بے وقت نصیحتیں کرتے ہیں دیکھو اتنی دیر میں چاند نکل آیا ہے۔ چاندنی میں یہ ساری دنیا آہستہ آہستہ یوں اجاگر ہو رہی ہے جیسے خالق کائنات ابھی ابھی ہم دونوں کے لئے اس دنیا کی تخلیق کر رہا ہے۔ کیا یہ سب کچھ ہم دونوں کے لیے نہیں بنایا ہے؟ کیا یہاں سے وہاں تک تجھے کوئی خوبصورتی نظر نہیں آ رہی ہے؟''

ایمان علی نے آسمان کے کنارے چاند کا چہرہ دیکھا پھر اپنے کنارے سکینہ کا چہرہ دیکھا۔ وہاں سے یہاں تک کائنات کا حسن ایک نہ ٹوٹنے والے سلسلے کی طرح پھیلا ہوا تھا اور ایک حسن کو دوسرے حسن سے مربوط کر رہا تھا اور اسے سمجھا رہا تھا کہ صرف عبادت کرنے کے لئے فرشتے کافی ہیں۔ انسان کو تو اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ عبادت بھی کرے اور کائنات کے ذرے ذرے کے حسن کو بھی سمجھے اور اسے اپنے طور پر برتے۔ اگر نہیں برتے گا تو تخلیق کائنات کے مقاصد سے انکار کرے گا۔

وہ چلتے چلتے راستے کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور تھکے ہوئے لہجے میں بولا۔

''مجھے پیاس لگی ہے۔ کتنی دیر ہو گئی جب تو دلہن بن کر حجرے میں آئی تھی، میں اس وقت سے پیاسا ہوں''۔

''یہی تو میں سوچتی ہوں کہ تو رہ رہ کر اپنی پیاس کو کیوں بھول جاتا ہے''۔

ایمان علی نے چونک کر اسے دیکھا۔ چادر اب شانے سے بھی ڈھلک گئی تھی۔ دوپٹہ کہیں چادر کے اندر گڈمڈ ہو گیا تھا اور کوہ آتش فشاں کی طرح دہکتے اور بھڑکتے ہوئے سینے میں سانسیں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ چاندنی کے ستھرے جنگل میں جنگلی گلاب کی گلابیاں نکھر رہی تھیں۔ آخر شب کی سبک ہوائیں اس کی زلفوں سے کھیل رہی تھیں اور محبوب کی نادیدہ انگلیوں کی طرح مکھڑے کی چاندنی پر سائے بکھیر رہی تھی۔

وہ بے اختیار اپنی ہتھیلی سے اپنے سینے کو سہلانے لگا۔ اندر آگ لگی ہوئی تھی اور وہ آگ پانی سے بجھ سکتی تھی۔ یہاں تو پانی نہیں ملے گا۔ اس کی نظریں چاروں طرف سوچ کے کربلا میں بھٹکنے لگیں۔ وہ دونوں بہت دیر تک ایک دوسرے کے سامنے خاموش رہے۔ ہوائیں سسک رہی تھیں۔ اگر وہ اسے سمجھ لیتا تو وہی ہوائیں گنگناتی ہوئیں محسوس ہوتیں۔ سوچ سے جذبے بولتے ہیں اور جذبوں سے کائنات کی ہر چیز کا رنگ ڈھنگ بدل جاتا ہے۔ اچانک ہی ساری فضا گنگنانے لگی۔ دور سے کوئی راہ گیر گاتا ہوا آ رہا تھا۔ ذرا قریب پہنچتے ہی نغمے کے درد کو ٹھیس پہنچی اور وہ ٹھٹک کر رک گیا۔ اس نے سوچا، پتا نہیں یہ دو انسان کون ہیں؟ دو انسانوں نے سوچا، پتا نہیں وہ آنے والا کون ہے؟ انسان ہے یا شیطان؟ آنے والے نے بھی سوچا کہ دونوں بے ضرر راہ گیر ہیں یا لٹیرے ہیں؟ جنگل کے جانور ایک دوسرے سے اتنا خوف نہیں کھاتے جتنا کہ تہذیب کے جنگل میں انسان، انسان سے ڈرتا ہے۔ آنے والے نے مولوی ایمان علی سے پوچھا۔

''تم کون ہو؟''

جواب میں مولوی نے پوچھا ''اور تم کون ہو؟''

''میں جمانوالا کے چوہدری دین محمد کا چھوٹا بھائی ہوں، راستے میں بس خراب ہو گئی تھی اس لئے میں کچے راستے پر آ گیا ہوں۔ میرے

تھرماس میں برف کا ٹھنڈا پانی ہے اور اٹیچی میں چار جوڑے کپڑے، شیونگ کا سامان اور دو ہزار روپے ہیں۔ تم مجھے نقصان نہ پہنچاؤ، یہ دو ہزار روپے لے لو اور مجھے یہاں سے گزر جانے دو"۔

ایمان علی پتھر سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا "ہم لٹیرے نہیں ہیں، خود کہیں سے لٹ کر آئے ہیں۔ ہمارے پاس ایمان کی دولت ہے اس لئے ہم تمہاری دولت کو ہاتھ نہیں لگائیں گے۔ مگر میں پیاسا ہوں، کیا تھوڑا سا پانی پلاؤ گے؟"

وہ بھی مطمئن ہو کر قریب آ گیا اور تھرماس کے پیالے میں پانی نکالنے لگا۔ ایمان علی نے اس کے ہاتھ سے پانی لیتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"امام دین۔ میں لاہور سے آ رہا ہوں اور اب جمال والا میں اپنے بھائی سے اپنے حصے کی جائیداد حاصل کرنے جا رہا ہوں۔ تمہارا نام کیا ہے؟"

"ایمان علی، میں ایسی جگہ کی تلاش میں سفر کر رہا ہوں جہاں ایمان کو سمجھنے والے مل جائیں۔ میں حافظ قرآن ہوں، کہیں عزت کی روٹی ملے گی تو میں لوگوں کو کلام پاک کی تعلیم دوں گا"۔ یہ کہہ کر وہ پانی پینے لگا۔ سکینہ نے خود کو چادر میں چھپاتے ہوئے آہستگی سے کہا۔

"مجھے بھی پیاس لگ رہی ہے"۔ اسی وقت ہوا کا ایک شریر جھونکا آیا اور اس کی چادر کو سر سے اڑا کر شانوں تک پہنچا دیا۔ امام دین کی نظریں اس پردے والی کے چہرے پر پہنچ کر جم گئیں۔ ایمان علی کو پانی پیتے پیتے ٹھکا لگا۔ اس نے گھور کر سکینہ کو دیکھا۔ اس نے جلدی سے چادر کو سر پر لا کر گھونگھٹ کی طرح چہرے پر کھینچ لیا لیکن اتنی سی دیر میں امام دین کی نگاہوں کے سامنے بجلی سی کوند گئی تھی۔ ایک لمحے کا نظارہ ہزار جلوؤں پر بھاری ہوتا ہے اور سات پردوں میں چھپنے کے باوجود چشم تصور کو پکارتا رہتا ہے۔ ایمان علی مطمئن ہو گیا کہ اس نے اپنی جائیداد کو اچھی طرح چادر میں چھپا دیا ہے۔ اس نے تھرماس کے پیالے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"تھوڑا سا اور دو، تمہارے لئے پانی کم تو نہیں ہو گا؟"

"نہیں مجھے آگے جا کر اور پانی مل جائے گا"۔

اس نے دوسری بار پیالے کو بھر دیا۔ ایمان علی نے وہ پیالہ سکینہ کی طرف بڑھا دیا۔ سکینہ پیالے کو لے کر دوسری طرف گھوم گئی اور گھونگھٹ کے اندر برف کی ٹھنڈک کو جلتے ہوئے سینے میں اتارنے لگی۔ امام دین نے کہا۔

"تم میرے ساتھ جمال والا چلو، وہاں میں تمہیں روزی روٹی سے لگا دوں گا۔ تم وہاں پنڈ کے لوگوں کو دینی تعلیم دیا کرنا"۔

"تمہاری بڑی مہربانی ہے۔ اللہ تعالیٰ ایک بندے کے لئے دوسرے بندے کے ذریعے رزق کا سامان کرتا ہے۔ تم آگے بڑھو، میں وہاں ضرور آؤں گا"۔

سکینہ نے ہاتھ بڑھا کر خالی پیالہ واپس کر دیا۔ امام دین نے اس کے حنائی ہاتھ کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"اب ہماری منزل ایک ہو گئی ہے تو پھر ہم آگے پیچھے کیوں چلیں؟ ساتھ چلیں گے"۔

ایمان علی نے اپنی دلہن کو دیکھا پھر ہچکچاتے ہوئے بولا "میرے ساتھ میری گھر والی ہے اور یہ بہت تھک گئی ہے۔ ابھی ہم یہاں ستائیں

گے، تم اپنا راستہ کھوٹا نہ کرو آگے بڑھ جاؤ ہم تمہارے پیچھے وہاں پہنچ جائیں گے"۔

امام دین نے تھرماس بند کرتے ہوئے کہا۔

سفر میں ایک سے دو ہوں تو راستے میں کسی کا خوف نہیں ہوتا۔ راستہ بھی آسانی سے کٹ جاتا ہے ویسے تمہاری مرضی"۔

یہ کہہ کر اس نے اپنی اٹیچی اٹھائی اور وہاں سے آگے بڑھنے لگا۔ ایمان علی نے ہاتھ کے اشارے سے سکینہ کو سمجھایا کہ وہ پتھر پر بیٹھ کر ذرا آرام کرے۔ وہ حکم کی بندی بیٹھ گئی اور گھونگھٹ کے پیچھے سے جانے والے قدموں کی چاپ سنتی رہی۔ جانے والا تھوڑی دور جا کر رک گیا پھر پلٹ کر کفن میں لپٹی ہوئی عورت کو دیکھا۔ ایک سرد آہ بھری پھر واپس اپنی راہ پر چلتے ہوئے اونچی آواز میں گانے لگا۔

"تو جنگل کا پھول ہے تجھے کھلتے ہوئے کس نے دیکھا ہے؟ تو رنگ ہے، خوشبو ہے، جنگل کے جانور تیری خوشبو پہچانے بغیر، تجھے دیکھے بغیر، سر جھکا کر اپنے چارے کے لئے گھاس کو سونگھتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ اے جنگل کے پھول میرے پاس حسن نظر ہے، میرے سینے میں ایک عاشق کا دل ہے اور میرے منہ میں ایک شاعر کی زبان ہے، میں تیرے حسن کو شعروں کے ترنم سے سنوارتا ہوں۔ مگر حسن و شباب کے خزانے پر ایک سانپ کنڈلی مارے بیٹھا ہے۔ میں تجھے دیکھ سکتا ہوں، تیری تمنا کر سکتا ہوں مگر تجھے چھو نہیں سکتا"۔

ایمان علی کو ایسے لگا جیسے وہ اسے گالیاں دیتا ہوا جا رہا ہے۔ اس نے سکینہ کو دیکھتے ہوئے کہا "شاعر حسن کو بے نقاب کرتے ہیں اور الفاظ کی بازی گری سے پڑھنے اور سننے والوں کے جذبات بھڑکاتے ہیں۔ ان شاعروں کی گردن اڑا دینا چاہیے"۔

وہ اپنے طور پر درست کہہ رہا تھا مگر حسن اپنی مکمل شخصیت کو پہچاننے کے لئے شاعر کی زبان کا محتاج ہوتا ہے۔ سکینہ کو وہ گیت بہت اچھا لگا تھا مگر وہ گیت اب سنائی نہیں دے رہا تھا۔ دور جاتے جاتے فاصلے کی کھڈ میں گر کر زخمی ہو گیا تھا۔

بہت دیر بعد جب گھونگھٹ کی کال کوٹھری میں اس کا دم گھٹنے لگا تو وہ گھبرا کر بولی۔

"مجھے گرمی لگ رہی ہے۔ ایسا لگ رہا ہے جیسے اتنی بڑی دنیا میں، میں اکیلی بیٹھی ہوں تو بھی نظر نہیں آ رہا ہے"۔

یہ کہہ کر اس نے سر پر سے چادر ہٹا دی۔ ایمان علی نے اعتراض نہیں کیا کیونکہ اسے دیکھنے والا چلا گیا تھا اور اب اسے دیکھنے کا حق صرف ایک مجازی خدا کو تھا۔ اگر مرد کے بس میں ہوتا تو دنیا کی ہر خوبصورت چیز کو وہ صرف اپنی جاگیر بنا لیتا۔ ایمان علی جاگیرداری کے خلاف تھا۔ اسے زندگی میں جو کچھ ملا اس میں دوسروں کو برابر شریک بنایا۔ سب کے ساتھ مل کر دینی تعلیم حاصل کی۔ سب کے ساتھ مل کر عبادت کی حتیٰ کہ روٹی جیسی چیز جس کے لئے انسان کتوں کی طرح لڑتا ہے، اس روٹی میں بھی وہ دوسروں کو شریک کرتا رہا۔ اگر اس کے پاس بہت سی زمینیں ہوتیں تو وہ انہیں دوسروں میں تقسیم کر دیتا۔ دولت ہوتی تو دوسروں کی ضرورت سے بھی زیادہ گھر گھر پہنچا دیتا مگر یہ کم بخت عورت ایسی چیز ہوتی ہے کہ تقسیم نہیں ہوتی۔ جب تک اسے اپنی جاگیر نہ بناؤ اس وقت تک اپنی نسل، اپنے نام سے نہیں پکاری جاتی۔ اگر اس طرح دیکھا جائے تو مرد کبھی عورت سے محبت نہیں کرتا۔ صرف اپنے نام کی فصل اگانے والی زمین سے پیار کرتا ہے۔ یہ محض شاعر ہے جو عورت کو نت نئے روپ میں پیش کرتا ہے اور اس کے لئے دل کو دھڑکنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ سکینہ نے پتھر پر سے اٹھتے ہوئے کہا۔

''تو بہت زیادہ تھکا ہوا ہے یہاں بیٹھ جا''۔

ایمان علی نے آگے جانے والے راستے کی طرف دیکھا۔ اس راستے کے افق میں امام دین غروب ہو گیا تھا مگر ایک پریشانی طلوع ہو گئی تھی۔ وہ اس کی بیوی کے متعلق بڑی چاہت سے ایک گیت گاتا ہوا گیا تھا۔ اس نے پیچھے کی طرف مڑ کر دیکھا وہاں چوہدری برکت علی اس کی بیوی کو چاہنے کے بعد چھوڑ چکا تھا۔ اسے پیچھے بھی پریشانیاں ملی تھیں اور آگے بھی پریشانیاں مل رہی تھیں۔ وہ چلتے چلتے نہیں تھکا تھا، پریشانیوں نے اسے تھکا کر پتھر پر بٹھا دیا تھا۔ بیٹھنے کے بعد اس نے کہا۔

''امام دین کو ذرا اور دور نکل جانے دو، یہ آج کل کے نوجوان اس قابل نہیں ہوتے کہ ان کے ساتھ شریف عورتیں سفر کر سکیں''۔

سکینہ نے حیرانی سے پوچھا ''اس بے چارے نے ہمارا کیا بگاڑا ہے، اس نے تو ہمیں پانی پلایا تھا پھر تجھے روزی روٹی سے لگانے کی بات کر رہا تھا۔ کیا تو سمجھتا ہے کہ وہ ہمارے ساتھ مخلص نہیں تھا''۔

''یہ بات بہت دیر سے سمجھ میں آتی ہے کہ کسی خلوص کے پیچھے کیا ہوتا ہے؟ اس کی اٹیچی میں دو ہزار روپے تھے۔ میں نے اس کی دولت کی طرف نہیں دیکھا مگر وہ میری دولت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ حالات نے مجھے وقت سے پہلے محتاط ہونا سکھا دیا ہے''۔

''اس کا مطلب یہ ہے کہ تو جمال والا نہیں جائے گا''۔

''مجھے اپنی چیز کی حفاظت آپ کرنا ہے۔ میں کہیں بھی جاؤں، مجھے تجھ پر کڑی نظر رکھنی پڑے گی لہذا جمال والا جانے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ہم وہاں ضرور جائیں گے''۔

سکینہ خوش ہو گئی مگر اس نے خوشی کا اظہار نہیں کیا۔ مبادا ایمان علی شبے میں مبتلا ہو جائے۔ اس کی خوشی محض اس لیے تھے کہ آگے بڑھتے ہی ایک ٹھکانہ ملنے والا ہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اس کے ساتھ آگے بڑھنے لگا۔ آگے دونوں کے درمیان وہی جانی پہچانی خاموشی تھی مگر سکینہ کے احساسات اک ذرا سا بدل گئے تھے۔ اگرچہ اس کی وفا محض ایمان علی کے لئے تھی مگر اس کی سوچ اس کے گیت کی طرف بھٹک رہی تھی جو زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑاتا ہوا کہیں گر پڑا تھا۔ اگر کسی گیت سے پیار ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ گیت والے سے بھی پیار ہو جاتا ہے۔ گیت تو ایک ٹھنڈے پانی کی پٹی ہے جو حرارت سے تپتی ہوئی عورت کی پیشانی پر رکھی جاتی ہے۔ اس سے بخار ختم نہیں ہوتا ذرا سا اتر جاتا ہے۔ وہ جانے والا جو تعریف کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا خیرات کے طور پر دے گیا تھا یہی خیرات وہ اپنے ایمان علی سے چاہتی تھی۔ سہاگ رات میں وہ اسے بہت کچھ نہیں دے سکا تھا مگر تعریف کے دو بول تو دے سکتا تھا۔ اگر اسے پانے کے بعد صرف خدا کا شکر ادا کر لیتا تو اسی بہانے ایک عورت کو اپنی اہمیت کا احساس ہو جاتا۔ اس سے تو اچھا پھٹا ہوا ڈھول ہوتا ہے کہ پھٹی آواز میں ہی بجتا ہے لیکن وہ تو کہیں سے بھی نہیں بج رہا تھا۔

ایسی نکھری ہوئی چاندنی میں دلوں کے اندر کتنا اندھیرا اور سناٹا تھا۔ نہ رنگ، نہ روپ، زندگی کے تمام سرکھو گئے تھے۔ سر کے بغیر یہ ساری دنیا گونگی ہو جاتی ہے۔ اسی لیے تو قبروں پر نوحہ خوانی ہوتی ہے مگر وہ مردہ اپنی قبر میں خاموش پڑا تھا۔ ایک وفا شعار بیوی کے اندر جب سہانے سپنوں کا شیش محل چکنا چور ہوتا ہے تو اوپر سے اس کی وفا نہیں جاتی۔ اندر سے ٹوٹی ہوئی کرچیوں کی طرح اس کی سوچیں بکھر جاتی ہیں۔ کم از کم ہماری مشرقی

عورتوں کا یہی آدرش ہے کہ اندر سے ریزہ ریزہ ہو جائیں اور اوپر سے مکمل مجسم اور پتھر کی طرح مستحکم رہیں۔

آگے جا کر پھر انہیں رکنا پڑا کیونکہ فجر کی نماز کا وقت ہو چلا تھا۔ وہ سکینہ کو لے کر کچی سڑک کو چھوڑتا ہوا کھیتوں میں آ گیا پھر اپنے کاندھے پر پڑا بڑا سا رومال ایک جگہ بچھا کر نماز پڑھنے لگا۔ وہ کئی بار عشا کے وضو سے فجر کی نماز پڑھ چکا تھا۔ اسی وضو سے تہجد کی نماز بھی پڑھی تھی اور تسبیح خوانی کرتا رہا تھا۔ کسی ایسے خیال کو دماغ میں جگہ نہ دیتا تھا جس سے وضو مجروح ہوتا ہے۔ اس وقت بھی نماز پڑھنے کے دوران زبان آیتوں کا ورد کر رہی تھی مگر دماغ سوچ رہا تھا۔

وضو تو سلامت ہے۔ ایک دلہن کی آمد نے مجھے بھٹکایا تو نہیں تھا۔ نہیں، میں نہیں بھٹکا تھا البتہ خیالات ابھی تک بھٹکتے آ رہے ہیں مگر اس سے کیا ہوتا ہے؟ شیطان تو اکثر خیالوں میں چھپ کر آتا ہے۔ ہاں اگر سوچنے والا بھی شیطان بن جائے تب وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ نہیں، میرا وضو سلامت ہے۔ ایسی ہی الجھی الجھی سوچوں کے دوران نماز ادا ہو گئی۔ وہ پھر سکینہ کے ساتھ اپنی راہ چل پڑا لیکن وہ اپنی عبادت سے مطمئن نہیں تھا۔ اندر سے بہت زیادہ پریشان تھا کہ اب یہ عورت اس کی عبادت میں بھی گھسی آ رہی ہے۔ ایسا کب تک ہوگا، اس طرح زندگی کیسے گزرے گی؟ یہ تو اسی طرح ساری عمر چلتی رہے گی۔

مگر سوچ سوچ کر اسے اپنی زندگی سے نہیں بھگا سکتا تھا۔ وہ کوئی شیطان یا شیطان کی خالہ نہیں تھی کہ لاحول پڑھنے سے بھاگ جاتی۔ باقاعدہ ایجاب وقبول کے بعد آئی تھی۔ واقعی یہ ایمان کی آزمائش تھی۔ اب اسے تاحیات ایک بہت ہی خوبصورت چاندنی کی طرح چمکتی ہوئی تلوار کی چھاؤں میں نماز پڑھتے رہنا تھا۔

جب وہ جمال والا پہنچے تو دن کا اجالا اچھی طرح پھیل چکا تھا۔ کسان کھیتوں میں ہل چلا رہے تھے۔ پنڈ کی عورتیں نہر کے کنارے کپڑے دھو رہی تھیں اور غسل کر رہی تھیں۔ ایک اجنبی مرد اور ایک عورت کو اس کے ساتھ دیکھ کر عورتیں باتیں کرتے کرتے یکلخت خاموش ہو گئیں اور ایک دوسرے کو سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں پوچھنے لگیں کہ اس اجنبی کے پیچھے چلنے والی عورت کون ہو سکتی ہے؟ اگرچہ عورتوں کو ایک عورت سے اتنی دلچسپی نہیں ہوتی جتنی کہ اس کے ساتھ والے مرد سے ہوتی ہے مگر وہ عورت چادر میں سر سے پاؤں تک چھپی ہو تو صرف اس لیے دیکھنے کا شوق پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ ہم عورتوں کے مقابلے میں کیسی ہے؟ کیسا سنگھار ہے؟ کیا پہناوا ہے؟ جیسی بھی ہو، رنگ روپ میں ہماری جیسی تو نہ ہوگی۔

ذرا دور جا کر ایمان علی نے ایک بوڑھے سے پوچھا کہ چوہدری محمد دین کی حویلی کہاں ہے؟ اس بوڑھے نے سوال کیا۔

''کیا تم چوہدری کے مہمان ہو؟''

ایمان علی نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

''ہم مہمان نہیں، مسافر ہیں اور یہاں اپنا ٹھکانا بنانے آئے ہیں''۔

بوڑھا انہیں ساتھ لے کر حویلی کی طرف جانے لگا۔ بستی کے اندر سے گزرنے کے بعد آخری سرے پر چوہدری کی حویلی تھی۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ چوہدری حویلی کے پیچھے موجود ہے۔ بوڑھا انہیں حویلی کے پیچھے لے گیا۔ چوہدری دین محمد قد میں چھوٹا مگر ڈیل ڈول میں بھینس کی طرح نظر

آرہا تھا اور بھینس کی طرح کالا بھی تھا۔ اس کے چہرے پر بڑی بڑی مونچھیں اسے بہت خطرناک بنا رہی تھیں۔ وہ دونوں ہاتھ کمر پر رکھے اپنے آدمیوں سے کام کروا رہا تھا۔ دو آدمی ایک جگہ لکڑی کے چار کھمبوں کو گاڑنے کے بعد اس پر چھپر ڈال رہے تھے اور چھپر کے نیچے جو زمین تھی اسے ہموار کرنے کے بعد ایک آدمی گیلی مٹی سے اسے لیپ رہا تھا۔

ایمان علی کو حویلی کی دیوار کے سائے میں چھوڑ کر چوہدری کی طرف بڑھنے لگا۔ چوہدری اسے آتے ہوئے غور سے دیکھ رہا تھا قریب آنے پر اس نے پوچھا۔

''تم کون ہو؟'' یہ پوچھنے کے دوران اس کی گچھے دار مونچھیں یوں ہلنے لگیں جیسے وہ ہونٹوں کی بجائے مونچھوں سے پوچھ رہا ہو۔

ایمان علی نے جواب دیا ''میں حافظ قرآن ہوں، شاہ پور کی مسجد میں پیش امام تھا۔ اس سے پہلے بھی کتنی ہی مسجدوں میں نماز پڑھا چکا ہوں۔ یہاں اپنا ٹھکانا بنانے آیا ہوں اگر مجھے نماز پڑھانے اور پنڈ کو بچوں کو دینی تعلیم دینے کا موقع دیا جائے تو یہ آپ کے لئے ثواب کا کام ہوگا اور اس طرح میرا ٹھکانہ ہو جائے گا''۔

چوہدری دین محمد نے دور حویلی کے سائے میں کھڑی ہوئی سکینہ کی جانب دیکھا۔ وہ نظر نہیں آرہی تھی چادر میں لپٹی ہوئی تھی مگر یہ سمجھ میں آجاتا تھا کہ وہ کوئی عورت ہی ہے۔ اس نے ایمان علی سے پوچھا۔

''وہ کون ہے؟''

''وہ میری بیوی ہے۔ اگر میں تنہا ہوتا تو نگری نگری بھٹکنے کی اتنی فکر نہیں ہوتی۔ میں اس عورت کو ساتھ لے کر دور دور تک نہیں بھٹک سکتا اگر آپ مہربانی فرمائیں تو.....''

چوہدری نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا ''یہاں آئے دن مسافر آتے جاتے رہتے ہیں۔ میں کتنوں پر مہربانیاں کر سکتا ہوں۔ یہاں کی مسجد میں ایک مولوی صاحب نماز پڑھاتے ہیں اور پنڈ کے بچوں کو تعلیم بھی دیتے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں یہاں تمہارے مستقل ٹھکانے کا بندوبست نہ کر سکوں گا۔ تم مسافر ہو، تمہارے ساتھ ایک عورت ہے اس لئے آج میرے مہمان خانے میں رہ جاؤ۔ یہاں تمہیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی، کل جہاں چاہے چلے جانا''۔

ایمان علی نے مایوس ہو کر دور کھڑی ہوئی سکینہ کی طرف دیکھا۔ وہ اس بوجھ کو اٹھائے کہاں کہاں گھوم سکتا تھا۔ امام دین نے تو کہا تھا کہ اس پنڈ میں اسے ٹھکانہ مل جائے گا۔ اس نے چوہدری کو امام دین کا حوالہ دیا ''چوہدری صاحب ابھی جب ہم یہاں آرہے تھے تو راستے میں آپ کے چھوٹے بھائی امام دین سے ملاقات ہوئی تھی''۔

امام دین کا نام سنتے ہی چوہدری کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ بے اختیار ایک قدم پیچھے چلا گیا اور ایمان علی کو ایسی وحشت زدہ نظروں سے دیکھنے لگا جیسے ایمان علی نے امام دین کا نام لے کر اسے پتھر مارا ہو۔ ایمان علی اسے بتا رہا تھا کہ کس طرح اس کے بھائی سے ملاقات ہوئی تھی اور اس نے یقین دلایا تھا کہ اس پنڈ میں وہ اسے روزی روٹی سے لگا دے گا۔ اس کی باتوں کے دوران چوہدری کسی حد تک سنبھل گیا۔ اس نے حیرانی سے

پوچھا ''امام دین تمہیں کہاں ملا تھا؟''

ایمان علی نے جواب دیا۔

''وہ یہاں سے پانچ میل دور اسی کچے راستے پر ملا تھا جو شاہ پور سے یہاں تک آتا ہے''۔

چوہدری نے اپنی مٹھیاں بھینچتے ہوئے کہا۔

''وہ راستہ یہاں آتا ہے مگر امام دین یہاں کیوں نہیں آیا؟ تم کیسی باتیں کر رہے ہو؟ یہ کتنی دیر کی بات ہے؟''

''وہ تقریباً تین گھنٹے پہلے مجھ سے ملا تھا۔ اسے تو ہم سے بہت پہلے یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا''۔

چوہدری نے حیرانی اور پریشانی سے کہا۔

''سمجھ میں نہیں آتا کہ میں تمہاری باتوں پر کس طرح یقین کر لوں۔ وہ تم سے تین گھنٹے پہلے چلا تھا مگر ابھی تک نہیں پہنچا۔ تین گھنٹے میں تو ایک بھینس بھی ٹہلتی ہوئی یہاں پہنچ جاتی پھر وہ اب تک کیوں نہیں پہنچا''۔

ایمان علی نے گڑبڑا کر کہا۔

''میں کیا جانوں؟ امام دین کو تو یہاں موجود ہونا چاہیے تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ وہ اس پنڈ میں آپ سے اپنی جائیداد کا حصہ مانگنے آ رہا ہے اور اسی کے ساتھ ہی اس نے مجھے یقین دلایا تھا کہ وہ یہاں میرے بھی رہنے کا بندوبست کر دے گا''۔

چوہدری اس کی باتیں سن رہا تھا اور اسے گہری چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھتا جا رہا تھا۔ اس نے ایک بار پلٹ کر کام کرنے والے آدمیوں کی جانب دیکھا جو چھت ڈالنے اور چھت کے نیچے والی زمین کو لیپنے میں مصروف تھے پھر اس نے پوچھا۔

''کیا میرے بھائی کے ساتھ کچھ سامان بھی تھا؟''

''جی ہاں۔ اس کے پاس ایک تھرماس اور ایک اٹیچی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اس کی اٹیچی میں دو ہزار روپے ہیں''۔

چوہدری نے غرا کر کہا۔

''ہوں۔ اس کے اٹیچی میں دو ہزار روپے تھے اور وہ تم سے ویران راستے میں ملا تھا۔ پھر وہ غائب ہو گیا اور وہ دو ہزار روپے بھی غائب ہو گئے۔ اب یہ تم ہی سچ سچ بتا سکتے ہو کہ وہ دو ہزار روپے کہاں گئے؟ اور میرا بھائی کہاں گیا؟''

ایمان علی نے گھبرا کر کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

''مم..... میں کیا کہہ سکتا ہوں؟ آپ کے چھوٹے بھائی نے تو کہا تھا کہ میں اس سے دو ہزار روپے لے لوں اور اسے کوئی نقصان نہ پہنچاؤں۔ میں نے اسے یقین دلایا تھا کہ میں کوئی لٹیرا نہیں ہوں ایک بے ضرر انسان ہوں۔ جو کچھ میں نے کہا اس پر عمل کیا اور اسے آگے جانے کا راستہ دے دیا''۔

چوہدری نے سخت لہجے میں پوچھا۔

''تمہاری بات پر کون یقین کرے گا؟''

''آپ کو یقین کرنا چاہئے۔ میں لالچی انسان نہیں ہوں جو کچھ مانگنا ہوتا ہے، اپنے خدا سے مانگتا ہوں۔ اپنی محنت کے صلے میں دنیا والوں سے صرف تین وقت کی روٹیاں طلب کرتا ہوں۔ کوئی میری ضرورت سے ایک روٹی بھی زیادہ دے تو میں نہیں لیتا پھر دو ہزار روپے جیسی بڑی رقم کیسے لے سکتا ہوں''۔

''ہر شخص اپنی صفائی پیش کرتے وقت ایماندار بن جاتا ہے۔ ویسے تم اپنے چہرے سے اور آنکھوں کی معصومیت سے شریف آدمی نظر آتے ہو۔ تم یہاں ٹھہرو میں ابھی آتا ہوں''۔

یہ کہہ کر وہ اپنے آدمیوں کی طرف چلا گیا۔ وہ لوگ ابھی تک چھپر ڈالنے کے کام میں مصروف تھے۔ اس کے نیچے کی زمین اچھی طرح لیپ دی گئی تھی۔ چوہدری نے اپنے تینوں آدمیوں کو قریب بلایا۔ جب وہ آ گئے تو اس نے پلٹ کر ایمان علی کی طرف یوں دیکھا جیسے اپنے اور اس کے درمیان فاصلے کو سمجھ رہا ہو۔ اتنا فاصلہ تھا کہ ایمان علی ان کی باتیں نہیں سن سکتا تھا۔ پھر وہ بھی وہ احتیاطاً اپنے آدمیوں کے ساتھ ذرا دور چلا گیا۔ وہاں جا کر اس نے ان سے کچھ کہا۔ اس کی بات سنتے ہی وہ چونک کر ایمان علی کی طرف دیکھنے لگے۔ اتنے طویل فاصلے کے باوجود ایمان علی نے ان کے چہروں پر بہت زیادہ پریشانی اور گھبراہٹ دیکھی پھر وہ چاروں ایک دوسرے کے قریب آ کر اس انداز میں باتیں کرنے لگے جیسے سرگوشیاں کر رہے ہوں۔ باتوں کے دوران ان کے ہاتھ ادھر ادھر ہل رہے تھے۔ ناچتے اور لہراتے ہوئے ہاتھوں سے اس حد تک اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ایک دوسرے کی بات کاٹ رہے ہیں اور چوہدری کے سامنے اپنی تجویز پیش کر رہے ہیں۔ اگر انسانوں کی دنیا میں گفتگو کے لئے زبان نہ ہوتی تو اشاروں کی زبان سے بھی غریب اور امیر طبقے کا فرق واضح ہو جاتا ہے۔ وہ تینوں ملازم ہاتھ ہلا کر باتیں کر رہے تھے مگر جب ان کے آقا نے زمین پر زور سے پاؤں پٹخا تو پاؤں کی ایک ہی ٹھوکر سے دوسرے طبقے کے ہاتھ کٹی ہوئی شاخوں کی طرح جھول گئے۔ پہلے ان کے سر انکار میں دائیں بائیں ہل رہے تھے، چوہدری کے پاؤں پٹختے ہی اوپر سے نیچے ہلنے لگے۔

جب وہ لوگ ایک فیصلے پر متفق ہو گئے تو چوہدری نے ایمان علی کے قریب آ کر کہا ''میرے ملازموں کا بھی یہی خیال ہے کہ تم شریف آدمی ہو، میرے ساتھ حویلی میں چلو اور وہاں روٹی کھا کر تھوڑی دیر آرام کر لو۔ میرا خیال ہے کہ تم رات بھر کے جاگے ہوئے ہو وہاں تم آرام سے سو سکو گے''۔

ایمان علی سکینہ کو ساتھ لے کر چوہدری کے پیچھے چلتا ہوا حویلی کے سامنے بڑے دروازے پر آ کر رک گیا۔ چوہدری انہیں باہر چھوڑ کر اندر چلا گیا۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد ان دونوں کو اندر بلایا گیا اور حویلی کا سامنے والا کمرہ انہیں آرام کرنے کے لئے دے دیا گیا۔ کھانے کے لئے روٹیاں بھی آ گئیں۔ سکینہ کو کھانے کے لئے زنان خانے میں بھیج دیا گیا۔ ایمان علی کھانا کھاتا رہا اور تشویش کا اظہار کرتا رہا کہ امام دین اپنے پنڈ کے قریب پہنچ کر کہاں غائب ہو گیا؟ ایمان علی نے اس سے پوچھا۔

''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آس پاس کے پنڈ میں آپ کے رشتے دار ہوں یا امام دین کا کوئی دوست ہو جس سے وہ ملنے چلا گیا ہو؟

ایسا کوئی نہیں ہے جس کے لئے وہ راستہ بدل دے۔تم کہتے ہو کہ وہ مجھ سے جائیداد کا حصہ مانگنے آرہا تھا۔دوسرے یہ باتیں سنیں گے تو یہی شبہ کریں گے کہ میں نے اس کی جائیداد ہضم کرنے کے لئے اسے راستے سے ہٹا دیا ہے۔زر،زن اور زمین ایسی چیزیں ہیں جس کے لئے بیٹے باپ کو اور بھائی بھائی کو قتل کر دیتے ہیں۔تمہاری زبان سے جائیداد کے بٹوارے کی بات سن کر میرا سکون برباد ہو گیا ہے۔تم نہیں جانتے کہ میرے رشتے داروں میں کتنے دشمن ہیں۔وہ سب مجھے ایک ناکردہ جرم کا مجرم ثابت کرنے کی کوشش کریں گے''۔

''ہاں دشمن تو ہر وقت شیطان کی طرح پیچھے لگے رہتے ہیں۔مگر میں نے تو وہی بات کہی ہے جو امام دین سے سنی تھی''۔

''کیا ضروری ہے کہ تم آئندہ بھی یہ بات اپنی زبان پر لاؤ۔کیا تم یہ نہیں سمجھ سکتے کہ اس طرح مجھ پر کتنی مصیبتیں نازل ہوں گی''۔

''اگر آپ کا ایمان کامل ہوگا تو کوئی آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔جب آپ کا بھائی یہاں پہنچا ہی نہیں ہے تو کوئی یہ کیسے کہہ سکتا ہے کہ آپ نے اسے راستے سے ہٹا دیا ہے''۔

چوہدری نے بڑی پریشانی سے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے کہا''یہ درست ہے کہ وہ یہاں نہیں پہنچا ہے مگر تم یہ کسی سے کہو گے کہ وہ یہاں سے پانچ میل دور تم سے ملا تھا اور تم سے تین گھنٹے پہلے ادھر آرہا تھا تو کیا ایسی صورت میں میرے دشمن مجھ پر شبہ نہیں کریں گے جبکہ آس پاس کے پنڈ میں اس کا کوئی دوست ہے اور نہ ہی ہمارا کوئی رشتہ دار ہے''۔

''تو پھر وہ کہاں چلا جائے گا؟''ایمان علی نے حیرانی سے پوچھا۔

''میں بھی حیران ہوں کہ وہ کہاں چلا گیا؟مگر ہماری حیرانی سے دوسرے تو مطمئن نہیں ہو سکیں گے۔دوسروں کی زبان بند رکھنے کے لئے کیا تم اپنی زبان بند نہیں رکھ سکتے؟''

''میرے زبان بند رکھنے سے کیا ہوگا؟''

''میرا بھلا ہوگا۔میں بہت سی پریشانیوں سے محفوظ رہوں گا۔لوگ یہی سمجھیں گے کہ امام دین لاہور میں ہے۔اگر وہ وہاں بھی نہ پایا گیا تو کوئی یہ نہ سمجھے گا کہ وہ پنڈ کی طرف آیا تھا اور یہاں سے پانچ میل دور تم نے اسے دیکھا تھا۔جب کوئی اس بات کا چشم دید گواہ نہیں ہوگا یعنی وہ چشم دید گواہ اپنی زبان بند رکھے گا تو میری بہت سی مصیبتیں ٹل جائیں گی''۔

ایمان علی نے روٹی کھانے کے بعد ہاتھ پونچھتے ہوئے کہا''مجھے امام دین کے ذکر سے کیا لینا ہے۔یوں بھی میں غیر ضروری باتیں نہیں کرتا۔میں کسی کے سامنے اس کی بات نہیں کروں گا لیکن اس سلسلے میں اگر پوچھ گچھ ہوئی تو میں وہی کہوں گا جو سچ ہے اور سچ یہ ہے کہ امام دین ادھر آرہا تھا۔جب آپ نے کوئی جرم نہیں کیا ہے تو آپ کو دنیا والوں سے ڈرنا نہیں چاہئے۔صرف خدا سے ڈرنا چاہیے''۔

چوہدری نے ایک دم اسے گھور کر دیکھا لیکن جلد ہی سنبھل گیا کہ اس وقت غصہ دکھانے سے کام نہیں چلے گا۔اس کے سامنے جو مولوی بیٹھا ہے وہ بے ضرر ہے۔وہ اس سے ضد نہیں کر رہا ہے کہ اگر کوئی ایسا موقع آیا تو وہ سچ بولے گا اگر اس مولوی کا ایمان اس کے لئے مصیبتیں پیدا کرنے والا ہے لہذا اس کے ایمان کو کمزور بنانا بے حد ضروری ہو گیا ہے۔یہ سوچ کر اس نے کہا۔

''مولوی صاحب! ہمارے یہاں مسجد میں پہلے ہی ایک مولوی صاحب ہیں جو بچوں کو پڑھاتے ہیں۔ اس کے باوجود میں تمہارے یہاں رہنے کے لئے تمہاری روزی کا بندوبست کروں گا۔ حویلی کے پیچھے جو چھپر ڈالا جا رہا ہے، میں وہاں بھینسیں باندھنا چاہتا ہوں لیکن اب اس جگہ تمہارے لئے مدرسہ کھولوں گا۔ تم وہاں چھوٹے بچوں کو پڑھایا کرنا اور بڑی عمر کے لوگوں کو دین ایمان کی باتیں سکھایا کرنا''۔

ایمان علی نے خوش ہو کر کہا۔

''امام دین آپ کا چھوٹا بھائی ہے۔ وہ آپ کی رحم دلی کو سمجھتا ہے اسی لیے اس نے یقین دلایا تھا کہ میرے لیے یہاں روٹی کا بندوبست ہو جائے گا''۔

''مولوی صاحب! تم پھر امام دین کی بات کر رہے ہو حالانکہ تم نے ابھی کہا تھا کہ اس کا ذکر کبھی نہیں کرو گے''۔

''میں نے جان بوجھ کر اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ آپ سمجھنے کی کوشش کریں، اگر وہ رزق حلاق کا ذکر نہ کرتا تو میں ادھر کا رخ بھی نہ کرتا۔ اس نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے کہ آپ جیسے رحم دل انسان کے پاس مجھے پہنچا دیا ہے۔ دراصل میں اس کا احسان مند ہو کر اس کا ذکر کر رہا ہوں اور یہ نا مناسب نہیں ہے''۔

چوہدری دین محمد اسے بڑی بے بسی سے دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس مولوی کی زبان کو کیسے لگام دے۔ وہ چند لمحوں تک کچھ سوچتا رہا پھر کھانے کی پلیٹیں اٹھا کر وہاں سے جاتے ہوئے بولا ''میں تمہارے لئے دوسرا کمرہ خالی کروا رہا ہوں، وہاں جا کر آرام سے سو جانا''۔

یہ کہہ کر وہ کمرے سے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد سکینہ آ گئی۔ ایمان علی سکینہ کو وہ ساری باتیں بتانے لگا جو چوہدری اس سے کہہ رہا تھا۔ سکینہ نے کہا ''مجھے تو دال میں کچھ کالا نظر آ رہا ہے پتا نہیں چوہدری تجھ سے یہ کیوں کہہ رہا ہے کہ اس کا نام زبان پر نہ لائے''۔

''بیچارے چوہدری کے بہت سے دشمن ہیں۔ وہ اس بات سے ڈرتا ہے کہ لوگوں کو جب پتا چلے گا کہ امام دین ادھر آیا تھا تو سارے دشمن خواہ مخواہ اسے الزام دیں گے کہ وہ جائیداد کا بٹوارہ نہیں چاہتا تھا اس لئے اس نے راستے سے اپنے بھائی کو ہٹا دیا ہے۔ یہ دنیا والے کسی بھی شریف آدمی کو چین سے نہیں رہنے دیتے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہو رہا ہے۔ اس لیے میں چوہدری کی پریشانی کو سمجھتا ہوں۔ اس بیچارے کو بھی خواہ مخواہ اس کے دشمن پریشان کریں گے''۔

سکینہ اس کا منہ تکنے لگی۔ وہ اپنی شریک حیات کو بتا رہا تھا کہ شاہ پور آنے سے پہلے کہاں کہاں ٹھوکریں کھاتا رہا ہے اور لوگ کس طرح اس کی ایمانداری کو حماقت سمجھ کر اسے بے وقوف بناتے رہے تھے۔ سکینہ یہ سب کچھ سن رہی تھی اور اسے ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھی جیسے اس کے سامنے ایک معصوم بچہ بیٹھا ہوا ہو۔ وہ خوب سمجھتی تھی کہ یہ دنیا والے روپے پیسے کی خاطر کس طرح خون کے رشتوں کو کاٹ کر پھینک دیتے ہیں۔ اسے شبہ تھا کہ چوہدری دین محمد نے اپنے بھائی کو صرف جائیداد کی خاطر ہمیشہ کے لئے اپنے راستے سے ہٹا دیا ہے لیکن اس نے ایمان علی کے سامنے اپنے شبے کا اظہار نہیں کیا۔ وہ سوچ رہی تھی کہ اگر ایمان علی کو اس بات کا یقین ہو جائے کہ دین محمد اپنے بے گناہ بھائی کا قاتل ہے تو پھر وہ اس حویلی کی روٹی نہیں کھائے گا۔ یہاں سے بھی آگے بڑھ جائے گا اور پچھلی ساری رات چلتے رہنے کے بعد سکینہ میں اتنی سکت نہیں رہ گئی تھی کہ وہ آگے بڑھ سکتی۔ اور آگے

بڑھنے سے حاصل کیا ہوتا؟ کیا اسے آگے ایماندار لوگ مل جاتے؟ اور ایمان علی کو حلال کی روٹیاں نصیب ہو جاتیں۔ اسے یقین نہیں تھا اسی لیے وہ سوچ رہی تھی کہ اسے خاموش رہنا چاہیے اور ایمان علی کو اپنے طور پر ایمانداری سے سوچنے کے لئے چھوڑ دینا چاہیے۔ وہ چوہدری دین محمد کو بے چارہ سمجھ رہا تھا تو بے چارہ ہی سمجھتا رہے۔

تھوڑی دیر بعد انہیں دوسرے کمرے میں بلایا گیا۔ وہاں دو چارپائیوں پر بستر بچھے تھے۔ ایمان علی نے کمرے کا دروازہ بند کرنے کے بعد چارپائیوں کی طرف توجہ دی تو وہ دونوں ایک دوسرے سے لگی ہوئی تھیں۔ اس تصور سے ہی اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا کہ سکینہ اس سے لگی ہوئی ہے۔ اس نے فوراً ہی ایک چارپائی کو کھینچ کر دوسری سے الگ کیا اور اسے کمرے کے آخری سرے پر لے کر اس پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''تو رات بھر کی جاگی ہوئی ہے، تجھے نیند آ رہی ہے، جا ادھر منہ پھیر کر سو جا''۔

وہ اپنی چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''منہ پھیر کر سونے سے نیند نہیں آئے گی اگر تجھے آ سکتی ہے تو سو جا، میں تجھے دیکھتی رہوں گی۔ دیکھنا تو حرام نہیں ہے نا؟''

وہ بڑی بے بسی سے اپنی دلہن کا منہ دیکھنے لگا۔ سہاگ رات کی صبح ہو چکی تھی۔ نماز چھوٹ جائے تو قضا پڑھ لی جاتی ہے مگر وہ قضا کا مارا سہاگ رات کا چھوٹا ہوا فرض ادا نہیں کر سکتا تھا۔ اسے سر جھکائے سوچتے دیکھ کر سکینہ کو بہت ترس آیا۔ اس دلہن کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح اپنے مجازی خدا کو سمجھائے کہ کمرے کی چار دیواری کے اندر وہ اگر اپنے اصولوں سے ہٹ جائے گا تو کیا فرق پڑے گا۔ دراصل شدید بھوک کے بعد ہی انسان کے اصولوں میں ذرا سی لچک پیدا ہوتی ہے۔ اگر اس حد تک فاقہ ہو کہ وہ فاقہ ناقابل برداشت ہو جائے تو حرام چیزیں بھی کھانے کے لئے حلال ہو جاتی ہیں لہذا اس کے فاقے کو ناقابل برداشت بنانے کے لئے وہ چارپائی پر سیدھی لیٹ گئی۔ حیا مانع تھی، زبان سے کچھ نہیں بول سکتی تھی، خاموش اداؤں سے بہت کچھ سمجھا سکتی تھی۔ اداؤں سے للچانے کا فن اس پنڈ کی لڑکی نے کہیں سے سیکھا نہیں تھا، عمر اور حالات کے تقاضے عورت سے آپ ہی سب کچھ کرا لیتے ہیں۔ اس نے لیٹے ہی لیٹے بھرپور انداز میں انگڑائی لی کہ دوپٹہ ایک طرف ڈھلک گیا۔ وہ ایک دم سے لرز گیا اور بری طرح ہکلاتے ہوئے کہنے لگا۔

''یہ..... یہ..... کک..... کیا بے حیائی ہے، تجھے چادر اڑھ کر لیٹنا چاہئے''۔

وہ اس کی طرف کروٹ بدل کر بولی۔

''اپنے مرد کے سامنے بے حیائی کیا ہوتی ہے! میں بازار میں تو نہیں بیٹھی ہوں؟ چادر کس لئے اوڑھوں کیا تجھ سے پردہ واجب ہے؟''

ایمان علی کا ایک ہاتھ تکیے پر رکھا ہوا تھا اور وہ بے خیالی میں اسے رہ رہ کر مٹھی میں بھینچ رہا تھا۔ پھر وہ روتے ہوئے لہجے میں بولا ''تیری بہت سی باتوں کا میرے پاس جواب نہیں ہے۔ میں بہت مجبور ہوں سکینہ؟ میں جہاں جاتا ہوں لوگ میرے ایمان کو کمزور بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو وقتی طور پر پرائی ہے مگر ساری زندگی کے لئے اپنی ہے، کم از کم تو مجھے کمزور نہ بنا۔ مجھ پر رحم کر، مجھے میرے حال پر چھوڑ دے۔ یہ کہتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ سکینہ کے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر خود کو ندامت کی

گہری پستی میں گرتے محسوس کیا۔ وہ دوپٹے کو اپنے سینے پر درست کرتے ہوئے اس کے سامنے آئی اور فرش پر گھٹنے ٹیک کر کہنے لگی، اس کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔

''مجھے معاف کردے میں اتنی بری ہوں کہ اپنے ایمان کو بھی رلا دیا۔ میرے لئے اس سے زیادہ شرم کی بات کیا ہوگی تو سنبھلنا چاہتا ہے میں گرانا چاہتی ہوں۔ اب سمجھ میں آ گیا کہ تو گرنے والا نہیں ہے۔ ایمان کے سامنے تو مجھے منہ کے بل گرنا چاہیے اور میں گر چکی ہوں۔ اب میں اس طرح رہوں گی کہ تیرا دل اس طرح کبھی نہیں روئے گا۔ مجھے معاف کردے''۔

یہ کہہ کر وہ فرش پر سے اٹھی اور اپنے دوپٹے کے آنچل سے اس کے آنسو پونچھنے لگی۔ اب وہ کوئی ادا نہیں دکھا رہی تھی مگر ایک نوجوان عورت کا آنچل پہلی بار اس کی آنکھوں تک پہنچا تھا اس لئے وہ بھی ایک بہکانے والی ادا بن گئی تھی۔ بڑی مشکل تھی پھول اپنی پنکھڑیوں میں اپنی خوشبو کو چھپا کر نہیں رکھ سکتا تھا۔ پھول چھپ جائے گا مگر اس کی خوشبو آنکھوں کی شبنم تک ضرور پہنچے گی۔ وہ جلدی سے پیچھے ہٹ کر لیٹ گیا پھر دوسری طرف کروٹ بدل کر سر کے نیچے تکیہ رکھنے کی بجائے اسے کھینچ کر اپنے بازوؤں میں لے آیا۔ تکیہ کے سرکتے ہی بہت سارے کرنسی نوٹ بستر پر بکھر گئے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور بڑی حیرانی سے دس دس اور پچاس پچاس کے نوٹوں کو دیکھنے لگا۔ سکینہ نے بھی کبھی اتنے سارے روپے نہیں دیکھے تھے اس لیے اس کی سانس اوپر کی اوپر ہی رہ گئی۔ ایمان علی نے پریشان ہو کر کہا۔

''یہ چوہدری کے روپے ہیں۔ پچھلی رات شاید سوتے وقت اپنی بڑی رقم تکیہ کے نیچے رکھ دی ہوگی۔ مجھے فوراً ہی واپس کر دینا چاہیے''۔ وہ جلدی جلدی نوٹوں کو سمیٹ کر بستر سے اٹھ گیا اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ سکینہ اندر ہی اندر اسکی آواز سنتی رہی وہ چوہدری کو بلند آواز سے پکار رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد چوہدری کی آواز سنائی دی۔

حُسنہ اور حُسن آراء

حُسنہ اور حُسن آراء ادور حاضر کی مقبول ترین مصنفہ **عمیرہ احمد** کی 4 تحریروں کا مجموعہ ہے جس میں ایک کہانی حسنہ اور حُسن آراء پہلی بار آپ کے سامنے آرہی ہے۔ عمیرہ احمد کا TV کے لئے یہ پہلا منی سیریل بھی تھا اور یہ TV کی تاریخ کے مہنگے ترین منی سیریلز میں سے ایک تھا..... اپنی تھیم کے لحاظ سے یہ آپ کو بہت متنازعہ لگے گا۔ مگر انسانی فطرت اس سے زیادہ حیران کن اور متنازعہ ہے۔

حُسنہ اور حُسن آراء کتاب گھر پر دستیاب ہے جسے **ناول** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

''کیا بات ہے؟ کسی چیز کی ضرورت ہے کیا؟''

''جی نہیں'' ایمان علی نے کہا'' آپ یہ روپے اس کمرے میں بھول گئے ہیں۔ یہ لیجئے گن لیجئے''۔

چوہدری نے حیرانی کا اظہار کیا'' یہ میرے روپے تو نہیں ہیں''۔

''تو پھر آپ اپنے گھر کی عورتوں سے پوچھیں۔ شاید کسی نے رکھ دیے ہوں''۔

''میں اپنے گھر کی عورتوں کو کھانا اور کپڑا دیتا ہوں، نقدی کبھی نہیں دیتا۔ یہاں کسی کے پاس اپنے روپے نہیں ہو سکتے۔ ذرا اسے گن کر دیکھو یہ کتنے ہیں؟''

تھوڑی دیر تک خاموشی رہی، ایمان علی نوٹوں کو گن رہا تھا۔ گننے کے بعد اس نے کہا'' پورے دو ہزار ہیں''۔

''ہوں'' چوہدری نے ایک لمبی سی معنی خیز'' ہوں'' کے بعد کہا'' تم بہت ایماندار بنتے ہو۔ تم نے سمجھ لیا تھا کہ میں یہاں کسی وقت بھی تمہاری تلاشی لے سکتا ہوں اور امام دین کے یہ دو ہزار روپے تمہاری جیب سے نکال سکتا ہوں''۔

''یہ..... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میری قمیص کی اندرونی جیب میں صرف ایک چھوٹا کلام پاک ہوتا ہے۔ میں نے اتنے روپے آج پہلی بار دیکھے ہیں''۔

''ہاں۔ پہلی بار دیکھے ہیں اسی لیے تیرا ایمان ڈگمگا گیا۔ اب سیدھی طرح بتا دے کہ میرے معصوم بھائی کی لاش کہاں پھینک کر آیا ہے ورنہ ابھی جوتا ہاتھ میں لے کر تجھ سے ایمان کی ساری گرد جھاڑ کر رکھ دوں گا'' ایمان علی ایک دم ٹوٹ کر فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس کے لئے اس سے زیادہ شرم اور توہین کی بات اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی۔

ایمان علی کا سر چکرا رہا تھا۔ وہ فرش پر اکڑوں بیٹھا ہوا سر اٹھا کر اور دیدے پھاڑ پھاڑ کر اپنے سامنے کھڑے ہوئے بھینس نما چوہدری کو دیکھ رہا تھا۔ اس وقت چوہدری ایک بہت بڑا جوتا نظر آ رہا تھا جو اس کے سر پر بجنے کے لئے تیار کھڑا تھا۔ اس گھڑی اسے دائیں بائیں، آگے پیچھے، اوپر نیچے ہر سمت جوتے ہی جوتے نظر آ رہے تھے اور یہ گیان حاصل ہو رہا تھا کہ اس کے چاروں طرف متحرک انسان اتنا زیادہ نہیں چلتے جتنے ان کے درمیان جوتے چلتے ہیں۔

یہ دین کیا ہے؟ جوتوں کا بہت بڑا گھر ہے۔ جب وہ مدرسے میں ابتدائی تعلیم حاصل کرتا تھا تو استادوں کے جوتے اٹھاتا تھا اور گھر میں سوتیلے باپ کے جوتے کھاتا تھا۔ پھر کچھ ہوش سنبھالا تو تفہیم القرآن کے ادارے میں قرآن شریف کو پڑھنے کا فن سیکھتا رہا کہ حروف کو ان کے صحیح مخارج سے کس طرح ادا کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ علمائے دین کے جوتے سیدھے کرتا رہا۔ وہاں سے آگے چلا تو پتا چلا کہ مسجد ہو یا دینی ادارے، ہر جگہ بڑے بڑے جوتے والوں کی اجارہ داری ہوتی ہے۔ وہ پیش امام جیسے معزز شخص کو ملازم سمجھ کر اپنے جوتوں پر بٹھاتے ہیں اور اپنی جوتیوں کے صدقے تین وقت کی روٹیاں کھلاتے ہیں۔ بہت زیادہ خوش ہوئے اپنی جوتی کو دلہن کی طرح چمکا کر کسی کے گلے میں طوق کی طرح پہنا دیتے ہیں۔ اس کے قدم جس زمین پر گئے، اس نے یہی دیکھا کہ انسان نئے جوتے کی طرح کاٹتا ہے اور پرانے جوتے کی طرح ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ اقتصادی

اور معاشرتی زندگی میں جوتے سکہ رائج الوقت کی طرح چلتے ہیں۔ کسی کو مار کر کچھ دیتے ہیں اور کسی کو مار کر سب کچھ چھین لیتے ہیں اور یہ سب محض اس لیے ہے کہ انسان ایمان علی کے سائے سے ہٹ کر جوتوں کے سائے میں بڑی خوشی سے زندگی گزارتے ہیں۔

دروازے پر کھڑی سکینہ نے اپنے ایمان علی پر الزام آتے دیکھ کر کہا ''چوہدری جی! ذرا انصاف سے کام لو، ایک شریف آدمی کو چور اور قاتل نہ بناؤ۔ میرا خاوند ایسا ایمان والا ہے اس نے کبھی کسی کی جیب سے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں نکالی ہے، کبھی کسی سے دشمنی نہیں کی ہے پھر کسی کو قتل کیسے کر سکتا ہے؟ تم سوچے سمجھے بغیر اسے جوتے مارنے کی دھمکی دے رہے ہو اور ایک شریف آدمی کی توہین کر رہے ہو''۔ چوہدری نے دروازے کی طرف دیکھا جس کے پیچھے سکینہ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ نظر نہیں آ رہی تھی مگر ایک عورت کی سریلی آواز سن کر وہ ذرا نرم پڑ گیا اور مسکرا کر کہنے لگا۔

''اگر کوئی انسان کی زبان نہ سمجھے تو جوتے سمجھا دیتے ہیں۔ میں نے تیرے خاوند کو زبان سے سمجھانے کی کوشش کی کہ مجھ پر کس طرح چھوٹے بھائی کے قتل کا الزام آ سکتا ہے اگر یہ اپنی زبان بند رکھے تو میں اس الزام سے بچ سکتا ہوں مگر یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آئی۔ یہ اپنی ایمانداری جھاڑتا رہا کہ پوچھ گچھ ہوئی تو سچ بولے گا۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ اس سے دو ہزار روپے کے بارے میں پوچھ گچھ ہوئی تو اس کی سچائی کیا کام آئے گی؟ اس کے بیان کی سچائی کے مطابق سب یہی سمجھیں گے کہ امام دین اسے راستے میں ملا تھا اور اسے دو ہزار روپے دے کر اپنی جان بچا کر یہاں آنا چاہتا تھا مگر وہ یہاں تک نہیں پہنچ سکا۔ اس کے دو ہزار روپے اس وقت اس کے ہاتھوں میں ہیں۔ وہ پولیس والوں کے سامنے ہزار قسمیں کھا کر یقین دلائے کہ یہ روپے اس نے امام دین سے نہیں چھینے ہیں اور چھیننے کے لیے اسے قتل نہیں کیا ہے تو، تو ہی بتا کہ کون تیرے خاوند کی سچائی پر یقین کرے گا؟ دیکھ میں سمجھتا ہوں کہ تیرا خاوند مجرم نہیں ہے، واقعی ایماندار ہے۔ اس طرح میں بھی مجرم نہیں ہوں لیکن میری اور تمہاری سچائی کو اس دنیا میں کون سمجھتا ہے؟ انہیں سمجھانے کے لئے تھوڑا سا جھوٹ کا سہارا لینا پڑتا ہے یا آنکھوں دیکھی باتوں سے انکار کرنا پڑتا ہے کہ انہوں نے کچھ نہیں دیکھا انہیں راستے میں کوئی نہیں ملا تھا۔ بس اتنا سا جھوٹ کہہ دینے سے یہ دنیا والے ہماری تمہاری سچائی پر یقین کر لیں گے''۔

سکینہ نے پوچھا ''تم کہتے ہو میرا خاوند مجرم نہیں ہے تو پھر یہ روپے کس کے ہیں؟''

چوہدری نے جواب دیا۔

''تیرے خاوند کو ایک اچھا سبق سکھانے کے لئے میں نے یہ روپے تکیے کے نیچے رکھ دیئے تھے۔ جس کے پاؤں میں جوتا کاٹتا ہے، وہی تکلیف سمجھ سکتا ہے۔ اب تیرے ایمان والے شوہر کو جوتا کاٹ رہا ہے تو اسے بلا کر پوچھ کہ اب کیسی تکلیف ہو رہی ہے۔ اگر میرے دل میں بے ایمانی ہوتی تو میں کبھی یہ تسلیم نہ کرتا کہ یہ روپے میں نے تکیے کے نیچے رکھے تھے۔ میں ابھی تھانے دار کو بلاتا اور اسے قانون کے حوالے کر دیتا۔ ایمان علی چیختا چلاتا رہتا کوئی اس کی سچائی کو تسلیم نہ کرتا۔ اس کے خلاف بہت سے ثبوت حاصل ہو جاتے کیونکہ خود اس کا بیان اسے مجرم ثابت کرتا ہے۔ تو ذرا سمجھدار معلوم ہوتی ہے، ان باتوں کو اچھی طرح سمجھ لے گی۔ اس لیے میں تجھے موقع دیتا ہوں کہ اسے سمجھا لے۔ نہیں سمجھے گا تو پھر میں قانونی کارروائی کروں گا''۔

یہ کہہ کر اس نے ایمان علی کو کمرے کے اندر جانے کا حکم دیا۔ ایمان علی نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے وہ دو ہزار روپے چوہدری کو واپس

کرنے چاہے مگر چوہدری نے انکار کرتے ہوئے کہا۔

''ابھی یہ روپے تیرے ہی پاس رہیں گے۔ جب ہم ایک فیصلے پر متفق ہو جائیں گے تو میں تجھے چوری اور قتل کے بہت بڑے الزام سے بچالوں گا اور یہ روپے بھی واپس لے لوں گا۔ جا پہلے اپنی گھر والی سے باتیں کر لے''۔

ایمان علی سر جھکا کر کمرے میں آ گیا۔ سکینہ نے دروازہ بند کرتے وقت دیکھا چوہدری دروازے کے باہر کرسی رکھ کر بیٹھ رہا تھا۔ یعنی وہ ایمان کی زبان سے اپنے حق میں فیصلہ سنے بغیر وہاں سے ٹلنے والا نہ تھا۔ سکینہ دروازے کو اندر سے بند کر کے ایمان علی کی طرف پلٹ گئی۔ وہ ہاتھوں میں دو ہزار کی گڈی پکڑے بستر کے سرے پر یوں بیٹھا ہوا تھا جیسے اپنے ہاتھوں سے چوہدری کا دیا ہوا جوتا پکڑے ہو۔ سکینہ نے اس کے قریب آتے ہوئے کہا۔

''تجھے کب عقل آئے گی؟ تو ایماندار بنتا ہے، یہ اچھی بات ہے مگر تیرا ایمان صرف تیری ذات تک ہونا چاہیے۔ تو دوسروں کے معاملے میں ایمان اور سچائی کو لے کر آئے گا تو دوسرے اپنا نقصان کبھی برداشت نہیں کریں گے''۔

وہ روتے ہوئے لہجے میں بولا ''یہ کتنی شرم کی بات ہے سکینہ کہ ایمان اور سچائی سے لوگوں کو نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے''۔

''ہاں اندیشہ ہوتا ہے۔ تیرے سامنے کی بات ہے کہ تو چوہدری کے معاملے میں سچ بولنا چاہتا ہے۔ تیری سچائی اسے تھانے کچہری تک لے جائے گی جبکہ آج صبح اس بے چارے نے اپنے بھائی کی شکل تک نہیں دیکھی ہے مگر تو یہ کہے گا کہ تو نے امام دین کو یہاں آتے دیکھا ہے تو پھر اس بے چارے کے تمام دشمن اسے اپنے بھائی کا قاتل ثابت کرنے کی کوشش کریں گے''۔

''انسان چاہے تو اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا''۔

''تو بھی تو سچا ہے پھر یہ دو ہزار روپے تجھے کیسے نقصان پہنچانے والے ہیں''۔

''یہ چوہدری نے میرے ساتھ فریب کیا ہے''۔

''فریب نہیں کیا ہے بلکہ تجھے ایک اچھا سبق سکھایا ہے۔ اس بات سے تجھے سمجھ لینا چاہئے کہ کبھی ایمان والوں پر بھی ایسا وقت آتا ہے جب ان کی زبان کی سچائی کو کوئی تسلیم نہیں کرتا۔ اسی طرح وہ بے چارہ چوہدری بھی بے گناہ ہے۔ اگر تو نے یہ کہہ دیا کہ امام دین کو یہاں آتے دیکھا تھا تو ایسی صورت میں تو چشم دید گواہ بن جائے گا اور چوہدری پر جھوٹا الزام آ جائے گا''۔

اس نے جھنجھلا کر کہا۔

''پھر میں کیا کروں؟''

''اپنی زبان بند کر لے۔ کسی سے یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ امام دین سے تیری ملاقات ہوئی تھی؟''

''اگر کوئی مجھ سے پوچھے گا تو؟''

''تو یہ کہہ دینا کہ تو کسی امام دین کو نہیں جانتا''۔

''تو مجھے جھوٹ بولنا سکھا رہی ہے''۔

''اتنا سا جھوٹ نہیں بولے گا تو ان دو ہزار روپوں کے ساتھ تھانے پہنچ جائے گا۔ پھر تجھے جیل ہو جائے گی، تجھ پر مقدمہ چلے گا، تو، تو مجھے کس کے حوالے کر کے جائے گا؟ اب تو اس دنیا میں اکیلا تو نہیں ہے کہ سچ بولتا ہوا گزرتا جائے گا اور سزائیں پاتا جائے گا۔ اب تو مجھے بھی تیری سچائی کی سزا ملا کرے گی۔ میں تیرے ایمان کی خاطر بڑی سے بڑی مصیبتیں برداشت کر سکتی ہوں مگر اتنا بتا دے کہ تیرے حوالات میں جانے کے بعد میرے سر پر چادر کون رکھے گا۔ تو مجھے اپنی ملکیت بنانے کے لیے ایک چادر میں چھپاتا ہے کہ کوئی مجھے دیکھ نہ سکے۔ تیرے بعد میں یہ پردہ کیسے رکھوں گی؟ کیا مجھے دو وقت کی روٹیوں کے لئے دوسروں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلانا پڑے گا؟ کیا میرا ہاتھ چادر سے باہر آ کر ننگا نہیں ہوگا؟ تو مجھے بتا دے کہ میں تیرے بعد کیا کروں گی؟''

ایمان علی سر جھکائے اس کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے کہا ''ہاں اب میں اکیلا نہیں ہوں۔ پہلے صرف ایمان کے لیے سوچتا تھا، اب تیرے لیے بھی سوچنا میرا اولین فرض ہے۔ اب مجھے ایسا قدم اٹھانا چاہیے کہ تو بھی سلامت رہے اور میرے ایمان کو بھی ٹھیس نہ پہنچے۔ اس کا یہی ایک راستہ ہے کہ ہم اس پنڈ میں نہیں رہیں گے۔ ابھی یہاں سے چلے جائیں گے پھر کوئی مجھ سے امام دین کے متعلق سوال نہیں کرے گا اور نہ ہی خواہ مخواہ مجھے جھوٹ بولنا پڑے گا''۔

یہ بہت اچھی تدبیر تھی۔ آدمی ایمان دار بن کر رہنا چاہے تو سوچنے سمجھنے سے ایمان کی سلامتی کے لئے ہزاروں تدبیریں کھل سکتی ہیں۔ سکینہ اسے بڑی محبت اور بڑی عقیدت سے دیکھنے لگی۔ وہ اس بات پر فخر محسوس کر رہی تھی کہ اس کا آدمی چٹان ہے۔ دنیاوی آندھیوں کے سامنے سینہ سپر رہتا ہے۔ آندھیاں تھک جاتی ہیں مگر وہ اپنی جگہ سے نہیں ہلتا۔

وہ اس کے سامنے زمین پر بیٹھ گئی پھر اس کے گھٹنوں پر سر رکھ کر بولی۔

''ایسا ایماندار آدمی میں نے کبھی نہیں دیکھا نہ کبھی سنا۔ خدا کی قسم تیرے ایمان کو دنیا کی کوئی طاقت کمزور نہیں بنا سکتی۔ تیرے ہی جیسے انسانوں کے لیے کہا گیا ہے کہ خدا کے علاوہ کسی کو سجدے کی اجازت ہوتی تو مجھ جیسی عورتیں تیرے جیسے شوہروں کو سجدہ کرتیں''۔

اپنے اصولوں کا جہاں تک تعلق تھا وہ سچ مچ چٹان تھا مگر انسان بھی تھا۔ اس لیے جب سکینہ نے اس کے گھٹنوں پر سر رکھا تو وہ پھر اس کی قربت سے گھبرا گیا۔ ایک انسان اگرچہ فرشتہ سیرت ہو تو یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ اس کے دماغ میں دوسرے تقاضے نہیں چیختے ہوں گے۔ ہمارے سوچنے کا انداز عجیب ہے ہم کسی ایماندار مولوی کو دیکھ کر یہ سوچتے ہیں کہ وہ صرف مولوی ہو، اس کے سینے میں جو دل ہے وہ کسی کی محبت کے لیے دھڑکتا نہ ہو۔ نہ جانے کیوں ہم اسے انسان کے بجائے فرشتہ سمجھنا چاہتے ہیں یا اگر فرشتہ نہ سمجھیں گے تو ایسے ایسا احمق سمجھیں گے جو اپنی ہی عورت سے دور بھاگتا ہو۔ ایمان والوں کو نہ اس کروٹ چین ہے نہ اس کروٹ۔ وہ بھی بے چین ہو گیا تھا اسی لیے سکینہ سے دور ہونے کے لیے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

میں ابھی جا کر چوہدری کو اپنا فیصلہ سناتا ہوں۔ وہ سکینہ سے کترا کر نکل گیا پھر کمرے کا دروازہ کھول کر باہر آیا اور سامنے کرسی پر بیٹھے

چوہدری سے کہنے لگا۔

''چوہدری! یہ بات میری سمجھ میں آ گئی ہے کہ بعض اوقات انسان کتنا ہی سچا ہو، دنیا والے اس کی سچائی کو تسلیم نہیں کرتے۔ صرف حالات اور واقعات کے پیش نظر اسے مجرم سمجھ لیتے ہیں۔ تمہاری باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ تم نے کوئی جرم نہیں کیا۔ لہذا اگر میں یہاں نہ رہوں اور یہاں سے دور چلا جاؤں گا تو پھر مجھ سے کوئی پوچھنے والا نہیں رہے گا۔ اس طرح میرا ایمان بھی سلامت رہے گا اور تمہاری پریشانی بھی ختم ہو جائے گی۔ اس لیے اب تم یہ دو ہزار روپے رکھو، میں اپنی گھر والی کو لے کر ابھی یہاں سے چلا جاتا ہوں''۔

''تم کہاں جاؤ گے؟''

''یہ دنیا بہت بڑی ہے میں کہیں دور چلا جاؤں گا''۔

''مگر تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ میں تمہیں جانے دوں گا۔ تم اس بات کے چشم دید گواہ ہو کہ تم نے امام دین کو یہاں آتے دیکھا ہے۔ اگر تم دوسرے پنڈ میں جا کر کہو گے تو یہ بات میرے دشمنوں تک پہنچ جائے گی''۔

''میں یہاں سے دور جا کر کسی سے نہیں کہوں گا''۔

''جب کسی سے نہیں کہو گے تو یہیں رہو۔ تم کیسے احمق ہو اتنا نہیں سمجھتے کہ جس زبان کو وہاں بند رکھو گے اسی زبان کو یہاں بھی بند رکھ سکتے ہو''۔

''یہاں تو پوچھنے والے پیدا ہو سکتے ہیں''۔

''قانون ہر جگہ پوچھنے کے لئے پہنچ جاتا ہے۔ تم جوان ہو۔ تم نے زیادہ دنیا میں نے دیکھی ہے۔ میں تمہیں صاف صاف اپنا فیصلہ سنا دوں کہ جب تک امام دین کا پتہ نہیں چلے گا، یہ دو ہزار روپے تمہارے پاس رہیں گے اور تم میری نظروں کے سامنے رہو گے۔ اس طرح یہ روپے تمہیں سمجھاتے رہیں گے کہ مجھ بے گناہ کو الزام سے بچانے کے لئے تمہیں کس طرح اپنی زبان بند رکھنی چاہیے اور تم میری نگاہوں کے سامنے رہو گے تو مجھے بھی اطمینان رہے گا کہ تم ایک سچ بول کر مجھ سے دشمنی نہیں کر رہے ہو''۔

ایمان علی پریشان ہو کر چوہدری کو دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے سامنے کھڑے ہوئے بھینس نما انسان کو کیا سمجھے۔ کیونکہ وہ بیک وقت بے ایمان بھی تھا اور ایماندار بھی۔ ایماندار اس لیے نظر آ رہا تھا کہ اس نے اپنے بھائی کو قتل نہیں کیا تھا، اس کے حصے کی جائیداد ہضم نہیں کرنا چاہتا تھا، اپنے گمشدہ بھائی کو تلاش کرنے تک اسے اپنی نگاہوں کے سامنے رکھنا چاہتا تھا اور اس مقصد کے لیے وہ اس سے بے ایمانی کر رہا تھا۔ دو ہزار کی چوری اور بھائی کے قتل کے الزام لگانے کی دھمکی دے رہا تھا۔ واقعی بعض حالات میں انسان بہت مجبور ہو جاتا ہے۔ دوسروں کو جب تک اپنی جوتیوں میں نہ رکھے، اس وقت تک قانون کے جوتوں سے نہیں بچ سکتا۔

ایمان علی نے بڑی بے بسی سے کہا ''چوہدری تم میرے لیے مصیبتیں پیدا کر رہے ہو۔ میں ایک سیدھا سادا راستہ بتا رہا ہوں۔ خدا کی قسم کھا کر یقین دلاتا ہوں کہ یہاں سے جانے کے بعد کسی سے کچھ نہیں کہوں گا''۔

چوہدری نے بے زار ہو کر کہا ''تمہاری باتیں میرے لیے قابل قبول نہیں ہیں اور میری بات تمہاری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ تمہاری گھر والی تم

سے زیادہ سمجھدار ہے تم پھر اس کے پاس جاؤ وہ تمہیں سمجھائے گی۔ اگر اس بار نہیں سمجھو گے تو میں تھانیدار کو بلوالوں گا''۔

وہ سر جھکائے اسی طرح کرنسی نوٹوں کے جوتے پکڑے سکینہ کے پاس آ گیا۔ اس بار سکینہ کا سر جھکا ہوا تھا۔ اپنے جس آدمی کو وہ چٹان کہہ رہی تھی، اس چٹان کو باہر کھڑا چوہدری بڑے عجیب انداز سے توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنے ایمان کو کس طرح بچائے۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے بہت دیر تک سر جھکائے کھڑے رہے۔ مرد کے سامنے عورت ہمیشہ کمزور سمجھی جاتی ہے اور ہمیشہ کم عقل کہلاتی ہے مگر ڈوبتے وقت تنکے کی طرح سہارا بھی بن جاتی ہے۔ ایمان علی سوچ رہا تھا کہ اس تنکے جیسی عورت کا سہارا مل جائے تو وہ کسی طرح ڈوبنے سے بچ جائے۔ بہت دیر بعد سکینہ نے اس سے کہا۔ اب میں تیرے ایمان کو ٹھیس پہنچانے والی کوئی بات نہیں کروں گی۔ میں یہ اچھی طرح سمجھتی ہوں کہ اگر ایک طرف ایمان ہو اور دوسری طرف میں ہوں اور دونوں میں سے کسی کو انتخاب کرنے کے کہا جائے تو تو ایمان کی طرف جائے گا۔ کیا تو ایمان کی سلامتی کے لیے مجھے چھوڑ سکتا ہے؟''

ایمان علی نے گھبرا کر پوچھا۔

''تو کہنا کیا چاہتی ہے؟'' ایسی باتیں نہ کر میں پہلے ہی پریشان ہوں''۔

''تیری پریشانیاں دور کرنے کے لیے ایک ترکیب میری سمجھ میں آئی ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ چوہدری تجھ پر بھروسہ نہیں کر رہا ہے۔ اگر تو کوئی ضمانت دے کر یہاں سے چلا جائے گا تو وہ مطمئن ہو جائے گا''۔

''میں نے اسے مطمئن کرنے کے لئے خدا کی قسم کھائی ہے۔ خدا کی قسم سے بڑھ کر اور کیا ضمانت ہو سکتی ہے''۔

''میرے ایمان! تیرے لیے خدا سے بڑھ کر اور کوئی نہیں ہے لیکن دنیا والوں کے لیے بیوی سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے۔ تو ضمانت کے طور پر مجھے چھوڑ کر چلا جا۔ چوہدری ایک دم سے مطمئن ہو جائے گا''۔

''کیا بکتی ہے۔ میں نے خدا کو حاضر ناظر جان کر تجھے اس لیے نہیں اپنایا تھا کہ کسی جگہ تجھے چھوڑ کر چلا جاؤں''۔

''کسی ایک کو تو چھوڑنا ہی پڑے گا۔ اگر چھوڑنا نہیں چاہتا ہے تو اپنے ایمان میں ذرا لچک پیدا کر۔ اتنی دیر کے لیے زبان بند کر لے جب تک کہ امام دین واپس نہ آ جائے''۔

دروازے کے باہر سے چوہدری کی آواز سنائی دی ''مولوی صاحب! زیادہ بات نہ بڑھاؤ، اپنی گھر والی کی بات کو سمجھو میں صرف اتنا چاہتا ہوں کہ تم خود کسی کے سامنے جا کر امام دین کا ذکر نہ کرو۔ میری کوشش یہی ہوگی کہ تمہارے پاس آ کر کوئی امام دین کے بارے میں نہ پوچھے''۔

ایمان علی نے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

''یہ بات تو میں کہہ چکا ہوں کہ میں غیر ضروری بات نہیں کرتا۔ کسی کے سامنے خود امام دین کا ذکر نہیں کروں گا۔ ہاں اگر کوئی پوچھے گا تو سچ بولنے پر مجبور ہو جاؤں گا۔ تم یہی کوشش کرو کہ کوئی مجھ سے نہ پوچھے''۔

چوہدری نے کہا ''چلو منظور ہے، تم اسی طرح مان جاؤ۔ اگر اس سلسلے میں تفتیش ہوئی تو میں تھانیدار سے نمٹ لوں گا۔ اسے تمہارے قریب

پھٹکنے نہیں دوں گا''۔

ان کے درمیان سمجھوتا ہوگیا۔ چوہدری مطمئن ہوکر وہاں سے چلا گیا۔ اب کسی قسم کی پریشانی نہیں تھی۔ ایمان علی جھوٹ بولنے سے بچ گیا تھا۔ چوہدری اس موقع سے اسے بچانے والا تھا جہاں سچ بولنے کی نوبت آتی۔ اس کے باوجود ایمان علی کے دل میں بے چینی سی تھی۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کے ایمان کو کس طرح الجھا دیا گیا ہے اور سب سے بڑا کانٹا جو اس کے دل میں چبھ رہا تھا وہ دو ہزار روپے کی صورت میں اس کی ہتھیلی پر رکھا ہوا تھا۔ نہ ان روپوں کو واپس کرسکتا تھا، نہ انہیں پھینک سکتا تھا کیونکہ وہ چوہدری کی امانت اور چوہدری کی ضمانت تھے۔

وہ نوٹوں کو مٹھی میں بھینچ کر غصے سے تلملا رہا تھا۔ اسی وقت چوہدری کا ملازم دو گلاس دودھ کا ٹھنڈا شربت لے کر وہاں آیا اور ان کے پاس میز پر رکھ کر چلا گیا۔ سکینہ نے ایک گلاس اٹھا کر اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''خواہ مخواہ گرمی دکھانے سے کیا فائدہ! لے پی لے۔ اس دنیا کا یہی دستور ہے کہ لوگ گرم کرکے شربت پلاتے ہیں''۔

O☆O

عقل و دانش سے پرے پُراسرار دنیا کی ہیبتناک کہانیاں

مشہور ترین مصنف ایم اے راحت کے قلم سے
عقل و سوچ سے مبرّا سسپنس، مہم جوئی اور پُراسرار
واقعات پر مبنی دلچسپ کہانیاں

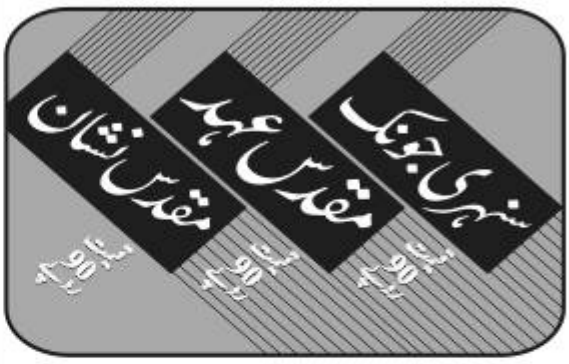

اپنے ہاکر یا قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز، ۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 7247414
تاجر: کامیاب بک ڈپو، نیو اردو بازار، کراچی

اسلم راہی کے سحر انگیز قلم سے سحر و اسرار میں ڈوبا ہوا پہلا خوفناک ناول

بدروحوں کے پجاری

خوف، سحر، جادو، پُراسراریت، سسپنس سے بھرپور کہانی

قیمت 150 روپے

- یوحا کون تھی؟ ناگن یا انسان؟
- لاہور کے سیتلا مندر میں کیا ہو رہا تھا؟
- کیا اونچی چمارن ایک خبیث بدروح تھی؟
- پیر پنجال کی پُراسرار چوٹیوں پر کس کی حکومت تھی؟
- زہریلے انسان کون تھے اور کہاں سے آئے تھے؟
- رام دیا س، سندر داس اور چونی لال۔ تین انسان تینوں شیطان۔
- ایک قلعی گر کی داستان عجب۔ بڑے بڑے عامل اس سے گھبراتے تھے۔
- خونی تالاب کے کنارے پُراسرار ہیولہ کس کا تھا؟
- نظر نہ آنے والی خوفناک موت کس نے بھیجی تھی؟
- طلسمی غار جہاں انسان اپنے حواس کھو بیٹھتا تھا۔

اپنے ہاکر یا قریبی بکسٹال سے طلب فرمائیں

ناشر: علی میاں پبلیکیشنز، ۲۰۔ عزیز مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 7247414
تاجر: کامیاب بک ڈپو، نیو اردو بازار، کراچی

ایمان علی اسی پنڈ میں رہنے پر مجبور ہوگیا۔ چوہدری نے اس کے ایمان کی آسودگی کے لیے حویلی کے پیچھے اسی جگہ ایک مدرسہ کھول دیا جہاں پچھلے دنوں لکڑی کے چار کھمبے نصب کر کے چھت ڈالی گئی تھی اور چھت کے نیچے والی زمین لیپ پوت کر ہموار کر دی گئی تھی تا کہ وہاں بھینسوں کو باندھا جائے مگر چوہدری نے ایمان علی کو وہاں باندھ دیا تھا۔ وہاں ایک کمرہ اور بنا دیا گیا تھا تا کہ وہ سکینہ کے ساتھ آرام سے رہ سکے۔ روز صبح پنڈ کے بچے وہاں پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ ایمان علی انہیں دین و ایمان کی اچھی اچھی باتیں سکھاتا تھا اور کلام پاس کے ابتدائی سپارے پڑھاتا تھا۔ اس طرح اس کا دھیان بٹ گیا تھا کہ اب وہ ایک جگہ بیٹھ کر نہایت اطمینان و سکون سے ایمان کا درس دے رہا ہے اور حلال کی روٹیاں کھا رہا ہے۔ لیکن جب وہ نماز پڑھنے کے لیے وہاں کی مسجد میں جاتا تو اس کے دل کو سخت تکلیف پہنچتی تھی۔ وہاں جو پیش امام تھے ان کا حافظہ کسی قدر کمزور تھا۔ نماز پڑھانے کے دوران وہ اکثر ایک آدھ آیت بھول جاتے تھے یا غلط پڑھ جاتے تھے۔ ایمان علی ان کے پیچھے نماز پڑھتے وقت انہیں ہمیشہ لقمے دیتا تھا۔ یہ بات پیش امام صاحب کو ناگوار گزرتی تھی۔ نماز کے بعد وہ اکثر ایمان علی سے جھگڑا کرتے تھے اور پنڈ والوں کے سامنے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ وہ صحیح پڑھتے ہیں۔ ایمان علی خواہ مخواہ اپنی قابلیت ظاہر کرنے کے لئے نماز کے دوران انہیں ٹوکتا رہتا ہے۔ پہلے تو ایمان علی نے انہیں سمجھایا۔

''دیکھئے مولوی صاحب! ہمارے ملک میں مسلمان بہت ہیں مگر صحیح معنوں میں ایمان والے مٹھی بھر ہیں۔ ایمان کو صحیح طور پر پیش کرنا میرا فرض ہے۔ اگر ہم اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈال کر غلط پڑھیں گے تو یہ غلطیاں عام ہو جائیں گی اسی لیے میں آپ کا محاسبہ کر رہا ہوں۔ اگر مجھ سے اور مجھ سے بڑے عالم بھی آپ کے سامنے کوئی غلطی کریں تو آپ بھی محاسبہ کر سکتے ہیں۔ میں نے نماز کے دوران لقمہ دے کر آپ کی توہین نہیں کی ہے بلکہ بروقت غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔ ایسے میں آپ کو اپنی توہین محسوس نہیں کرنی چاہیے۔ آپ کی کمزوریاں ایسی ہیں کہ آپ ذرا سی کوشش کے بعد انہیں دور کر سکتے ہیں۔ آپ کچھ روز کلام پاک کھول کر بغور پڑھیں اور پھر سے حفظ کریں۔ پھر مجھ جیسا کوئی بھی شخص آپ کی نماز کے دوران رکاوٹ نہیں بنے گا۔

ایمان علی نے پیش امام کو کئی بار اچھی طرح سمجھایا لیکن بعض نیم ملا ایسے ہوتے ہیں جو اپنے آپ کو مکمل مولوی سمجھتے ہیں اور اپنے سامنے کسی کی برتری برداشت نہیں کرتے۔ جب وہ سیدھی طرح راہ راست پر نہیں آیا تو ایمان علی نے یہ مسئلہ چوہدری دین محمد تک پہنچایا۔ چوہدری حافظ قرآن نہیں تھا، وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکتا تھا کہ دونوں مولویوں میں سے کون درست کہہ رہا ہے۔ آخر پنچایت میں یہ فیصلہ ہوا کہ شہر سے کسی بڑے عالم کو بلایا جائے۔ اس عالم کے سامنے دونوں مولوی کلام پاک کی تلاوت کریں گے، حقیقت کھل جائے گی کہ تلاوت کے سلسلے میں کس مولوی کا حافظہ کمزور ہے۔

چوہدری نے اپنے ایک خاص آدمی کو لاہور کی طرح روانہ کیا تا کہ وہاں جا کر اس کے چھوٹے بھائی امام دین سے ملے اور اس سے کہے کہ وہ کسی بڑے عالم سے ملاقات کرے اور اس عالم کو پنڈ میں آنے کی دعوت دے۔ چوہدری نے امام دین کے نام خط لکھ کر اسے بھی پنڈ آنے کے لیے کہا تھا تا کہ وہ دونوں بھائی پوری دیانتداری سے جائیداد کا بٹوارہ کر لیں۔

پھر اس پنڈ میں بڑے عالم کا انتظار ہونے لگا۔ مسجد کے پیش امام کے دل میں گھبراہٹ پیدا ہوگئی تھی کیونکہ وہ اپنی کمزوری کو اچھی طرح

سمجھتا تھا مگر اکثر لوگوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کے سامنے اپنی کمزوریوں کا اعتراف نہیں کرتے۔ اب پول کھلنے والا تھا اس لیے وہ بہت زیادہ پریشان ہو گیا تھا اور پریشانیوں کے باعث نماز کے دوران اور زیادہ غلطیاں کرنے لگا۔ ایمان علی اسے معاف نہیں کرتا تھا۔ ہمیشہ اپنا فرض ادا کرنے کے لیے نماز پڑھتے وقت اسے لقمہ دیا کرتا تھا۔ دو دن کے بعد چوہدری کے آدمی نے شہر سے واپس آ کر بتایا کہ شہر میں امام دین سے ملاقات نہیں ہوئی لیکن ایک عالم صاحب دوسرے دن اس پنڈ میں پہنچنے والے ہیں۔ جس روز چوہدری کا آدمی یہ خبر لے کر آیا اسی رات پیش امام وہ پنڈ چھوڑ کر بھاگ گیا۔

ایک عالم دین کے اس پنڈ میں پہنچنے سے پہلے ہی ایمان علی کی سچائی ثابت ہو گئی۔ پنڈ والے اور زیادہ اس کی عزت کرنے لگے۔ اسے مسجد کا پیش امام بنا دیا گیا۔ ایمان علی کو عزت ملی تو اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور پچھلی تلخیوں کو بھول گیا۔ وہ گزری ہوئی بہت سی باتوں کو بھلا سکتا تھا لیکن سکینہ گزرے ہوئے وقت کی طرح اس کے دماغ سے نہیں نکل رہی تھی۔ سکینہ وہ بھلا ہی نہیں سکتا تھا۔ اسے حویلی کے پیچھے دو کمروں کا جو کچا مکان رہنے کے لیے دیا گیا تھا اس کے ایک کمرے میں سکینہ رات گزارتی تھی، دوسرے کمرے میں جہاں وہ بچوں کو تعلیم دیا کرتا تھا، وہیں بستر پر پڑا رات بھر کروٹیں بدلتا رہتا تھا۔ اگرچہ سکینہ اب اس کے سامنے بہکانے والے انداز میں نہیں آتی تھی لیکن عورت کی جانی بوجھی ادائیں نہ ہوں تب بھی اس کی موجودگی ہزار جلووں سے بہکاتی ہے۔ پھولوں سے لدی ہوئی شاخ بخود بخود نہیں لچکتی، ہوا کی چھیڑ خانی اسے لچکاتی ہے۔ سکینہ بھی جان بوجھ کر اسے کوئی ادا نہیں دکھاتی تھی مگر چلتے وقت فطرت کی انگلیاں خود ہی اسے گدگدا کر لچکا دیتی تھیں۔ اس عمر کی گدگدی محسوس نہ ہو تب بھی اپنا تماشہ دکھا دیتی ہے۔ ہزار ضبط کے باوجود بہت کچھ سوچنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ ایمان علی بھی سوچنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کس طرح اپنی آنکھیں بند کرے اور قدرت کے ایک حسین شاہکار کو دیکھنے سے انکار کر دے۔

دوسرے دن ایک بڑے عالم صاحب تشریف لائے تو ایمان علی نے ان کے سامنے زانوئے ادب تہہ کیا۔ جس مسئلے کے پیش نظر انہیں بلایا گیا تھا، وہ تو پہلے ہی حل ہو چکا تھا۔ ایمان علی نے اپنی معلومات میں اضافے کے لیے ایک نیا مسئلہ پیش کیا۔

''جناب! ایک مسئلہ درپیش ہے۔ زید نے ایک مسلمان دوشیزہ سے شادی کی۔ شادی کی رات پتا چلا کہ زید کی منکوحہ پہلے سے حاملہ ہے۔ کیا ایسی صورت میں زید اپنی اس منکوحہ کے ساتھ رات بستر کر سکتا ہے؟''

عالم دین نے افسوس کا اظہار کیا اور کہا ''ہماری اس دنیا میں گناہوں کی تاریکیاں بڑھتی جا رہی ہیں۔ شریف گھرانے کی بہو بیٹیاں شادی سے پہلے ہی گمراہ ہو جاتی ہیں۔ بعض ایسی ہوتی ہیں جنہیں حالات مجبور کر دیتے ہیں بعض ایسی ہوتی ہیں جنہیں عیاش مرد جبراً تباہ کر دیتے ہیں۔ اگر زید کی منکوحہ پر ظلم کیا گیا ہے اور وہ مظلوم ہے تو ایسی صورت میں ہمدردی کی مستحق ہے۔ زید سے اس کا نکاح جائز ہے لیکن پرہیز لازمی ہے''۔

''ایمان علی نے سوال کیا ''اگر زید اس کے پاس جانے کے لیے بہت زیادہ مجبور ہو تو؟''

''تو زید کو ہر ممکن طریقے سے گریز کرنا چاہیے۔ اگر بیوی کی موجودگی ورغلاتی ہے تو اسے اس کے میکے والوں کے پاس یا اپنے عزیزوں کے پاس چھوڑ دے اور اس کے اخراجات پورے کرتا رہے''۔

''اگر زید کے اپنے رشتے دار نہ ہوں اور اس کی منکوحہ بھی اپنے میکے والوں سے محروم ہو۔ پھر یہ کہ زید کی اتنی آمدنی نہ ہو کہ وہ اپنی منکوحہ کو کسی دوسری جگہ رکھ کر اس کے اخراجات برداشت کرے تو ایسی صورت میں کیا ہو سکتا ہے''؟

عالم دین تھوڑی دیر تک اپنی خوبصورت داڑھی کے بالوں پر انگلیاں پھیرتے ہوئے سوچتے رہے پھر انہوں نے جواب دیا'' کبھی کبھی ایسے پیچیدہ مسائل بھی ایمان کے راستے میں آجاتے ہیں۔ ایسی صورت میں دوسرے آئمہ کرام کے فتاویٰ سے سہارا لیا جا سکتا ہے۔ زید نے اس سے نکاح کیا ہے اور وہ نکاح جائز ہے تو بحالت اضطرار تھوڑی بہت تاویل بھی کی جا سکتی ہے''۔ ان کی باتیں سن کر اچانک ہی ایمان علی کے کانوں میں شہنائیاں بجنے لگیں۔ نگاہوں کے سامنے آتش بازیاں چھوٹنے لگیں اور سکینہ آتش رنگ لباس میں دلہن بن کر سامنے بیٹھ گئی۔ اب ایمان علی کو اپنی نادانی کا پتا چلا۔ اگر وہ پہلے ہی کسی بڑے عالم سے رجوع کرتا تو یوں لب دریا پیاسا نہ بھٹکتا۔ اب اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہاں سے اٹھ کر تیر کی طرح سکینہ کے پاس پہنچ جائے۔ لیکن مسجد کے صحن میں نشست جاری تھی۔ چوہدری دین محمد کے علاوہ پنڈ کے دوسرے بڑے بوڑھے بھی عالم دین کے سامنے باادب بیٹھے ہوئے تھے اور دین و ایمان کی باتیں بڑی توجہ سے سن رہے تھے۔ وہ مسجد کا پیش امام ہو کر دینی مجلس کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا لہذا اسے دل پر بڑا جبر کرنا پڑا۔ وہ مجلس کے اختتام تک وہاں رکنے پر مجبور تھا اس لیے اس نے دوسرے مسائل پر بحث شروع کر دی۔

''جناب زید اپنے دوست بکر کے بارے میں ایسی بات جانتا ہے کہ اگر وہ زبان کھولے تو قانون کی گرفت میں آجائے بلکہ پھانسی کے پھندے تک پہنچ جائے گا جبکہ بکر سچ مچ مجرم یا قاتل نہیں ہے۔ ایسی صورت میں اگر قانون کے محافظ زید سے پوچھ گچھ کریں تو کیا زید اپنے دوست کو بچانے کے لئے صحیح بات یا صحیح واقعے سے چشم پوشی کر سکتا ہے؟''

چوہدری دین محمد اسے گھور کر دیکھنے لگا۔ عالم صاحب نے کہا۔

''جب واقعہ صحیح ہے تو زید کا فرض ہے کہ وہ قانون کے محافظوں کے سامنے اسے من وعن بیان کرے۔ اگر اس کے بیان سے بے گناہ بکر قانون کی زد میں آتا ہے تو زید اور بکر دونوں پر واجب ہے کہ وہ قانون کے محافظوں کو صحیح صورتحال سے آگاہ کریں''۔

چوہدری نے فوراً مداخلت کی'' جناب عالی اگر کسی قسم کی پوچھ گچھ نہ ہو تو کیا ضروری ہے کہ زید اپنی زبان کھولے؟''

''قانون کا احترام ہر فرد پر لازم ہے۔ اگر پولیس والے اس واقعے سے لاعلم ہیں تو زید اور بکر دونوں کا فرض ہے کہ پولیس والوں کو معلومات فراہم کریں۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ایک بات کو چھپانے سے اس کے پیچھے دوسرے دس گناہ چھپنے کے لیے سر ابھارتے ہیں''۔

اس کے بعد چوہدری دین محمد کی بے چینی بڑھ گئی۔ اس کے لئے اس مجلس میں بیٹھنا محال ہو گیا۔ اس نے فوراً ہی اٹھتے ہوئے ایمان علی سے کہا'' مولوی صاحب آپ ذرا میرے ساتھ آئیں، مجھے ایک ضروری کام یاد آگیا ہے''۔

ایمان علی عالم صاحب سے اجازت لے کر چوہدری کے ساتھ مسجد کے صحن سے باہر آگیا۔ باہر آتے ہی چوہدری نے غصے سے کہا۔

''اوئے مولوی! تو بڑا خطرناک ہے۔ آخر اس مسئلے کو چھیڑنے کی کیا ضرورت تھی؟''

ایمان علی نے جواب دیا۔

''جب سے تم نے دو ہزار روپے دو ہزار کیلوں کی طرح میرے سینے پر گاڑ دیئے ہیں، اس وقت سے میرا سکون برباد ہو گیا ہے۔ میں بظاہر خاموش رہتا ہوں مگر اندر سے سچائی کا جذبہ مجھے اضطراب میں مبتلا رکھتا ہے۔ میں کروں کیا؟ چوہدری صاحب خدا کے لیے تم میری حالت پر رحم کرو اور میرے ساتھ تھانے چلو اور امام دین کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا دو۔ میں نے بھی جو کچھ دیکھا ہے اسے صحیح طور پر بیان کر دوں گا اور تھانیدار سے تمہاری بے گناہی کی قسمیں بھی کھاؤں گا۔ دیکھو، خدا پر بھروسہ کرو تم سچے ہو، بے گناہ ہو، رب العزت تمہاری عزت رکھے گا اور تمہیں ہر مصیبت سے بچائے گا''۔

وہ کہتا رہا اور چوہدری سر جھکائے اتنی عقیدت سے سنتا رہا جیسے اس کی سچائی سے متاثر ہوتا جا رہا ہو۔ کون گدھا متاثر ہوتا ہے؟ اپنے گلے میں پھانسی کا پھندا ڈالنے کے لیے کون ایمان کی باتوں کو گلے لگاتا ہے؟ وہ تو سر جھکائے اپنے بچاؤ کی تدبیریں سوچ رہا تھا۔ جب اس نے سر اٹھایا تو اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ اس نے آنسوؤں سے بھرے لہجے میں کہا ''مولوی تمہارے ایمان کی پختگی دیکھ کر میرا سر ندامت سے جھک گیا ہے۔ عالم صاحب کی باتوں نے بھی مجھے متاثر کیا ہے۔ میں ابھی تمہارے ساتھ تھانے چلوں گا اور وہاں وہی کہوں گا جو تم کہو گے۔ میرے دل میں ایمان کا نور پیدا ہو گیا مگر تم میری ایک بات مان لو''۔

میں تمہاری ایک نہیں ایک ہزار باتیں مانوں گا۔ اس سے بڑی بات اور کیا ہو گی کہ تم میرے ساتھ تھانے چلو گے اور ہم دونوں پوری سچائی سے قانون کا ساتھ دیں گے۔ ہاں بتاؤ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''میں چاہتا ہوں کہ تم اس مجلس میں امام دین کا ذکر نہ اٹھاؤ، اس کے بارے میں کوئی مسئلہ نہ چھیڑو۔ مجلس برخاست ہوتے ہی ہم دونوں یہاں سے اٹھ کر تھانے کی طرف چلے جائیں گے''۔

ایمان علی نے تائید میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''ٹھیک ہے، جب ہم اس مسئلہ کو تھانے میں جا کر حل کر رہے ہیں تو یہاں یہ باتیں چھیڑنا فضول ہیں''۔ چوہدری نے خوش ہو کر اس کے شانے کو تھپکتے ہوئے کہا ''مولوی تم بہت اچھے ہو۔ اب تم عالم صاحب کے پاس جاؤ میں تم لوگوں کے لیے شربت وغیرہ بھجواتا ہوں''۔

ایمان علی مسجد کے صحن میں واپس آ گیا اور چوہدری حویلی کی طرف چلا گیا۔ ایمان علی پنڈ والوں کے ساتھ عالم صاحب کے سامنے آ کر بیٹھ گیا۔ اس وقت اس کے دل میں کتنی ہی مسرتیں بھر گئی تھیں۔ ایک تو اس بات کی خوشی کہ چوہدری کے دو ہزار روپے جو کیلوں کی طرح اس کے سینے میں چبھ رہے تھے اب انہیں چوہدری واپس لے لے گا۔ وہ ایک جھوٹے الزام سے محفوظ رہے گا۔ دوسری خوشی یہ تھی کہ چوہدری اس کا ساتھ دینے کے لیے تیار تھانے جا رہا تھا۔ یعنی اس نے اپنی ایمانداری سے چوہدری کو بھی ایماندار بنا دیا تھا۔ اور سب سے بڑی خوشی وہ تھی جو شروع جوانی سے انسان کا پیچھا کرتی ہے۔ اس کا پیچھا کرتے کرتے سہاگ کی سیج پر پہنچاتی ہے یعنی اب اس کی سکینہ اسے ملنے والی تھی۔ اس خیال سے ہی اس کے دماغ پر ایسا نشہ چھا رہا تھا کہ آس پاس کی دنیا سمجھ میں نہیں آ رہی تھی صرف سکینہ ہی سکینہ سمجھ میں آ رہی تھی۔

وہ کتنے صبر و تحمل کے عالم میں سامنے بیٹھا رہا یہ تو اس کا دل ہی جانتا تھا۔ خدا خدا کر کے ظہر کے وقت مجلس برخاست ہوئی۔ نماز پڑھنے کے

بعد چوہدری صاحب نے عالم صاحب کو مہمان خانے میں پہنچایا پھر ایمان علی کے ساتھ حویلی کے پیچھے چلتے ہوئے کہنے لگا ''تم اپنے ساتھ اپنے گھر والی کو بھی ساتھ لے چلو کیونکہ وہ بھی اس بات کی چشم دید گواہ ہے کہ امام دین یہاں سے پانچ میل دور نظر آیا تھا۔ تھانے میں اس کا بیان بھی ضروری ہے''۔

ایمان علی نے اپنے کچے مکان کے سامنے رک کر کہا۔

''تم یہاں ٹھہرو۔ میں ابھی اپنی گھر والی کو لے کر آتا ہوں''۔ جب وہ چوہدری کو دروازے پر چھوڑ کر اندر جانے لگا تو اس کا دل اتنی بری طرح دھڑک رہا تھا کہ اس کے دماغ میں دھماکے گونج رہے تھے۔ اب وہ ایسی عورت کے پاس نہیں جا رہا تھا جو پرائی کر دی گئی تھی، اب وہ سر سے پاؤں تک اس کی اپنی تھی۔ اس خیال سے ہی اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ جو اس کی بالکل اپنی تھی اس کے سامنے جاتے ہوئے دل گھبرا رہا تھا۔

جب وہ دوسرے کمرے میں پہنچا تو سکینہ چولہے کے پاس بیٹھی ابلتی ہوئی ہانڈی کو دیکھ رہی تھی۔ جلتی ہوئی لکڑی کے سامنے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ ایمان علی کو دیکھتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی اور چارپائی کی طرف اپنا دوپٹہ اٹھانے کے لیے بڑھنے لگی کیونکہ ایمان علی نے اسے تاکید کی تھی کہ اس کے سامنے دوپٹہ اچھی طرح اوڑھ کر رہا کرے۔ اس کے اور چارپائی کے درمیان ایمان علی کھڑا ہوا تھا۔ وہ اپنے سینے پر دونوں ہاتھوں کو قینچی بناتی ہوئی بولی۔

''ذرا ایک طرف ہو جا میں دوپٹہ اٹھاؤں گی''۔

ایمان علی اس سے بہت کچھ کہنا چاہتا تھا۔ اسے خوش خبری سنانا چاہتا تھا مگر اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اتنی ساری باتیں کس طرح زبان سے ادا کرے۔ وہ راستہ دینے کی بجائے چپ چاپ کھڑا سوچتا ہی رہ گیا۔ عورت سے زیادہ مرد کے بدلے ہوئے تیور کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ سکینہ کے دل میں فوراً ہی یہ بات آئی کہ مولوی کی نیت بدل گئی ہے۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔

''اللہ میاں سوا روپے کی نیاز دلاؤں گی، اس کی نیت بدل ہی جائے'' پھر اس نے شرماتے ہوئے ایمان علی سے کہا ''دوپٹہ نہیں دے گا؟''

ایمان علی نے پلٹ کر چارپائی سے دوپٹے کو اٹھا لیا پھر بے خیالی سے دوپٹے کو ملائمت سے مٹھی میں بھینچنے لگا۔ اس کے بعد بڑی مشکل سے ہچکچاتے ہوئے کہنے لگا۔

''وہ جو عالم صاحب آئے ہیں نا انہوں نے کہا ہے کہ.....''

''کیا کہا ہے؟''

''یہی کہ تو بالکل میری ہے اگر میں چاہوں تو تجھ سے دور نہیں رہ سکتا۔ اور میں کب دور رہنا چاہتا ہوں۔ مگر اب میرا دل گھبرا رہا ہے''۔

یہ کہتے ہی اس نے ایک ہاتھ سے سر کو تھام لیا جیسے جذبوں کے ہجوم میں چکرا رہا ہو۔ سکینہ نے فوراً ہی آگے بڑھ کر اسے سہارا دینے کے لیے تھام لیا۔ بس اتنا ہی سہارا کافی تھا۔ ایمان علی نے اپنا سارا بوجھ اس پر ڈال کر اپنا سر اس کے شانے پر رکھ دیا۔

چند لمحوں تک اسے ہوش نہ رہا کہ وہ کہاں ہے اور کس دنیا میں ہے؟ اس کے سینے کی دیوار سے کسی کے نازک دل کی دھڑکنیں ٹکراتی رہیں۔ وہ ان ٹکروں کو سمجھ رہا تھا اور سنبھل رہا تھا مگر اس کی قسمت میں پھسلنا نہیں تھا۔ چوہدری نے اسے باہر سے آواز دی۔

''مولوی کیا کر رہے ہو، باہر آؤ''۔

ایمان علی یک بیک ہڑبڑا کر سکینہ سے یوں الگ ہوا جیسے گناہ کرتے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو۔

سکینہ نے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے ناگواری سے کہا۔

''یہ چوہدری کہاں سے مرنے آ گیا''۔

ایمان علی چارپائی پر بیٹھا ہانپ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے بہت دور سے دوڑتا ہوا آ رہا ہو۔ زندگی کی دھوپ میں دوڑتے دوڑتے کبھی ایسی حالت نہ ہوئی تھی۔ تعجب ہے کہ زندگی کی دھوپ میں کچھ نہ ہوا زلفوں کی چھاؤں میں ہانپ گیا۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''ابھی چوہدری ہمارے ساتھ تھانے جائے گا، تو بھی ساتھ چلے گی''۔

''ہم تھانے کیوں جائیں گے؟''

ایمان علی اسے بتانے لگا کہ کس طرح چوہدری اپنے دو ہزار روپے واپس لے لے گا۔ پھر ان پر چوری اور قتل کا الزام نہیں آئے گا اور وہ لوگ تھانے میں جا کر کس طرح بیان دیں گے۔ سکینہ نے مایوسی سے پوچھا۔

''کیا ابھی جانا ضروری ہے؟ چوہدری سے کہہ دو تھوڑی دیر بعد جائیں گے''۔

''آں'' ایمان علی نے اس کی باتوں کو سمجھتے ہوئے سر اٹھا کر دیکھا تو وہ بھری ہوئی بندوق کی طرح کھڑی ہوئی تھی مگر وہاں سے پھر چوہدری نے آواز دی۔ وہ جلدی اٹھتے ہوئے بولا ''جی ابھی آ رہا ہوں'' پھر اس نے دھیمی آواز میں سکینہ سے کہا ''اگر ہم ابھی نہیں جائیں گے تو ہو سکتا ہے کہ چوہدری کا ارادہ بدل جائے۔ ہم ابھی ایک دو گھنٹے میں واپس آ جائیں گے۔ اس وقت ہمارے دل و دماغ سے بہت سے بوجھ اتر جائیں گے۔ چوہدری اپنے دو ہزار روپے واپس لے لے گا اور میں چوری اور قتل کے الزام سے بری ہو جاؤں گا''۔

یہ بات سکینہ کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ نیک بخت بھی یہی چاہتی تھی کہ کسی طرح اس کا ایمان ان مصیبتوں سے نجات حاصل کرے۔ اس نے اپنے من کو مار کر چادر اٹھائی پھر اس میں خود کو اچھی طرح چھپائی ہوئی ایمان علی کے پیچھے چلنے لگی۔ جب دونوں مکان سے باہر آئے تو چوہدری کے ساتھ اس کا ایک اور ملازم کھڑا ہوا تھا۔ وہ چاروں تھانے کی طرف جانے لگے۔ تھانہ وہاں سے چھ میل کے فاصلے پر تھا۔ وہ پنڈ سے نکل کر کھیتوں کے درمیان سے گزرنے لگے۔ دو میل کے بعد کھیتوں کا سلسلہ ختم ہو گیا، گھنے درختوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک میل کا فاصلہ اور طے کرنے کے بعد چوہدری نے رک کر چاروں طرف دیکھا۔ دور دور تک ویرانی تھی۔ وہاں سے کسی اور آدم زاد کے گزرنے کی توقع نہ تھی۔ جب چوہدری نے چاروں طرف مطمئن ہو کر ایمان علی کو دیکھا تو اس کے تیور بدل چکے تھے۔ اس نے سخت لہجے میں کہا۔

''مولوی میں نے تیری قبر کے لیے یہی جگہ پسند کی ہے''۔ چوہدری کے منہ سے یہ بات نکلتے ہی اس کے ملازم نے بڑا سا چھرا نکال لیا۔ ایمان علی نے گھبرا کر پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

''یہ..... یہ کیا؟ کیا تم مجھے مار ڈالنا چاہتے ہو؟ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟''

چوہدری نے غصے سے کہا۔

''تو جب سے یہاں آیا ہے، میرا کام بگڑتا ہی جا رہا ہے۔ ابے او ایماندار کے بچے، کیا تجھے میرے ہی پنڈ میں آنا تھا۔ جب تک تو زندہ رہے گا اس وقت تک میرے سامنے پھانسی کا پھندا لٹکتا رہے گا''۔

''جب تم نے اپنے بھائی کو قتل نہیں کیا ہے تو تمہیں کون پھانسی پر چڑھائے گا؟ تمہیں خدا پر بھروسہ.....''

''خدا پر بھروسہ کرنے سے میں سزا سے نہیں بچ سکوں گا۔ تیری سچائی مجھے لے ڈوبے گی۔ پولیس والے تیرے بیان سے یہ سمجھ لیں گے کہ میں امام دین کا قاتل ہوں اور یہ غلط بھی نہیں ہے۔ میں نے اسے قتل کر ڈالا ہے''۔

ایمان علی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ چوہدری نے حقارت سے کہا ''اوئے ایمان والے بے وقوف تو بے ایمانی کی دنیا میں آ کر ایمان کی بات کرتا ہے؟ بے وقوف تو جس زمین پر بیٹھ کر پنڈ کے بچوں کو کلام پاک کی تعلیم دیتا ہے، اسی زمین کے نیچے امام دین دفن کیا گیا ہے۔ تو جب پہلی بار حویلی کے پیچھے آیا تھا تو اس سے ایک گھنٹہ پہلے ہی اس زمین کے نیچے امام دین کو دفن کر کے اس زمین کو لیپ پوت کر برابر کر رہے تھے۔ پہلے میرا ارادہ تھا کہ وہاں بھینس باندھوں گا پھر میرے ذہن میں یہ تدبیر آئی کہ وہاں تجھے باندھ کر رکھوں گا تو پولیس والے کبھی شبہ نہیں کریں گے۔ جہاں کلام پاک کی تعلیم دی جاتی ہے اس کے نیچے میرے بھائی کی لاش پڑی ہوئی ہے''۔

کامیاب منصوبہ بندی کے تصور سے قاتل چوہدری کا چہرہ دمک رہا تھا کیونکہ وہ دو چشم دید گواہ ایمان علی اور سکینہ کو ہمیشہ کے لئے اس جگہ دفن کرنے والا تھا۔ اس نے اپنے ملازم سے کہا ''اوئے دیکھتا کیا ہے ختم کر دے اس ایمان کے بچے کو''۔ اس کا حکم سنتے ہی ملازم نے ایمان علی پر چھرے سے حملہ کیا۔ ایمان علی سہم کر بھاگ نہ سکا۔ صرف ذرا سا کترا کر ایک طرف ہو گیا جس کے باعث چھرا سینے کی طرف آنے کی بجائے شانے کو زخمی کرتا ہوا گزر گیا۔ بے ایمان کے ہاتھوں ایمان کا لہو اچھل پڑا، وہ زخم کی تاب نہ لا کر زمین پر گر پڑا۔ ملازم نے چھرے کو دوبارہ ہتھیلی میں تول کر اس پر حملہ کرنا چاہا مگر اسی وقت اس کی آنکھوں میں تارے ناچ گئے۔ وہ لوگ سکینہ کو ایک کمزور عورت سمجھ کر بھول گئے تھے۔ سکینہ نے ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا تھا۔ ملازم کے ہاتھ سے چھرا گر پڑا۔ سکینہ نے پتھر پھینک کر فوراً ہی چھرا اٹھا لیا مگر وہ دشمنوں پر حملہ نہ کر سکی۔ چوہدری اسے پکڑنے کے لئے آگے بڑھ رہا تھا۔ وہ چھرا لے کر بھاگتی ہوئی چیخنے لگی۔

''بچاؤ، بچاؤ، میرے ایمان کو بچاؤ۔ کوئی خدا کا بندہ ہے، میرے سہاگ کو بچاؤ''۔

وہ چیختی ہوئی بھاگ رہی تھی۔ چوہدری اس کے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ ملازم کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔ سر پر ایسی چوٹ پڑی تھی، وہ سنبھل نہ سکا لیکن گرتے گرتے بھی اس نے ایمان علی کی گردن دبوچ لی تھی۔ ایمان علی کا شانہ اور ایک ہاتھ بیکار ہو چکا تھا۔ وہ دوسرے ہاتھ سے اسے پرے ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔ دونوں ہی زخمی تھے، دونوں ہی کمزور تھے۔ کمزوری کے باوجود ملازم نے سکینہ کے ہاتھ سے گرا ہوا پتھر اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا۔

اسی وقت سکینہ چوہدری کو اپنے پیچھے دوڑاتی ہوئی واپس آ رہی تھی۔ اس نے ایمان علی پر دوبارہ حملہ ہوتے دیکھ کر اسی چھرے سے ملازم پر حملہ کر دیا۔ چھرے کا پھل دستے تک ملازم کی پشت میں اتر گیا پھر وہ فوراً ہی چھرے کو پشت سے نکال کر پلٹ گئی اور چوہدری کے سامنے تن کر کھڑی

ہوگئی۔ چوہدری اس کے قریب پہنچنے سے پہلے ٹھٹک کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے سامنے دیہات کے ماحول میں پلی ہوئی ایک شیرنی کھڑی تھی۔ کسا ہوا بدن تھا، مضبوط کلائیاں تھیں، زمین کھودنے والی فولادی انگلیوں میں خون آلود چھرا چوہدری کو چیلنج کر رہا تھا۔

''میں ایمان کے قاتلوں کو زندہ نہیں چھوڑوں گی'' وہ چیختی ہوئی چوہدری کی طرف لپکی۔ چوہدری یک بیک پلٹ کر بھاگنے لگا مگر وہ ہانپتی ہوئی پیچھا کرتی رہی۔ چوہدری کو جان کے لالے پڑے ہوئے تھے، وہ تیزی سے بھاگتا ہوا اس سے بہت دور نکل گیا تھا۔ پھر جب وہ نظروں سے اوجھل ہوگیا تو سکینہ تھک کر گر پڑی۔ ایمان علی کو پتہ نہیں تھا کہ وہ خود کہاں گم ہوگیا ہے۔ وہ اس دنیا میں تھوڑی دیر کے لئے مر چکا تھا۔ کبھی کبھی انسان اسی طرح وقتی طور پر مر جاتا ہے۔ ساری دنیا کے مصائب سے تھوڑی دیر کے لئے نجات حاصل کر لیتا ہے۔ پھر یہ دنیا اسے اپنی طرف بلا لیتی ہے۔ جب اسے دوبارہ زندگی ملی تو وہ آہستہ آہستہ آنکھیں کھول کر اپنے آس پاس کے ماحول کو دیکھنے لگا۔ وہ ایک اسپتال کے بستر پر پڑا ہوا تھا لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کہاں ہے؟ اس کے ذہن پر دھند چھائی ہوئی تھی، آنکھوں کے سامنے دھندلے سے مناظر تھے۔ سفید دیواریں اور کچھ دھندلے سے چہرے نظر آرہے تھے جو اس پر جھکے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھ کھلتے ہی ایک چہرہ اور قریب آگیا۔ وہ کسی کو پہچان نہیں رہا تھا بس کچھ کچھ محسوس کر رہا تھا کہ وہ ایک ملائم بستر پر ہے اور کوئی اس کی نبض ٹٹول رہا ہے۔ ایک خوبصورت چہرہ اس پر جھکا ہوا ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے ہیں۔ پھر کسی نے کہا۔

''دور ہٹ جاؤ، ابھی مریض کے قریب نہ جاؤ۔ جب یہ پوری طرح ہوش میں آجائے گا تو میں آپ لوگوں کو باتیں کرنے کی اجازت دے دوں گا''۔

وہ روتا ہوا حسین چہرہ سکینہ کا تھا۔ وہ پیچھے ہٹ گئی کیونکہ ایمان علی اسے پہچان نہیں رہا تھا اور ڈاکٹر بھی کہہ رہا تھا کہ مریض کو ابھی مخاطب نہ کیا جائے۔ اس کے بستر کے دوسری طرف پولیس انسپکٹر بھی کھڑا تھا لیکن ڈاکٹر کی اجازت کے بغیر اس کا بیان نہیں لے سکتا تھا۔ پھر وہ بیان دینے کے قابل بھی نہیں تھا، اس پر نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری تھی۔ وہ اسی طرح کبھی سوتا کبھی جاگتا رہا۔ رات اور دن گزرتے رہے، اسے اس بات کا ہوش نہ تھا کہ اس نے کتنی بار آنکھیں کھولیں اور کتنی بار بے ہوشی کی نیند سوتا رہا۔ دو ہفتے بعد اس کی طبیعت کسی حد تک سنبھل گئی۔ آنکھیں کھول کر پوری طرح ہوش میں آنے کے بعد اس نے سکینہ کو دیکھا۔ اپنے مجازی خدا کو ہوش میں آتے دیکھ کر اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا تھا۔ وہ بے اختیار خدا کا شکر ادا کر رہی تھی اور اس کے ہاتھ کو تھام کر خوشی سے کانپ رہی تھی۔ ایمان علی نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ تو ہسپتال ہے میں یہاں کیسے پہنچ گیا؟''

سکینہ ذرا اس کے قریب اور کھسک آئی اور اسے بتانے لگی۔

''پولیس والے تجھے یہاں لے کر آئے ہیں۔ میں نے چوہدری دین محمد کے ملازم کو چھرے سے زخمی کر کے بے ہوش کر دیا تھا ورنہ وہ تجھے زندہ نہ چھوڑتا''۔

ایمان علی نے شدید حیرانی سے پوچھا ''تو نے ایک عورت ہو کر اتنے ہٹے کٹے ملازم کو کیسے زخمی کر دیا؟ کیا چوہدری نے تجھے نہیں پکڑا؟''

''چوہدری تو بڑا بزدل نکلا۔ اپنے ملازم کو بے ہوش ہوتے دیکھ کر یہ سمجھا کہ وہ مر چکا ہے۔ اس وقت میری آنکھوں میں خون اتر آیا تھا۔ وہ میرے ہاتھ میں خون آلود چھرا دیکھ کر بھاگ گیا۔ میں نے تجھے ہوش میں لانے کی بہت کوشش کی مگر تو بالکل مردہ پڑا ہوا تھا۔ میں گھبرا گئی۔ میری سمجھ میں یہی آیا کہ میں فوراً ہی کسی کی مدد حاصل کروں۔ اس خیال سے میں اندھا دھند ایک طرف دوڑتی چلی گئی۔ پتا نہیں کتنی دیر تک دوڑتی رہی اور لوگوں کو مدد کے لئے پکارتی رہی۔ آخر ایک چھوٹی سی بستی میں پہنچ کر گر پڑی۔ وہاں کی عورتوں نے مجھے سہارا دیا، بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ میں نے ہانپتے کانپتے ساری بات بتائی۔ کچھ لوگ ریڑھا لے کر اس ویرانے میں گئے پھر تجھے اور اس بے ہوش ملازم کو اس پر لاد کر تھانے پہنچا دیا۔ جب تک میں تھانے دار کو تمام واقعہ سناتی رہی، دوسرے پولیس والے تیری اور اس ملازم کی مرہم پٹی کرتے رہے۔ جب تجھے ہوش میں لانے میں ناکامی ہوئی تو تجھے گاڑی میں ڈال کر شہر کے اس بڑے ہسپتال میں پہنچا دیا۔

ایمان علی بڑی محبت اور عقیدت سے اپنی شریک حیات کو دیکھ رہا تھا۔ وہ صحیح معنوں میں شریک حیات کا مفہوم ادا کر رہی تھی اور اسے بتا رہی تھی۔

''دوسری طرف تھانے دار مجھے لے کر جمال والا گیا۔ ہم عین وقت پر وہاں پہنچے، اگر ذرا بھی دیر ہو جاتی تو چوہدری اپنے بھائی کی لاش کو غائب کر دیتا۔ تو جس کمرے میں بیٹھ کر دینی تعلیم دیا کرتا تھا، وہ اس کمرے کے فرش کو کھود کر امام دین کی لاش کو نکالنا چاہتا تھا۔ اس کے دو راز دار ملازم ایک بڑا سا صندوق لے کر آئے تھے تاکہ اس میں لاش کو چھپا کر دوسری جگہ لے جائیں مگر وہ عین وقت پر پکڑے گئے۔

تھانیدار بہت ہی ایماندار آدمی نکلا، چوہدری نے قانون سے بچنے کے لئے اسے ہزاروں روپے کا لالچ دیا لیکن اس نے رشوت قبول نہیں کی۔ اس کو دونوں ملازموں سمیت ہتھکڑیاں پہنا کر تھانے لے گیا۔ اب وہ جیل میں ہے۔ اس پر مقدمہ چلنے والا ہے۔ میں نے اس کے ایک ملازم پر چھرے سے حملہ کیا تھا، اس لیے مجھے بھی حوالات میں بند کر دیا گیا''۔ ایمان نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ''کیا تو حوالات میں رہ کر آئی ہے؟''

''ہاں، وہاں بھی چادر اڑھ کر رہتی تھی۔ میں نے ہر حال میں پردے کو قائم رکھا ہے''۔

''میں جانتا ہوں تو کتنی وفادار ہے۔ میرے ہر حکم کی تعمیل کرتی ہے مگر تو حوالات سے باہر کیسے آئی؟ کس نے تیری ضمانت لی ہے؟''

''ہم دونوں کا اس دنیا میں کون ہے؟ کوئی ایسا نہیں جو آڑے وقت ہمارے کام آئے۔ تھانیدار مجھ سے بہت متاثر ہے لیکن اس کی ضمانت قبول نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے ڈاکٹر کو ساری داستان سنائی کہ تو ایمان کی خاطر کتنی کڑی آزمائشوں سے گزر رہا ہے اور میں کس طرح ساتھ دے رہی ہوں۔ اس رحم دل ڈاکٹر نے کہا کہ میں سچائی کا ساتھ دوں گا۔ جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا خدا ہوتا ہے مگر دوسرے بندوں کو بھی کچھ اپنا فرض نبھانا چاہیے۔ اس نے اپنا فرض نبھا دیا اور کورٹ سے میری ضمانت لے لی۔ اب میں اسی کی پناہ میں ہوں، وہ مجھے بیٹی کہتا ہے اور اس کے بیوی بچوں کے ساتھ رہتی ہوں''۔

اس کی باتیں سننے کے بعد ایمان علی نے ایک گہری سانس لے کر کہا ''ایمان کے سفر پر نکلو تو کہیں نہ کہیں شریک سفر مل ہی جاتے ہیں۔ پہلے تو ملی، اب تھانیدار اور ڈاکٹر مل گئے۔ انسان کو ہمت نہیں ہارنی چاہیے کیونکہ سچائی کبھی ضائع نہیں ہوتی۔ اس کا انعام ضرور ملتا ہے خواہ دیر سے ملے۔ آخر چوہدری ثبوت کے ساتھ پکڑا گیا''۔

سکینہ نے اس کی ہتھیلی کو محبت سے سہلاتے ہوئے کہا ''تیرے جیسے مسلمان ہی ایمان کے لیے قربان ہو سکتے ہیں۔ ایمان کی سلامتی کے لیے ایک باپردہ عورت ہو کر حوالات میں چلی گئی اور تیری حالت یہ ہو گئی تھی کہ تیرے بدن میں خون کا قطرہ تک نہ رہا تھا۔ تجھے تین بار خون دیا گیا تب کہیں جا کر تو نے آنکھ کھولی ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ تو اب باتیں کرنے کے قابل ہو گیا ہے۔ میں تھانیدار کو بلا کر لاتی ہوں، وہ تیرا بیان لینے کے لئے کئی بار یہاں آیا اور تجھے بے ہوش دیکھ کر واپس چلا گیا۔ میں ڈاکٹر صاحب کو جا کر کہتی ہوں کہ تو ہوش میں آ گیا ہے''۔

وہ تھوڑی دیر تک اس کی ہتھیلی کو محبت سے ہولے ہولے سہلاتی رہی پھر جلدی ہی واپس آنے کا وعدہ کر کے وہاں سے چلی گئی۔ ایمان علی تنہا بستر پر پڑا گردش کرتے ہوئے چھت کے پنکھے کو دیکھتا رہا اور گردش حالات پر غور کرتا رہا۔ سکینہ جلد ہی واپس آنے کا وعدہ کر کے گئی تھی لیکن وعدے کے مطابق نہیں آئی۔ شام کو ڈاکٹر نے آ کر اس کا معائنہ کیا پھر سکینہ کے بارے میں دریافت کیا ''تمہاری گھر والی کہاں ہے؟ وہ دوپہر کو مجھ سے اجازت لے کر یہاں تم سے ملنے آئی تھی''۔

''وہ تو دوپہر کو ہی یہ کہہ کر گئی تھی کہ آپ کو اور تھانیدار کو بلا کر لائے گی''۔

''مگر وہ میرے پاس تو نہیں آئی۔ میں دوپہر کو ڈیوٹی پر نہیں تھا، اپنے گھر پر تھا۔ اسے فوراً ہی میرے پاس آنا چاہیے تھا''۔

''تو پھر تھانیدار کے پاس گئی ہو گی''۔

''تھانیدار اس شہر سے بیس میل دور رہتا ہے۔ میں نے سکینہ کی ضمانت لی ہے، اسے تنہا کہیں جانے نہیں دیتا تھا۔ پھر وہ اتنی دور کیسے جائے گی، وہ اتنی نادان نہیں ہے کہ مجھ سے ملے بغیر چلی جائے''۔

کتاب گھر کا پیغام

آپ تک بہترین اردو کتابیں پہنچانے کے لیے، ہمیں آپ ہی کے تعاون کی ضرورت ہے۔ ہم کتاب گھر کو اردو کی سب سے بڑی لائبریری بنانا چاہتے ہیں، لیکن اس کے لیے ہمیں بہت ساری کتابیں کمپوز کروانا پڑیں گی اور اسکے لیے مالی وسائل درکار ہوں گے۔

اگر آپ ہماری براہ راست مدد کرنا چاہیں تو ہم سے kitaab_ghar@yahoo.com پر رابطہ کریں۔ اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو کتاب گھر پر موجود ADs کے ذریعے ہمارے سپانسرز ویب سائٹس کو وزٹ کیجئے، آپکی یہی مدد کافی ہو گی۔

یاد رہے، کتاب گھر کو صرف آپ بہتر بنا سکتے ہیں۔

ڈاکٹر پریشانی سے بڑبڑاتا ہوا کمرے سے باہر جانے لگا۔ ایمان علی نے باہر جانے تک اس کی آواز سنی وہ کہہ رہا تھا ''تین گھنٹے گزر گئے، وہ کہاں جاسکتی ہے؟ اگر کہیں چلی گئی تو میں مصیبت میں پڑ جاؤں گا''۔ اس کی بڑبڑاہٹ نے ایمان علی کو پریشانی میں مبتلا کر دیا۔ اس نے اپنے دل کو تسلی دی، بھلا وہ کہاں جائے گی۔ ایسی وفادار شریک حیات مجھے ایسی حالت میں چھوڑ کر کبھی تھوڑی دیر کے لئے بھی کہیں نہیں جائے گی مگر بہت دیر ہوگئی ہے۔

اس نے بڑے اضطراب سے کروٹ بدلنی چاہی مگر بدن سے اٹھنے والی ٹیسوں نے اسے سمجھایا کہ اس کا ایک شانہ بری طرح زخمی ہے۔ وہ صرف چاروں شانے چت لیٹا رہ سکتا ہے۔ پہلوان جیسی زندگی نے اسے پچھاڑ دیا۔ وہ شکست خوردہ انداز میں پھر گردش کرتے ہوئے پنکھے کو دیکھنے لگا۔

شام کے بعد رات آئی تو پریشانی اور بڑھ گئی کیونکہ سکینہ واپس نہیں آئی تھی۔ تھانیدار آ گیا تھا، وہ بھی سکینہ کی گمشدگی سے پریشان ہوگیا۔ وہ جلدی جلدی ایمان علی کا بیان لے کر سکینہ کی تلاش میں چلا گیا۔ ایمان علی اور ڈاکٹر کا سکون برباد ہوگیا۔ سچائی کی جیت ہو رہی تھی مگر سچوں کو عذاب میں مبتلا کر رہی تھی۔

رات سے صبح ہوگئی، صبح سے پھر شام ہوگئی۔ دن اور رات اپنے دستور کے مطابق گزرتے رہے۔ سکینہ کہاں چلی گئی تھی کچھ پتہ نہ تھا۔ تھانیدار، ڈاکٹر زکو روز تسلیاں دیتا تھا کیونکہ وہ سکینہ کا ضامن تھا لیکن ایمان علی اس کی ساری زندگی کا ضامن تھا۔ اس کی تسلی نہیں ہو رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ وہ کسی کا کچھ نہیں بگاڑتا تھا مگر دنیا والے اسے بگاڑتے جا رہے تھے۔ وہ کسی سے دولت اور جائیداد نہیں مانگتا تھا۔ جو چھوٹی چھوٹی سی سیدی سادی مسرتیں اس کی زندگی میں آئی تھیں، لوگ وہ بھی چھین رہے تھے۔

کئی دن بیت گئے۔ وہ بستر پر لیٹا ہوا بڑی بے بسی سے بڑبڑاتا رہتا تھا، میں کیا کروں؟ یہاں سے کیسے اٹھ کر جاؤں؟ اٹھ کر بیٹھتا ہوں تو زخموں سے ٹیسیں اٹھنے لگتی ہیں دو قدم چلنے کی ہمت نہیں، نہ جانے سکینہ کتنے قدم آگے نکل گئی ہے؟

ڈاکٹر الگ پریشانی میں مبتلا تھا۔ اس کے پاس آ کر کہتا تھا ''لوگ اسی لیے سچ بولنے سے گھبراتے ہیں۔ سکینہ سچ بول کر اور ایک قاتل کو گرفتار کرانے کے بعد کسی مصیبت میں پھنس گئی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ دشمن کے آدمیوں نے اسے اغوا کر لیا ہے۔ سکینہ کی ضمانت لینے کے لئے میں نے اپنے مکان کے کاغذات جمع کرائے تھے اگر وہ نہ ملی تو میرا مکان ضبط ہو جائے گا۔ یعنی میں تقریباً اسی ہزار روپے کا نقصان اٹھانے والا ہوں''۔ اس کی باتیں سن کر ایمان علی کا سر جھک جاتا تھا۔ وہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی بڑی آزمائشوں میں مبتلا کر رہا تھا مگر وہ کیا کر سکتا تھا؟ کیسا برا وقت آ گیا تھا کہ جو لوگ بھی ایمان کا سفر جاری رکھیں گے، انہیں اسی طرح ذلیل کیا جائے گا اور نقصان پہنچایا جائے گا۔

ایک ماہ کے بعد وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوگیا لیکن سکینہ کی تلاش میں وہاں سے نہ جا سکا کیونکہ چوہدری دین پر مقدمہ چل رہا تھا لہٰذا فیصلہ ہونے تک اسے ایک چشم دید گواہ کی حیثیت سے وہاں موجود رہنا تھا۔ تھانیدار نے اسے یقین دلایا کہ دو چار پیشی میں فیصلہ ہو جائے گا پھر وہ جہاں چاہے جا سکتا ہے مگر وہ کئی ماہ تک پیشیاں بھگتنے پر مجبور ہوگیا۔ اسی طرح ایک سال گزر گیا۔ دوسرے سال چوہدری دین محمد کو سزائے موت سنا دی گئی مگر ایمان علی تو ڈیڑھ سال کے عرصے میں بے موت مر گیا تھا۔ عبادت کے بعد کوئی ایسا وقت نہ تھا جب وہ سکینہ کو یاد نہ کرتا ہو۔ اکثر عورتیں اپنے حسن کا جادو جگا کر یا اپنے جسم کی سوغات پیش کر کے مرد کے ذہن میں نقش ہو جاتی ہیں۔ لیکن سکینہ نے کچھ نہیں دیا تھا۔ محض اس کا حسن وفا تھا جو ایمان

علی کے ذہن سے مٹنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

وہ امام دین کے قتل کے کیس میں اپنا بہت کچھ ہار کر پھر انجانی منزل کی طرف چل پڑا۔ اگرچہ ڈاکٹر نے وہاں کی ایک مسجد میں اس کا ٹھکانہ بنا دیا تھا مگر اب اس کی زندگی میں محض عبادت نہیں تھی، اپنی گمشدہ محبت کی جستجو بھی تھی۔ وہ آگے بڑھتا ہوا خدا کی زمین پر سجدے کرتا گیا اور اپنی محبت کو تلاش کرتا رہا۔ اسی طرح حالات کی ٹھوکریں کھاتا ہوا کراچی پہنچ گیا۔ وہاں کئی دن فاقے کرتا رہا، کبھی ایک وقت کی روٹی مل جاتی کبھی پانی ہی پر گزارہ کرنا پڑتا۔ سکینہ کی عدم موجودگی نے اسے مایوسی میں مبتلا کر دیا تھا کہ وہ اب کبھی نہیں ملے گی۔ چلتے پھرتے چادر میں لپٹی ہوئی کسی عورت کو دیکھ کر وہ ٹھٹک جاتا تھا۔ ایک ساعت کے لیے یوں لگتا جیسے وہ ابھی آنکھ مچولی کھیل کر آ رہی ہو۔ وہ ایمان علی جو نظر اٹھا کر پرائی عورت کو نہیں دیکھتا تھا، وہ چادر والیوں کو بے اختیار دیکھنے پر مجبور ہو جاتا تھا۔ لیکن دیکھتے وقت نیت میں کھوٹ نہیں ہوتا تھا۔

کئی دنوں کے بعد اسے ایک مسجد میں ٹھکانہ مل گیا۔ وہ مسجد ایک چھوٹے سے علاقے میں تھی۔ وہاں پکے مکانات کم تھے، جھگیاں زیادہ تھیں۔ وہاں کی مسجد کمیٹی نے اسے مسجد کا پیش امام بنا دیا تھا۔ مسجد کے لیے جو چندہ جمع ہوتا تھا، وہ کمیٹی کے صدر محمد رکن الدین کے پاس امانت کے طور پر رکھا جاتا تھا۔ رکن الدین ایماندار آدمی تھے، ان کے پاس دولت کی کمی نہ تھی یہی وجہ تھی کہ وہ مسجد کی امانت میں خیانت کرنے کی بجائے وہاں کی رقم میں اپنی طرف سے اضافہ کیا کرتے تھے۔ اسی رقم سے ایمان علی کو تین وقت کی روٹیاں ملتی تھیں۔

ایمان علی کا یہ دستور ہو گیا تھا کہ وہ صبح کی نماز پڑھانے کے بعد اس بڑے شہر کی شاہراہوں اور گلیوں میں گھومنے کے لیے نکل جاتا تھا۔ لوگ روزگار کے لیے یا تفریح کے لیے گھومنے نکلتے ہیں، وہ سکینہ کی تلاش میں نکلتا تھا۔ جدائی اور انتظار میں ایسا ہوتا ہے آس ٹوٹتی ہے پھر بندھتی ہے اور پھر ٹوٹتی ہے۔ سوچ کے ایک ساحل سے دوسرے ساحل تک دوڑاتی رہتی ہے۔ جس کا انتظار ہو اس کے مرنے کا یقین کر لیا جائے تو وہ یقین پائیدار نہیں ہوتا۔ انتظار کرنے والے کو کروٹ کروٹ ہر آہٹ پر چونکاتا ہے کہ وہ آ گئی میری چادر والی ''آہ سکینہ تو کہاں ہے ملتی کیوں نہیں؟ اگر تو دنیا میں نہیں ہے تو مجھے اس زمین کا پتہ ہی معلوم ہو جائے جہاں تو گہری نیند سو رہی ہے''۔

''میرے معبود! میں نے تجھ سے کبھی کچھ نہیں مانگا کیونکہ تو مجھے مانگے بغیر میری ضرورت کے مطابق دیتا آ رہا ہے مگر تو نے اب میرے دل میں سکینہ کی محبت اور اس کی ضرورت پیدا کی ہے تو اب میں گڑگڑا کر مانگتا ہوں کہ میری سکینہ مجھے واپس کر دے۔ واپس نہیں کرتا تو اس کی موت کا یقین دلا دے''۔ دعا اور دوا کبھی دیر سے اثر کرتی ہے، کبھی جلدی اثر کرتی ہے۔ وہ سمجھتا تھا کہ صبر کا پھل ملتا ہے۔ آج نہیں تو کل اس کی دعا ضرور قبول ہو گی۔ بندے کو خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ وہ خود کو اسی طرح تسلیاں دیتا ہوا اس کا انتظار کیے جا رہا تھا۔

رمضان کا مہینہ آیا تو تراویح کے باعث اس کی مصروفیت بڑھ گئی۔ صبح کی نماز کے بعد وہ اس قدر تھک جاتا تھا کہ سکینہ کی تلاش میں نہیں نکل سکتا تھا۔ مایوسی سے سوچ کر رہ جاتا کہ دو سال کی مسلسل تلاش کے بعد بھی مجھے اس کا سایہ نظر نہیں آیا۔ چلتے چلتے میری دو جوتیاں پھٹ گئی ہیں، پاؤں کے تلووں میں راستے کے کنکر اور کانٹے چبھنے لگے ہیں۔ اب روزے رکھ کر چلنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ کیا میں تھک ہار کر بیٹھ جاؤں؟ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ ایک رات وہ سحری کے وقت کھانا کھا کر مسجد میں آ گیا۔ فجر کی اذان کا وقت ہو رہا تھا۔ وہ اس چھوٹی سی مسجد کا پیش

امام بھی تھا اور موذن بھی۔ وہ اذان دینے کے لئے مسجد کے چبوترے پر آیا تو اسی وقت مسجد کمیٹی کے صدر رکن الدین کا ملازم دوڑتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ اس نے ہانپتے ہوئے کہا۔

''مولوی صاحب! ذرا ٹھہر جایئے آپ ابھی اذان نہ دیں۔ صاحب ابھی سحری کر رہے ہیں''۔

ایمان علی نے چبوترے پر چڑھتے ہوئے کہا۔

''سحری کا وقت ختم ہو چکا ہے۔ اب نماز کا وقت ہے۔ اگر کوئی دیر سے سحری کرے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نماز بھی دیر سے پڑھی جائے''۔ یہ کہتے ہی اس نے اذان کے لئے بلند آواز سے ''اللہ اکبر'' کہہ دیا۔ ملازم کو مزید کچھ کہنے کا موقع نہ ملا وہ اسے غصے سے دیکھتا ہوا چلا گیا۔ فجر کی نماز کے بعد جب دن نکل آیا تو کمیٹی کے صدر صاحب نے ایمان علی کو اپنے مکان میں طلب کیا۔ ایمان علی وہاں پہنچا تو رکن الدین اپنے کمرے میں غصے سے ٹہل رہا تھا۔ اس نے ایمان علی کے سلام کا جواب جھٹکے سے دیتے ہوئے کہا ''مولوی صاحب! مسجد کی گھڑی پندرہ منٹ آگے ہے۔ میں نے اپنے ملازم سے کہلا بھیجا تھا کہ آپ پندرہ منٹ کے بعد اذان دیں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کی وجہ سے سحری نہیں کر سکا۔ صرف ایک گلاس پانی پی کر روزہ رکھا ہے''۔

ایمان علی نے جواب دیا ''جناب میں برسوں سے پانچوں وقت کی نماز پڑھتا آ رہا ہوں۔ نماز کے لیے میں کسی گھڑی کا محتاج نہیں ہوں۔ مجھے دن کے وقت دھوپ اور چھاؤں سے اور فجر کے وقت صبح کاذب کی ہلکی سی جھلک سے نماز کا صحیح وقت معلوم ہو جاتا ہے۔ ہماری مسجد میں جو گھڑی عطیہ کے طور پر دی گئی ہے، وہ پتا نہیں کس زمانے کی ہے، ہمیشہ رک رک جاتی ہے۔ کبھی صحیح وقت نہیں بتاتی''۔

''کیا آپ چاہتے ہیں کہ اس گھڑی کی طرح میں نماز کے وقت بھی روک دیا کروں''۔

''تم مسجد کی گھڑی کا رونا رو رہے ہو حالانکہ میں نے اپنی گھڑی سے تمہیں صحیح وقت بتایا تھا''۔

''نماز کے وقت کے مطابق آپ کی گھڑی کا وقت بھی صحیح نہیں تھا'' رکن الدین نے اپنی بائیں کلائی کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

''یہ چھ سو روپے کی واٹر پروف اور شاک پروف گھڑی ہے، یہ صحیح وقت بتاتی ہے''۔

''آپ گھڑی کا مول نہ بتائیں۔ خریدنے اور بیچنے والی چیزوں میں کبھی کبھی کھوٹ بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ نماز کبھی خریدی نہیں جاتی ہے۔ خدا اور بندے کے درمیان یہ دنیا کا واحد سودا ہے جو بغیر پیسے کے طے ہوتا ہے۔ بے پیسے کی نماز دنیا کا سکون اور عاقبت کے لئے ذریعہ نجات ہے۔ مجھے افسوس نہیں ہے کہ میں آپ کی خاطر پندرہ منٹ دیر سے اذان نہ دے سکا، میں صرف آپ کو سمجھا سکتا ہوں کہ روزہ اور نماز وقت کی پابندی سکھاتے ہیں۔ آپ کو بھی وقت کی پابندی کرنا چاہیے''۔

رکن الدین نے غصے سے ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔

''اچھا بس کرو۔ جاؤ یہاں سے مجھے تمہاری نصیحتوں کی ضرورت نہیں ہے''۔

ایمان علی وہاں سے چلا آیا۔ ایک ہفتہ تک رکن الدین کی طرف سے گہری خاموشی رہی۔ ایمان کے پچھلے تجربات اسے سمجھا رہے تھے کہ

اس کی ایمانداری پھر اسے کسی مصیبت میں مبتلا کرنے والی ہے۔ اس کا ذہن بری طرح الجھا ہوا تھا۔ سکینہ کی گمشدگی نے اسے پہلے ہی توڑ کر رکھ دیا تھا، اب رکن الدین کی ناراضگی اسے اور بھی توڑ رہی تھی۔

ایک رات تراویح پڑھاتے وقت اس سے کہیں غلطی ہوگئی۔ پیچھے کھڑے ہوئے نمازی نے اسے لقمہ دیا۔ ایمان علی نے فوراً ہی اس لقمے کو قبول کیا پھر صحیح طور سے پڑھتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ غلطی کس انسان سے نہیں ہوتی آخر وہ بھی ایک انسان تھا۔ ذہنی الجھنوں کے باعث ایک غلطی کر بیٹھا لیکن رکن الدین کو موقع مل گیا۔ اس نے کمیٹی کے دوسرے ممبروں کو اپنا فیصلہ سنایا کہ پیش امام بدلا جائے۔ پتا نہیں ایمان علی نے اس سے پہلے کتنی بار غلط پڑھا ہے، وہ تو اتفاق سے ایک قابل شخص اس کے پیچھے نماز پڑھ رہا تھا، اس نے غلطی پکڑ لی۔ اس طرح تو وہ ہمیں الٹی سیدھی نمازیں پڑھاتا رہے گا۔

کمیٹی کے کچھ ممبروں نے دبی زبان سے ایمان علی کی حمایت کی لیکن صدر رکن الدین کے حامی زیادہ تھے لہٰذا اس کا فیصلہ مان کر ایمان علی کو چھٹی دے دی گئی۔ وہ پھر ٹھوکریں کھانے کے لئے مسجد سے باہر آ گیا۔

وہ تمام دن سڑکوں پر گھومتا رہا۔ دوسرے محلوں کی مسجدوں میں جا کر نماز پڑھتا رہا اور روزی کا ذریعہ تلاش کرتا رہا۔ ایک شخص نے کہا۔

''ہمارے ملک میں مسجدوں سے زیادہ مولوی پیدا ہو گئے ہیں۔ ہر جگہ یہی ہو رہا ہے۔ ملازمتوں کے لئے دس جگہ خالی ہوتی ہیں، وہاں دس ہزار طلب گار آ جاتے ہیں۔ جایئے مولوی صاحب اینٹیں اور پتھر ڈھونے کی مزدوری کیجئے تبھی آپ کو روٹی ملے گی''۔

اس نے ساری زندگی اللہ کی مزدوری کی تھی۔ اینٹ اور پتھر ڈھونے کی اس کی سکت نہیں تھی کیونکہ اب وہ پہلے سے زیادہ دبلا پتلا اور کمزور ہو گیا تھا۔ دنیا والوں نے بڑے ہی غیر محسوس طریقے سے اس کا خون چوس لیا تھا۔ اب وہ دو دن کے فاقے کرتا ہوا چل رہا تھا اور ادھر سے ادھر اس طرح ڈگمگا ہا تھا جیسے اب تب میں گر پڑے گا۔ ایک جگہ خیرات بانٹی جا رہی تھی۔ روٹی کھانے کے لئے بہت سے بھکاری ایک قطار میں بیٹھے ہوئے تھے جب اسے معلوم ہوا کہ ایک صاحب حیثیت مسلمان غریبوں کو افطاری کرانے کے لئے روٹیاں تقسیم کر رہا ہے تو وہ بھی قطار میں بیٹھ گیا کیونکہ اللہ کے نام پر نیک نیتی سے روٹیاں تقسیم ہو رہی تھیں۔ قطار میں بیٹھے ہوئے دو گداگر آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ اس نے پہلے تو ان کی طرف توجہ نہیں دی پھر جب خیرات لینے والے کی باتیں سنائی دیں تو وہ کان لگا کر سننے لگا۔ ایک فقیر کہہ رہا تھا۔

''اللہ جب دیتا ہے تو چھپر پھاڑ کر دیتا ہے۔ یہ صاحب اتنے پیسے والا ہے کہ اس کی چار بڑی بڑی کوٹھیاں ہیں، چار بڑی بڑی کاریں اور چار بڑی بڑی حسین بیگمات ہیں۔ اس کی خوش قسمتی کا نمبر بھی چار ہے اور چار بار اسمگلنگ کے کیس میں گرفتار ہو چکا ہے''۔

ایمان علی ان کی باتیں سنتا رہا۔ جب اس کی روٹی لینے کا نمبر آیا تو اس نے روٹی دینے والے سے کہا ''میں بڑے صاحب سے ملنا چاہتا ہوں، جب تک مجھے یہ معلوم نہ ہو کہ یہ روٹیاں حلال کی ہیں، میں انہیں ہاتھ نہیں لگاؤں گا''۔ اتفاق سے بڑا صاحب قریب ہی کھڑا ہوا تھا۔ وہ چونک کر ایمان علی کو یوں دیکھنے لگا جیسے کوئی پولیس کا آدمی فقیر کا بھیس بدل کر جاسوسی کرنے آیا ہو۔ اس نے فوراً ہی آگے بڑھتے ہوئے کہا ''آپ میرے ساتھ آیئے، میں آپ کو یقین دلا دوں گا کہ یہ حلال کی روٹی ہے''۔ وہ ایمان علی کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ لے جانے لگا۔ کوٹھی کے پیچھے کوئی نہیں

تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

''جناب آپ کون ہیں مجھے صاف صاف بتا دیجئے''۔

''میں آپ ہی کی طرح انسان ہوں'' ایمان علی نے جواب دیا۔

''میں اب تک کتنی ہی مسجدوں میں نماز پڑھا چکا ہوں لیکن اپنی سچائی اور ایمانداری کے باعث جم کر نہ رہ سکا''۔

بڑے صاحب نے خوشامدانہ انداز میں ہنستے ہوئے کہا۔

''دیکھئے آپ مجھ سے چھپنے کی کوشش نہیں کریں۔ میں سمجھ گیا ہوں کہ آپ پولیس والے ہیں اور بھیس بدل کر آئے ہیں۔ آپ کی یہ داڑھی نقلی ہے''۔

ایمان علی نے کہا'' آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ آپ روشنی میں چل کر دیکھ لیں۔ یہ نقلی داڑھی نہیں ہے اور میں نقلی مولوی نہیں ہوں''۔

بڑا صاحب تھوڑی دیر کے لئے ہچکچایا پھر اس نے اچانک ہی ایمان علی کی داڑھی پکڑ لی۔ داڑھی کھنچتے ہی ایمان علی لڑکھڑاتے ہوئے کراہنے لگا۔ اس کے سنبھلنے سے پہلے ہی بڑے صاحب نے اسے تڑاتڑ مارنا شروع کر دیا'' اے نہ تو تو پولیس والا ہے نہ مولوی۔ کم بخت بھیک مانگتا ہے اور خودداری یہ ہے کہ حلال کی روٹیاں تلاش کرتا ہے۔ تیرے باپ دادا کے زمانے میں حلال کی روٹیاں ہوں گی۔ اب تو لاتیں اور جوتے ہیں''۔

وہ اسے مارتے ہوئے احاطے کے پیچھے گیٹ پر لایا اور اسے باہر دھکیل دیا۔ وہ کوٹھی کے پیچھے چھوٹی سی گلی میں گر کر ہانپ رہا تھا اور تکلیف کی شدت سے کراہ رہا تھا۔ اس کی ناک اور باچھوں سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ اسی جگہ بے ہوش ہو گیا۔ وہ رات بھر اسی جگہ پڑا رہا، صبح ہوئی تو آس پاس کی کوٹھیوں والے اپنی اپنی کاروں میں بیٹھ کر اپنی کاروباری مصروفیات کے لئے روانہ ہو گئے۔ کسی نے پچھلی گلی میں جھانک کر نہیں دیکھا۔ ماہ رمضان کی آخری تاریخ تھی، شام کو عید کا چاند نظر آنے والا تھا۔ تمام لوگ آنے والے کل کی خوشیاں منانے کے لئے مہنگی شاپنگ میں مصروف تھے اور جو عید کی خوشی کا سب سے زیادہ حق دار تھا وہ گلی میں پڑا ہوا تھا۔ کسی کوٹھی کی ایک بیگم نے پچھلی کھڑکی سے جھانک کر اسے دیکھ لیا۔ اس نے فوراً ہی میونسپل کمیٹی کے دفتر میں فون کیا کہ کوٹھی کے پیچھے کسی بھکاری کی لاش پڑی ہے، اسے فوراً اٹھوایا جائے ورنہ اس صاف ستھرے علاقے میں بیماریاں پھیل جائیں گی''۔

شام کو ایک میونسپل کمیٹی کی گاڑی اسے اٹھانے کے لئے آئی تو اس سے پہلے ہی دو بھک منگے اس کے پاس آ کر بیٹھ گئے اور اسے اچھی طرح ٹٹول کر دیکھنے کے بعد یہ یقین کر لیا کہ وہ مر چکا ہے۔ وہ دونوں بھک منگے خاموش ایمان کے پاس بیٹھے کچھ دیر تک کھسر پھسر کرتے رہے پھر ان میں سے ایک چارپائی لانے کے لئے چلا گیا۔ کمیٹی والے آئے تو اس بھک منگے نے کہا کہ مرنے والا اس کا رشتہ دار ہے، وہ دو دونوں سے بیمار تھا، آج صبح بھیک مانگنے نکلا تو یہاں آ کر مر گیا۔ یہ سن کر مردہ اٹھانے والے مہتر نے اسے دو ہاتھ جماتے ہوئے کہا۔

''سسروں کو مرنے کے لئے سڑک ہی ملتی ہے۔ اب اسے لے کر یہاں کیوں بیٹھے ہو، چلو اسے اٹھا کر لے جاؤ'' بھک منگے نے عاجزی سے کہا۔

''جمادار صاحب مرنے والے کا بھائی چارپائی لانے گیا ہے۔ وہ مرنے والی کی بیوی کو بھی بلا کر لائے گا، ہم ابھی اسے اٹھا کر لے جائیں

گئے"۔ کمیٹی والے وہاں بیٹھ کر تھوڑی دیر انتظار کرتے رہے۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ گداگر لاش اٹھا کر لے جائیں تو وہ محنت سے بچ جائیں گے۔ بیس منٹ کے بعد تین بھک منگے ایک چارپائی اٹھا کر لے آئے اور اس پر ایمان علی کے بے حس جسم کو ڈال کر کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے صدر کی طرف جانے لگے۔ ایمان کی لاش چار کاندھوں پر جا رہی تھی۔ دیکھا جائے تو کتنے ہی لوگ اس طرح اپنے ایمان کو مار کر اپنے کندھے پر اٹھائے پھرتے ہیں اور انہیں احساس تک نہیں ہوتا کہ کہ وہ اپنی لاش ڈھونڈنے والے مہتر ہیں۔ ایک کاندھے والے نے دوسرے کاندھے والے سے پوچھا۔

"رونے والی کو کہاں چھوڑ آئے ہو؟" دوسرے نے جواب دیا "میں اس کو زیب النساء والے پھٹ پاتھ پر بٹھا کر آیا ہوں۔ سالی مصیبت ماری ہے، روئے گی تو سچ مچ آنسو نکلیں گے"۔

وہ باتیں کرتے جا رہے تھے۔ چارپائی پر پڑا ہوا ایمان علی اس دنیا کی باتوں اور آوازوں سے بہت دور چلا گیا تھا۔ اب اسے خبر نہیں تھی کہ یہ دنیا والے اسے کس بازار میں لے جا رہے ہیں۔ وہ زیب النساء سٹریٹ پر پہنچے تو فٹ پاتھ پر ایک عورت چادر میں لپٹی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس کی گود میں تقریباً ڈیڑھ برس کا بچہ تھا۔ بچہ بھوک سے رو رہا تھا۔ ماں بچے کو چھاتی سے لگا کر تسلیاں دے رہی تھی۔ پیار سے تھپک رہی تھی کیونکہ دودھ کی کمی تھی، کراچی کے نلکوں کی طرح کبھی کبھی ایک آدھ قطرہ ٹپک جاتا تھا۔ ان قطروں سے وہ بچے کی بھوک کو بہلا رہی تھی۔

اس چادر والی کے سامنے فٹ پاتھ پر ایمان علی کی لاش لا کر رکھ دی گئی۔ اس کی لاش پر ایک میلی سی چادر پڑی ہوئی تھی۔ اس کے سامنے ایک اور میلی سی چادر بچھا دی گئی تھی تا کہ کفن کے لیے چند جمع ہو سکے۔ ایمان علی بہت اچھے وقت پر مرا تھا۔ وہ چاند رات کی شام تھی، لوگ عید کی خوشی میں ایمان کو کفن پہنانے کے لیے آتے جاتے پیسے پھینک رہے تھے۔ دس پیسے، پچیس پیسے اور کچھ لوگ ایک ایک روپے کے نوٹ بھی پھینک رہے تھے۔ چاروں بھیک مانگنے والوں کے دل خوشی سے دھڑک رہے تھے لیکن وہ منافع حاصل کرنے کی خوشی کو دل میں دبائے چہرے پر اداسی لیے سر جھکا کر کھڑے تھے۔ بوڑھا منگو بابا چادر والی کے پاس بیٹھا اس سے آہستگی سے کہہ رہا تھا۔

"اری جور جور سے روتی کیوں نہیں۔ بس تیرے کو ایسا رونا ہے جیسے تیرا کھسم مر گیا ہو"۔ چادر والی کے دل کی گہرائی سے آہ نکلی، آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ پھر وہ بین کرتی ہوئی سوچنے لگی۔

بوڑھے منگو تیرا منہ جلے میرا خصم کبھی نہیں مر سکتا کیونکہ وہ ایمان والا ہے اور ایمان کو کبھی موت نہیں آتی۔ میں جو رو رہی ہوں تو بے ایمانوں کی لمبی حیات پر رو رہی ہوں کہ ایمان کے سڑے گلے دشمن کیوں نہیں مرتے۔ آہ کبھی میں بھی ایمان والی تھی، میرے خاوند نے مجھے ایمان کا راستہ دکھایا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ ایمان کے راستے پر چلتے چلتے اسی ایمان والے کے قدموں میں جان دے دوں مگر ہماری اس دنیا میں بے ایمانی کے ہاتھ بہت مضبوط ہیں۔ میں نے چوہدری دین محمد کو گرفتار کرانے کے بعد یہ سمجھ لیا تھا کہ جھوٹ کو پھانسی ہو جائے گی۔ شاید پھانسی ہو چکی ہو گی مگر ایک جھوٹ اپنے پیچھے دوسرے جھوٹ کو چھوڑ کر مرتا ہے تا کہ دنیا میں اس کا سکہ بھی چلتا رہے اور سچوں کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا رہے کہ اتنی بڑی دنیا میں جھوٹ کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا۔ جھوٹ بولو گے تو عیش کرو گے، نہیں بولو گے تو فٹ پاتھ پر مر جاؤ گے یا صرف مرنے والے کی لاش پر رونے کے کام آؤ گے اور میں کسی اجنبی کی لاش پر رونے یہاں آ گئی ہوں۔ وہ بلک بلک کر رونے لگی۔ منگو بابا خوش ہو گیا۔ اس کے آنسوؤں کی ایک ایک بوند منافع کی شرح

بڑھاتی جارہی تھی۔اس دنیا کے بازار میں کبھی کبھی آنسو بھی فروخت ہوتے ہیں۔ان کے عوض کسی کو دولت ملتی ہے کسی کو کفن ملتا ہے۔وہ روتے روتے بدستور سوچ رہی تھی۔

میں یہاں تک کیسے پہنچی؟ مجھے یہاں تک پہنچانے والا چوہدری دین محمد کا سالا ہے۔میں نے اس سالے کی بہن کا سہاگ اجاڑ دیا۔ سالے کا یہ رشتہ اس پر خوب جچتا ہے۔یہ چوہدری دین محمد کے لیے ایک رشتہ اور میرے لیے گالی بن گیا ہے۔اس واقعہ کو دو سال گزر گئے۔میں وہ دن نہیں بھول سکتی جب ایمان علی ہوش میں آیا تھا۔میں اس سے جلد آنے کا وعدہ کر کے ڈاکٹر صاحب کو اطلاع دینے گئی تھی۔اسپتال سے نکلتے ہی ایک بوڑھا آدمی سامنے آگیا۔اس نے پوچھا۔

''بیٹی کیا نام ہے تمہارا سکینہ ہے؟''

میں نے سر ہلا کر''ہاں''وہ کہنے لگا۔

''میں تھانیدار کا ملازم ہوں۔تھانیدار صاحب یہاں اپنی بہن کے گھر آئے ہوئے ہیں۔انہوں نے مجھے یہاں بھیجا ہے اور کہا کہ اسپتال کے ایک ڈاکٹر صاحب کے گھر میں سکینہ نام کی ایک عورت رہتی ہے،اس کا خاوند اسپتال میں علاج کے لیے پڑا ہوا ہے۔اچھا ہوا تم جلد ہی مل گئیں۔ انہوں نے تمہیں اسی وقت بلایا ہے۔چوہدری دین محمد کے مقدمے کی کوئی بات کرنی ہے''۔

اس نے مقدمے کا حوالہ دیا تو میں فوراً ہی اس کے ساتھ چل پڑی۔میں چاہتی تھی کہ اس ظالم چوہدری کو جلد سے جلد سزائے موت سنا دی جائے پھر وہ بوڑھا بھی ایسا تھا کہ چہرے سے مکار نظر نہیں آتا تھا۔اگر ہر انسان کے چہرے سے مکاری ظاہر ہو جائے تو معصوم عورتیں کبھی دھوکہ نہ کھائیں۔

جب میں اس بوڑھے کے ساتھ تھانیدار کی بہن کے گھر پہنچی تو اس گھر میں داخل ہوتے ہی اچانک ایک مضبوط ہاتھ پیچھے سے آکر میرے سینے پر جم گیا۔پھر دو ہٹے کٹے جوان آئے انہوں نے میرے منہ میں کپڑا ٹھونس کر ہاتھ پاؤں رسیوں سے باندھ دیئے۔میں تڑپتی مچلتی رہی مگر ان کی گرفت سے آزاد نہ ہو سکی۔انہوں نے مجھے اس ٹرک کے پچھلے حصے میں ڈال دیا۔باقی حصے میں مال بھر دیا گیا تھا تاکہ میں نظر نہ آسکوں۔میرے پاس ایک جوان ننگا چاقو لے کر بیٹھ گیا تاکہ کسی قسم کا خطرہ ہو تو مجھے فوراً ہی ہلاک کر دے۔

میں نہیں جانتی تھی کہ مجھے کہاں لے جایا جارہا ہے۔ایک رات اور ایک دن تک وہ ٹرک چلتا رہا۔اس دوران کھانا کھانے کے لئے دو بار ویران جگہوں پر رکا۔انہوں نے مجھے بھی کھانا کھلانا چاہا،میں نے انکار کیا تو وہ مجھے مارنے لگے۔میں پھر بھی کھانے کے لیے تیار نہ ہوئی تو انہوں نے میرے بدن کے ایسے حصوں سے لباس پھاڑ دیا کہ میں گھبرا کر کھانے پر مجبور ہو گئی۔

دوسری رات وہ مجھے ایک ایسے کچے مکان میں لے آئے جس کے چاروں طرف دور دور تک ویرانی اور سناٹا تھا۔وہاں کوئی میری مدد کے لئے نہیں آسکتا تھا۔انہوں نے مجھے ایک چارپائی کے ساتھ باندھ کر بے لباس کر دیا۔پھر اس کے بعد جو سلوک میرے ساتھ کیا،اسے یاد کرتی ہوں تو کانپ کانپ جاتی ہوں۔وہ کہتے تھے''اگر ایمان علی ہاتھ آتا تو اسے اس طرح قتل کرتے کہ اس کی بوٹی بوٹی کاٹ کر جانوروں کے آگے ڈال دیتے۔

ایک مرد سے چوہدری دین محمد کا انتقام اسی طرح لیا جا سکتا تھا مگر عورت کو قتل کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی، اس کی عزت ختم کر دو وہ خود ہی مر جاتی ہے"۔

وہ جو کہتے تھے وہی کرتے تھے۔ چوہدری کے سالے اور اس کے دو ہٹے کٹے ساتھیوں نے کئی ماہ تک مجھے آزاد نہیں کیا۔ ان کا ایک نہ ایک آدمی پہریدار کی طرح موجود رہتا تھا۔ میرے بدن سے اتنا خون نکل گیا تھا کہ چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ مجھے دوا اور اچھی خوراک کی ضرورت تھی لیکن وہ مجھے اسی طرح بیماری میں مبتلا کر کے آہستہ آہستہ مارنا چاہتے تھے۔ میں روتی تھی، کبھی خدا کو یاد کرتی تھی اور کبھی اپنے ایمان علی سے ملنے کے لئے تڑپتی تھی۔ ایسے ہی وقت انسان بہکتا ہے اور سوچتا ہے کہ سچائی ہمیشہ عذاب میں مبتلا کرتی ہے۔ میں بھی سچائی سے توبہ کرتی تھی مگر ایمان علی کے چٹانی حوصلے یاد آ جاتے تھے۔ وہ بھی تو آخر انسان تھا، وہ کس طرح بدی کی قوتوں سے لڑ رہا تھا۔

میرے پاس ایمان علی نہیں تھا مگر اس کا دیا ہوا ایمان موجود تھا۔ بچھڑنے والے محبوب کی کوئی نشانی تو ہوتی ہے، میں نے نشانی کے طور پر اس کے ایمان کو پھر اپنے اندر مستحکم کر لیا۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ جس بچے کی خاطر ایمان علی مجھ سے دور دور رہتا تھا، انہوں نے اس بچے کو قتل کر دیا۔ نہ میں ادھر کی رہی نہ ادھر کی۔ کاش کہ ایک بار مجھے ایمان کے بازو پر سونے کا موقع مل جاتا۔

اس کچے مکان میں سسک سسک کر مرتے مرتے میں پھر زندہ ہو گئی۔ میری طبیعت پھر سنبھلنے لگی۔ وہ مجھے مار کر پھینک دینا چاہتے تھے مگر دوبارہ مجھ پر رنگ روپ چڑھتے دیکھ کر ان کا ارادہ بدل گیا۔ پورے ڈیڑھ برس تک ان تینوں کی داشتہ بنی رہی۔ پھر ایک رات مجھے وہاں سے فرار ہونے کا موقع مل گیا۔ اس رات صرف ایک جوان پہرے پر موجود تھا اور وہ ذہنی طور پر مجھ سے وابستہ ہو گیا تھا۔ دوسرے لفظوں میں وہ مجھ پر عاشق ہو گیا تھا اور کسی حد تک مجھ پر بھروسا کرتا تھا۔

اس رات میں نے بڑی محبت سے پیش آ کر اسے سلا دیا۔ جب وہ خراٹے لینے لگا تو میں وہاں سے نکل بھاگی۔ میں نہیں جانتی تھی کہ وہ ڈیڑھ سال میں نے کس جگہ گزارے تھے۔ کس جنگل بیابان میں مجھے رکھا گیا تھا۔ میں اندھیرے میں کہاں جا رہی تھی، یہ بھی مجھے معلوم نہیں تھا۔ جب صبح ہوئی اور دھوپ نکل آئی تو ایک چھوٹی سی بستی میں پہنچ کر پتا چلا کہ ٹھٹھہ کے قریب ہوں۔ کسی بزرگ کے مزار کے پاس کچھ لوگ نظر آئے، ان میں بھیک مانگنے والی عورتیں بھی تھیں اور مرد بھی تھے۔ انہوں نے مجھے لٹی پٹی حالت میں دیکھ کر پوچھا کہ میں کون ہوں اور کہاں جا رہی ہوں؟ میں ایک عورت ہو کر زبان سے یہ کس طرح کہہ سکتی تھی کہ ڈیڑھ برس تک اپنی عزت لٹا کر آ رہی ہوں۔ میں سچ بات نہ کہہ سکی۔ اس دوران مجھے پھر جھوٹ کہنا آ گیا تھا اور روٹی کھاتے وقت یہ نہیں سوچتی تھی کہ وہ حرام کی ہے یا حلال کی۔ ایمان علی کو میں کبھی بھلا نہیں سکتی تھی مگر اس کے اصول میرے دماغ سے مٹ رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا۔

"میں اپنے خاوند کے ساتھ کراچی شہر کی طرف جا رہی تھی۔ میرا خاوند بہت ایمان والا ہے، وہ پیدل سفر کرتا ہے اور لوگوں کو دین ایمان کی باتیں سمجھاتا جاتا ہے۔ کل رات ایک ویرانے میں چند ڈاکوؤں نے ہم پر حملہ کر دیا۔ میرے خاوند کے پاس صرف ایمان کی دولت ہے جو لوٹی نہیں جا سکتی تھی لیکن مجھ جیسی جوان عورت لٹیروں کے لیے ایک بہت بڑی دولت ہوتی ہے۔ وہ مجھے اٹھا کر لے جانے چاہتے تھے، میں کسی بھاگ کر یہاں آ گئی ہوں۔ پتا نہیں میرا خاوند کہاں ہے اور کس حال میں ہے؟" ایسا کہتے وقت مجھے اپنا ایمان یاد آ گیا۔ میں سچ مچ نہیں جانتی تھی کہ وہ کہاں ہے اور

کس حال میں ہے؟ اسے دیکھنے کے لئے، اس سے ملنے کے لئے دل تڑپ رہا تھا۔ میں یہ بھی جانتی تھی کہ وہ میرے لیے اس طرح نہیں تڑپ رہا ہوگا۔ اپنے اصولوں کے مطابق اپنی عبادت میں مصروف ہوگیا ہوگا کیونکہ اسے دنیا کی ہر خوبصورتی سے زیادہ خدا کی خوشنودی عزیز ہے۔

میں اتنی دور آکر اب یہی سوچ رہی تھی کہ وہ مجھے بھول ہی جائے تو بہتر ہے۔ میں اپنے اس بے حیا وجود کو لے کر اس کے سامنے نہیں جاسکتی تھی۔ میں سمجھتی تھی کہ وہ ایمان والا اب بھی مجھے قبول کرلے گا کیونکہ وہ میری بے گناہی کو سمجھے گا مگر دنیا والوں نے مجھے جو صدمات دیئے ہیں، وہ صدمات اس کے دماغ کا پھوڑا بن جائیں گے۔ وہ جلے گا، کڑھے گا، اس دنیا کے شیطانوں سے جھنجھلائے گا۔ اس طرح اس کی عبادت میں خلل پڑے گا۔ میں ایمان والی نہ رہی مگر ایک ایمان والے کو صدمات سے بچا کر کسی حد تک اسے پرسکون عبادت کا موقع تو دے سکتی ہوں۔

میں نے اپنے ایمان سے دور رہنے کا فیصلہ کرکے اپنے کلیجے پر پتھر رکھ لیا۔ وہاں مزار کے پاس منگو بابا ایک ننھے بچے کو گود میں لیے بیٹھا تھا۔ اس نے کہا ''میری بیٹی اس بچے کو جنم دیتے ہی مرگئی۔ یہ جو میرے پاس بیٹھی ہے میری بہن ہے۔ میں اس بچے کو بہن کے حوالے کرنا آیا ہوں پھر میں کراچی واپس چلا جاؤں گا۔ بچہ اس عورت کی گود میں بھوک سے بلک رہا تھا۔ اگر میرا بچہ زندہ ہوتا تو اس کا ہم عمر ہوتا۔ میری ممتا بھری چھاتیوں میں اب بھی دودھ موجود تھا۔ میں نے اس بچے کو گود میں لے کر اور ان لوگوں سے منہ پھیر کر اپنی چھاتی سے لگا لیا۔ منگو بابا نے خوش ہوکر کہا ''تو میرے ساتھ کراچی چل اگر تیرا خاوند زندہ ہوگا تو وہاں پہنچ جائے گا۔ ہم بھی اسے تلاش کریں گے، وہ کبھی نہ کبھی مل جائے گا۔ جب تک تو میرے پاس رہنا اور اس بچے کو دودھ پلاتی رہنا''۔

میں منگو بابا کے ساتھ اس شہر میں آگئی اور اس کے ساتھ فقیروں کی ٹولی میں رہ کر بھیک مانگنے لگی۔ کتنی ہی سڑکوں کے کنارے بیٹھ کر اور چادر میں چھپ چھپ کر بھیک مانگتے وقت میں آتے جاتے لوگوں کو دیکھتی تھی۔ میں ایمان علی کے سامنے نہیں جانا چاہتی تھی مگر میری نگاہیں اسے تلاش کرتی رہیں۔ یہ دل میرے قابو میں نہیں ہے، مجھے سمجھاتا ہے کہ میں اس سے نہ ملوں مگر اسے دیکھ تو لوں کہ وہ ایمان کے سفر میں کتنی دور نکل گیا ہے۔

ایمان اس کے سامنے پڑا ہوا تھا۔ سفر کے دوران وہ تھک کر نہیں گرا تھا بلکہ گرایا گیا تھا۔ اس پر چادر ڈال کر اس کی پہچان مٹا دی گئی تھی اور سکینہ سے کہا جارہا تھا کہ بلند آواز میں روتی رہے۔ اس طرح روتی رہے جیسے اس کا خصم مرگیا ہو۔ کسی رشتے کی موت آجائے تو کوئی روتا بھی ہے مگر ایمان مرجائے تو کوئی نہیں روتا۔ جس کی لاش سے منافع حاصل ہو، اس کی موت سے خوشی ہوتی ہے۔

لاش کے سامنے سفید چادر پر پیسوں کا ڈھیر لگ چکا تھا۔ چھوٹے بڑے سکے لوگوں کے ہاتھوں سے گر گر کر کھنکھناتی ہوئی ہنسی کی طرح بج رہے تھے۔ چاندرات کی خوشی میں سب ہی فراخدل ہوگئے تھے۔ اس طرح ڈھیر سارے پیسے پھینکے جارہے تھے جیسے ایمان کو سونے کا کفن پہنا کر کوئی تاریخی کارنامہ انجام دینا چاہتے ہوں کہ دیکھو تیرہ سو سال سے یہ ایمان ہمیں مہذب بنانے کی کوشش کرتا آرہا ہے۔ آج ہم اس کی کوششوں کو سونے کا کفن پہنا رہے ہیں تاکہ آئندہ نسلوں کے ماہ آثار قدیمہ جب زمین کی تہہ سے اسے کھول کر نکالیں تو سونے کا کفن اس بات کی سند رہے کہ ایمان کو اس کے شایان شان دفن کیا گیا تھا۔ اور ہم کر بھی کیا کرسکتے ہیں؟ ہم سچ نہیں بول سکتے اور سچ نہیں سن سکتے لیکن زبان سے سچے ہونے کا یقین دلاتے ہیں۔ شریف نہیں ہیں، شرافت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اندر سے مسلمان نہیں ہیں، اوپر سے اسلام کا نعرہ لگاتے ہیں۔ ہم آج جتنے دوغلے ہیں کل نہیں

تھے۔ اگر اب بھی ہمیں اپنے کردار پر شرم نہ آئی تو آئندہ کل بھی ہم اپنی جیسی دوغلی فطرت کی اولادیں پیدا کریں گے۔

نفع حاصل کرنے کا لالچ سرمایہ دار میں ہو یا فقیر میں، منافع بڑھتا رہے تو ایمان کی باتیں انہیں مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہیں۔ رات کے ایک بجے چار فقیروں نے کفن کی آمدنی کا حساب کیا تو ہر ایک کے حصے میں ایک ہزار دو سو سات روپے آئے۔ یعنی مجموعی آمدنی چار ہزار آٹھ سو اٹھائیس روپے تھی۔ انہوں نے مزید منافع حاصل کرنے کے لیے سوچا کہ ایمان کی لاش کو ابھی محفوظ کر لیا جائے۔ دوسری صبح عیدگاہ کے پاس اسے رکھ کر سکینہ کو پھر رلایا جائے گا۔ ہائے ری عورت! تو منافع کے کس بازار میں کام نہیں آتی؟

سکینہ کو شام کے وقت اچھی طرح کھلایا پلایا گیا تاکہ رونے کی سکت رہے اور بچے کے لیے چھاتیوں میں دودھ بھی اترتا رہے۔ منگو بابا کی جھگی میں وہ لاش رکھی گئی۔ پھر وہ لوگ سکینہ کو بچے کے ساتھ وہاں بٹھا کر باہر چلے گئے اور دروازے کو باہر سے اچھی طرح بند کر دیا کیونکہ ایمان علی روپے پیدا کرنے والے مردہ مشین تھا، اس کی حفاظت لازمی تھی۔

جھگی کے اندر چراغ کی ہلکی ہلکی سی زرد روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس روشنی میں سکینہ کا شگفتہ چہرہ زردی مائل بیمار سا نظر آ رہا تھا۔ روتے روتے اس کی آنکھیں سوج گئیں تھیں۔ وہ شام سے لاش کے پاس بیٹھے بیٹھے تھک گئی تھی اس لیے بچے کو فرش پر لٹا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ ایسی غمزدہ نظروں سے چادر میں چھپے ہوئے انسان کو دیکھنے لگی جیسے سچ مچ بیوہ ہو گئی ہو اور اب تک اپنے خاوند کی موت پر روتی رہی ہو۔ اس پر میلی چادر پڑی ہوئی تھی۔ چادر میلی ہونے سے کیا ہوتا ہے، اس کے پیچھے جو ایمان تھا، وہ کہیں سے بھی میلا نہ تھا۔ اگر کوئی آنکھوں پر پڑا ہوا میلا پردہ اٹھا دے تو اسے ایمان کا روشن چہرہ نظر آ جائے گا۔

کوئی اٹھا دے۔ ایمان کب تک چھپا رہے گا؟ ایک فراق کی ماری اپنی آنکھوں میں انتظار کے الاؤ روشن کیے زندگی کے ایک موڑ پر کھڑی ہوئی ہے۔ اس کی تھکی تھکی سی نگاہیں پوچھ رہی ہیں کہاں ہے میرا ایمان؟ کوئی پردہ اٹھا، کوئی جلوہ دکھا دے۔

باہر آسمان پر بدلی چھائی ہوئی تھی ہلکی ہلکی بوندیں پڑنے لگی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی ہوائیں تیز ہو گئی تھیں۔ اسی وقت بچہ دودھ کے لیے رونے لگا۔ پچھلی شام سے سکینہ کو اچھی خوراک مل رہی تھی۔ اس نے ایک گلاس دودھ بھی پیا تھا اسی لیے اس کے سینے میں دودھ کا سمندر موجزن تھا۔ وہ بچے کو دودھ پلانے کے لیے بڑھی تو اچانک ہی ٹھٹک گئی۔

ہوا کی تیزی نے پردہ اٹھا دیا تھا۔ ایمان علی کے چہرے پر سے چادر کا کنارہ اڑ کر سینے پر آ گیا تھا۔ سکینہ پر جیسے ایک ساعت کے لیے سکتہ طاری ہو گیا، اوپر کی سانس اوپر ہی رہ گئی۔ پھر وہ چیخیں مارتی ہوئی قریب آئی اور ایمان علی سے لپٹ کر رونے لگی ''میرا ایمان! میری جان! ہائے میں کیسی ہوں، اب تک تجھ پر جھوٹے آنسو بہاتی رہی۔ ہائے! مجھے موت آ جائے، تجھ سے پہلے میں کیوں نہ مر گئی''۔ وہ چیخ رہی تھی، تڑپ تڑپ کر بین کر رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے سچے آنسو رواں تھے۔ باہر سے منگو بابا نے ڈانٹ کر کہا۔

''اری پاگل ہو گئی ہے، تجھے اب عیدگاہ پر چل کر رونا ہے۔ ابھی چپ ہو جا.....''

وہ ایک دم سے چپ ہو گئی اور حیرانی سے ایمان علی کی صورت دیکھنے لگی۔ اس سے لپٹ کر روتے وقت محسوس ہو رہا تھا کہ وہ لاش کی طرح

سرد نہیں ہے، اس کے بدن میں ہلکی ہلکی سی غیر محسوس حرارت ہے۔ ایک مرد کا جسم ہو اور چھپی چھپی سی حرارت ہو تو اسے عورت کا بدن ہی محسوس کرتا ہے۔ کیا میرا ایمان زندہ ہے! وہ دل کی جگہ کان لگا کر سننے لگی۔ وہاں بہت ہولے ہولے کمزور سی دھڑکنیں اپنی زندگی کی گواہی دے رہی ہیں۔ وہ تڑپ کر چیخ مارتی ہوئی اٹھ گئی اور جھگی کے دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی ''میرا ایمان زندہ ہے، میرا خاوند زندہ ہے، خدا کے لیے اسے بچاؤ''۔

باہر سے ایک فقیر نے دوسرے فقیر سے کہا ''بے چاری شام سے اسے خاوند بنا کر رو رہی ہے۔ ایک تو پہلے ہی خاوند سے بچھڑ کر آدھی پاگل ہو گئی تھی، اب روتے روتے سچ مچ اسے اپنا خاوند سمجھ رہی ہے''۔

دوسرے فقیر نے کہا ''اچھا ہے، عیدگاہ میں پاگلوں کی طرح روئے گی تو زیادہ پیسے ملیں گے''۔

انہوں نے دروازہ نہیں کھولا تو وہ پھر ایمان علی کی طرف پلٹ گئی۔ اسے یاد آیا کہ ننھے بچے ضد میں آ کر سانس روک لیتے ہیں تو دیہات کی عورتیں کیا عمل کرتی ہیں۔ وہ فوراً ہی ایمان علی کے چہرے پر جھک گئی۔ نیم مردے کا منہ ذرا سا کھلا ہوا تھا، وہ اپنا منہ اس کے منہ میں ڈال کر زور زور سے پھونکنے لگی۔ اس کے پھیپھڑوں میں سانس بھرنے لگی۔ دو چار بار یہ عمل کرتے ہی ایمان علی کی بہت ہی ہولے سے کراہنے کی آواز سنائی دی۔ وہ خوشی سے روتے روتے چیخنے لگی۔

''میرے ایمان! میری جان آنکھیں کھول، تو نہیں مر سکتا..... ایمان کو کوئی نہیں مار سکتا۔ تو ایک سانس کے بعد دوسری سانس لے گا اور ہر آزمائش کے بعد زندہ رہے گا''۔

اس نے آنکھ نہیں کھولی، صرف لب ذرا سے کھولے ''پا..... نی.....''

تب اس کے چہرے کی مرونی سکینہ کی سمجھ میں آئی۔ وہ صرف پیاسا ہی نہیں بلکہ بھوکا بھی تھا۔ وہ اپنے خاوند کے فاقہ زدہ چہرے کو پہچانتی تھی اس لئے پھر دوڑتی ہوئی دروازے تک گئی اور اسے پیٹ پیٹ کر کہنے لگی۔

''منگو بابا میرا خاوند زندہ ہے، وہ بھوکا ہے۔ اس کے لئے دودھ اور روٹی لے آ۔ خدا کے لئے اسے بچا لے''۔

''اری کیوں باؤلی ہو رہی ہے۔ کیا میں نہیں جانتا کہ تو راتوں کو بھی نیند میں اسی طرح بڑبڑاتی ہے۔ میرے ایمان کو بچاؤ میرے ایمان کو بچاؤ''۔

''ارے اسے چلانے دے منگو، سالی کھد بکھد خاموس ہو جاوے گی''۔

کوئی اس کی نہیں سن رہا تھا، سب اپنی گا رہے تھے۔ وہ جھگی کے اندر پنجرے کے پنچھی کی طرح پھڑ پھڑا رہی تھی۔ ایمان کی سلامتی کے لئے خدا کا واسطہ دے رہی تھی۔ ادھر آ رہی تھی ادھر جا رہی تھی۔ پروانے کی طرح ایمان کا طواف کر رہی تھی۔ ایک طرف بچہ بھوک سے بلک رہا تھا، دوسری طرف ایمان علی کا منہ بھوک سے کھلا ہوا تھا۔ وہ کس کی بھوک مٹائے؟ کس طرح مٹائے؟ بچہ مسلسل رو رہا تھا، چپ ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ باہر بیٹھے ہوئے منگو بابا کا دل تڑپنے لگا کیونکہ وہ اس کی اپنی بیٹی کا بچہ تھا۔ نواسے کا رونا برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ وہ غصے میں بڑبڑاتا ہوا جھگی کا دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔

''اری کیا پاگل ہوگئی ہے؟ کیا بچے کو دودھ نہیں پلائے گی؟''

منگو بابا کے ساتھ دوسرے فقیر بھی بڑبڑاتے ہوئے اندر آئے۔ مگر سکینہ کو دیکھتے ہی ٹھٹک کر خاموش ہوگئے۔ وہ مردے پر جھکی ہوئی تھی اور اس کے کھلے ہوئے منہ میں اپنی زبان ڈالے لعاب دہن سے اس کے حلق کو تر کر رہی تھی۔ ایک چراغ دوسرے چراغ کو روشن کر رہا تھا۔ وہ یہی دیکھ کر حیران ہو رہے تھے کہ مردہ سانس لے رہا تھا اور وہ بڑی بے حیائی سے اس کے منہ میں منہ ڈالے ہوئے تھی۔ یہ مسیحائی کا ایک انداز تھا کہ ایک بے حیائی سے دوسرے کو زندگی مل رہی تھی۔

سب کی سمجھ میں آ گیا کہ وہ نیند کی حالت میں ایمان کو بچانے کے لیے نہیں کہہ رہی تھی، نہ ہی اس پر خواہ مخواہ رونے کا جنون سوار تھا بلکہ یہی اس کا اصل ایمان علی ہے جسے وہ تلاش کر رہی تھی۔ منگو بابا چیخ چیخ کر دوسروں سے کہہ رہا تھا۔

''ارے دیکھتے کیا ہو، دوڑ کے جاؤ۔ اس کے لیے دودھ روٹی لاؤ۔ یہ میرے نواسے کو دودھ پلاتی ہے۔ کیا میں اس کے سہاگ کو نہیں بچاؤں گا؟ جاؤ جلدی سے.....''۔

اس کی چیخ و پکار اس بات کی گواہی دے رہے تھی کہ ایمان کو زندہ رکھا جائے گا۔ سکینہ اپنے ایمان علی پر جھکی ہوئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ آنکھیں کھول رہا تھا اور سکینہ کی کھلی آنکھوں میں خوشی کے آنسو جھلملا رہے تھے۔ عید کی صبح ہو رہی تھی۔

O☆O

کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com

چور رشتہ

ہماری مہذب سوسائٹی میں جب
وہ رشتہ قائم کرنے کی اجازت
نہیں ملتی تب آدمی تہذیب کے
چور دروازے سے ایک چور کی طرح
اسی رشتے تک پہنچتا ہے۔

انسان کی خواہش ہر لمحے جتنے بچے دیتی ہے ان کا شمار کوئی نہیں کر سکتا۔ ایک خواہش کے بعد دوسری، دوسری کے بعد تیسری، خواہشات سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں نوزائیدہ کیڑوں کی طرح کلبلاتی ہوئی دیکھتے ہی دیکھتے جوان ہو جاتی ہیں۔ اس نکتے کے پیش نظر کہا جاتا ہے کہ ''ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے''۔

میرا بھی دم نکل رہا تھا کہ ایک حسین و جمیل محبوبہ کو حاصل کرنے کی خواہش پوری نہیں ہو رہی تھی حالانکہ گھر میں ایک بیوی موجود تھی۔ وہ بیوی پہلے محبوبہ کی حیثیت میں میری زندگی میں آئی تھی لیکن نادان محبوبائیں نہیں سمجھتیں ہیں کہ وہ بیوی بن کر ایک رات گزارنے کے بعد سیکنڈ ہینڈ ہو جاتی ہیں۔ مرد کے لئے پھر ان میں وہ چارم اور پہلے جیسی کشش نہیں رہتی۔ میں ایک عام سی حقیقت بیان کر رہا ہوں، ویسے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بیوی بنا لینے کے بعد اپنی آخری سانس تک یا بیوی کی آخری سانس تک اس سے محبت کرنی پڑتی ہے اور ہر سانس کے ساتھ یہ خواہش سر ابھارتی ہے کہ بیوی کی سانسیں جلدی پوری ہو جائیں۔

میری ایک بیمار بیوی ہے۔ وہ شادی سے پہلے بھی بیمار رہی تھی۔ دلہن بن کر آئی تو کھانسی اور بخار اپنے جہیز میں لے کر آئی۔ اس کے باوجود میں اس سے محبت کرتا ہوں کیونکہ وہ میرے چار عدد پیارے پیارے پھول جیسے بچوں کی ماں ہے۔ میرا بڑا لڑکا پندرہ برس کا ہے اس حساب سے تقریباً سولہ برس سے اپنی بیوی کے ساتھ شرعی محبت کر رہا ہوں لیکن میری داستان کا موضوع تفریحی محبت ہے۔

میں ایک بہت بڑا ناشر ہوں۔ رومانی ناولیں شائع کرتا ہوں۔ اب تک سینکڑوں ناولیں شائع کر چکا ہوں اور ان رومانی ناولوں کو پڑھتے پڑھتے خود رومانس کی طرف مائل ہو گیا ہوں۔ ہر وقت چشم تصور میں کوئی البیلی سی حسینہ مجھے اپنی طرف بلاتی رہتی ہے اور میں اس کے ساتھ ذرا بے

نیازی سے پیش آتا ہوں۔ سنا ہے کہ عورت کے سامنے ذرا بے نیازی برتو تو وہ نیاز مند بن کر پیچھے پیچھے چلی آتی ہے مگر یہ سب میری جاگتی آنکھوں کا خواب ہے اگر سچ مچ کوئی حسینہ میری طرف مائل ہو تو میں اسے مایوس نہیں کروں گا۔ ''دوسروں کو مایوس کرنا گناہ عظیم ہے''۔ شاید یہ بات حسین لڑکیوں کے سلسلے میں ہی کہی گئی ہے۔

پہلے تو میں انتظار میں رہا کہ کوئی ضرورت مند خود ہی چل کر میرے پاس آئے گی کیونکہ آئینہ مجھے سمجھاتا تھا کہ میں ایک خوبرو اور اسمارٹ نوجوان ہوں۔ مگر آئینے تو بدصورت بوڑھوں کو بھی یہی سمجھاتے ہیں۔ میں شیو کرنے کے بعد اور بہترین سوٹ پہننے کے بعد اپنی بیوی سے پوچھتا تھا کہ میں کیسا لگتا ہوں وہ نیک بخت جواب دیتی۔

''اللہ بہت اسمارٹ لگ رہے ہیں۔ دیکھ دیکھ کر جی نہیں بھرتا۔ میں تو خاموش نظروں سے آپ کی نظر اتار دیتی ہوں''۔

کچھ عرصے بعد پتہ چلا کہ ہر فرمانبردار بیوی اسی طرح اپنے شوہروں کی نظریں اتارتی ہے۔ ان کی نظروں میں خوبصورتی یہ ہے کہ دنیا کا سب سے خوبصورت مرد مجازی خدا ہوتا ہے۔ میرے پاس ایک ایئر کنڈیشنڈ امپالا ہے۔ وقتاً فوقتاً جب سرراہ جب کوئی لڑکی لفٹ مانگتی تھی تو مجھے اپنی خوبروئی کا یقین ہو جاتا تھا۔ آخر عورتوں کو اپنی طرح مائل کرنے والی مجھ میں کوئی خاص بات ہے۔ مگر لفٹ مانگنے والیاں دوبارہ نظر نہیں آتی تھیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ مجھ سے زیادہ میری ایئر کنڈیشنڈ امپالا خوبصورت ہے۔ پھر بھی میں احساس کمتری کا شکار نہیں ہوں۔ یہ خیال تقویت پہنچاتا ہے کہ لڑکیاں بدذوق ہیں جو مجھ جیسے باذوق انسان کی قدر کرنا نہیں جانتیں۔

اس طرح اپنے دل کو سمجھاتے سمجھاتے کئی برس گزر گئے۔ آخر پے در پے ناکامیوں نے مجھے سمجھایا کہ مانگنے سے کچھ نہ ملے تو مہذب انداز میں بڑے سلیقے سے چھین لینا چاہئے۔ یہ سوچ کر میں نے اخبار میں اشتہار دیا۔ اشتہار کا مضمون کچھ یوں تھا۔

''پبلشر صادق علی اینڈ سنز کے ادارے میں ناولوں کی پروف ریڈنگ کے لیے ایک نوجوان تعلیم یافتہ لڑکی کی ضرورت ہے۔ تعلیمی صلاحیت کچھ بھی ہو مگر رومانی ناول پڑھنے سے دلچسپی رکھتی ہو''۔

اشتہار میں یہ آخری فقرہ میں نے اس لیے لکھوایا تھا کہ رومانی ناول پڑھنے والی لڑکیاں ناول کے اوراق سے بھٹکتی ہوئی خیالوں ہی خیالوں میں کسی ہیرو کا سراپا تراشنے لگتی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ناول کی کتابت کی تصحیح کرنے والی لڑکی میری خواہشات کی بھی تصحیح فرمانا شروع کر دے۔ میرے ادارے میں ناول نگاری، پروف ریڈنگ اور کاروباری تعلقات قائم رکھنے کے کئی شعبے ہیں۔ ہر شعبے میں مرد کام کرتے ہیں۔ لیکن جب یہ خبر پھیلی کہ پہلی بار اس ادارے میں ایک لڑکی ملازم رکھی جائے گی تو سبھی کے چہرے کھل اٹھے۔ اس خشک گلستان میں پہلی بار بہار کا ایک جھونکا آرہا تھا۔ جس روز درجنوں لڑکیاں انٹرویو کے لیے آئیں، اس روز ادارے کے سبھی لوگوں کے چہروں پر جھاڑو پھر گئی تھی یعنی سب کلین شیو تھے۔ جن کی مونچھوں کے بال کہیں کہیں سے سفید ہو رہے تھے انہوں نے خضاب کا سہارا لیا تھا یا پھر اپنی مونچھیں منڈوا دی تھیں کیونکہ لڑکی مستقل طور سے آنے والی تھی بار بار خضاب لگانے کی زحمت کون گوارا کرتا۔

عورت بڑی ظالم شے ہے جہاں پہنچتی ہے وہاں کا نقشہ بدل دیتی ہے بلکہ وہاں کے لوگوں کے سوچنے کے انداز بھی بدل دیتی ہے۔ میں

اپنے دفتر کے ملازموں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ ایک باس کی حیثیت سے ان کے مسائل کو بھی سمجھتا ہوں۔ محدود تنخواہ پانے والے ملازموں کو موجودہ مہنگائی اتنی اجازت نہیں دیتی کہ وہ کسی دل پسند لڑکی کو اپنی فرینڈ بنا سکیں۔ کسی لڑکی کی دوستی سے زیادہ روٹی، کپڑے اور مکان کی دوستی عزیز ہوتی ہے لیکن میرے دفتر میں جو لڑکی آنے والی تھی اس کی قربت مفت حاصل ہو سکتی تھی۔ اتنے کانٹوں کے بیچ ایک پھول کھلے اور اس کے بعد وہ کسی کے حصے میں آئے یا نہ آئے مگر نظروں کی پیاس بجھتی رہتی ہے۔ گھر میں ایک ہی بیوی کی آواز سنتے سنتے کان دکھنے لگتے ہیں۔ دفتر میں ایک رس بھری آواز تو سنائی دے سکتی ہے، پھول کے قریب جا کر اسے چھو لینا ہی ضروری نہیں۔ ایک ذرا فاصلے سے پھول کا حسن نظروں کو گرماتا ہے۔ اپنی خوشبو سے آشنا کرتا ہے۔ اپنے رنگین پیراہن سے مرجھائی ہوئی آنکھوں میں رنگ برنگے خواب سجاتا ہے۔ آپ اسے تسلیم کریں یا نہ کریں مگر یہ حقیقت ہے کہ ہم جیسے بھوکے پیاسے مہذب جانوروں کے سامنے وہ اپنے حسن کا چارہ ڈالنے آ رہی تھیں۔

انٹرویو کے لیے آنے والی لڑکیاں کالی بھی تھیں گوری بھی۔ صحت مند بھی تھیں اور سوکھی سڑی بھی تھیں۔ ان کی بیرونی ساخت اور ان کے چہرے یہ بتا رہے تھے کہ کون میرے کام کی لڑکی ہو سکتی ہے۔ میں اپنے دفتر کے پرائیویٹ کمرے میں انہیں یکے بعد دیگرے بلا کر باتیں کرتا تھا پھر انہیں رخصت کر دیتا تھا۔ آخر میں وہ آئی جسے میں دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

درمیانہ قد، چمپئی رنگت، اماوس کی سیاہ راتوں کا اندھیرا سمیٹے لمبی لمبی ریشمی زلفیں جو زنجیروں کی صورت میں گندھی ہوئی تھیں اور جو شانوں پر آ کر سانسوں کی اٹھان پر لرز رہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی میری سانسیں گڑبڑا گئیں۔ گلابی رنگ کا فلیپر اور شرٹ اس کے بھرے بھرے بدن سے یوں چپکا ہوا تھا جیسے وہ لباس اس کے جسم کے نشیب فراز پر رکھ کر تراشا گیا ہو۔ مجھے یوں لگا کہ وہ ذرا زور سے سانس لے گی تو لباس کی گلابیاں جگہ جگہ سے چٹخ جائیں گی۔ سیاہ کاجل نے اس کی آنکھوں کو بادام کی صورت میں تراشا تھا۔ ایسی بڑی بڑی پھیلی پھیلی سی آنکھیں تھیں کہ میرے حواس پر پھیل گئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی ذہین آنکھوں سے چپ چاپ میرا انٹرویو لے رہی ہے اور مجھے سمجھ رہی ہے۔ یقیناً وہ سمجھدار تھی اسی لیے تو ملازمت کرنے کے لیے آنکھوں میں کاجل لگا کر آئی تھی۔ شاید وہ سمجھتی تھی کہ مرد کو سب سے پہلے عورت کی ایک چٹکی بھر نگاہ مارتی ہے۔ تیر بھی ایک چٹکی سے چھوٹ کر چلتا ہے اسی لمحے وہ تیر کی طرح میرے دل میں ترازو ہو گئی۔

''کیا میں بیٹھ سکتی ہوں''۔

''آں..... ہاں، ضرور'' میں ایک دم سے بوکھلا گیا جیسے وہ مجھے کوئی حکم دے رہی ہو۔ حالانکہ میں حاکم تھا۔ ہر ماہ چند سو روپے دے کر اس پر حکومت کرنے والا تھا مگر میں کیا بتاؤں؟ سولہ برس تک صرف ایک ہی بیوی کا چہرہ دیکھتے رہنے کے بعد پہلی بار آزادی سے ایک حسین دوشیزہ کو قریب سے دیکھ رہا تھا اس لیے ذرا گڑبڑا سا گیا تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔

''بیٹھو! تمہارا نام؟''

''یہ درانی صاحب کون ہیں؟''

وہ نظریں جھکا کر ذرا شرماتی، ذرا مسکراتی ہوئی بولی۔

''میرے ڈیڈی ہیں''۔

میں نے اسے تعجب سے دیکھا بھلا ڈیڈی کا ذکر کرتے وقت اسے شرمانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ لڑکیاں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ نہ شرمانے والی بات پر شرماتی ہیں اور شرمانے والی بات پر کھلکھلا کر ہنس دیتی ہیں۔ میں نے اس سے کہا۔

''ہمارے یہاں جب ناول چھپنے کے لیے پریس میں جاتا ہے تو دفتر میں رات کو دیر تک کام ہوتا ہے۔ کیا ایسے وقت تمہارے ڈیڈی تمہیں اوورٹائم کی اجازت دیں گے؟''

''جی ہاں! مجھے گھر والوں کی طرف سے پوری آزادی ہے۔ میری ہی محنت سے گھر کے اخراجات پورے ہوتے ہیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جو ہاتھ پیسے دیتے ہیں ان ہاتھوں کو کوئی نہیں پکڑتا، کوئی نہیں پوچھتا کہ ایک نوجوان لڑکی کے ہاتھ کتنی دیر تک اور کتنی دور تک کہاں جاتے ہیں؟''

''معلوم ہوتا ہے آپ نے چھوٹی سی عمر میں بہت سے تلخ تجربات کیے ہیں''۔

میں نے چھوٹی سی عمر اس لیے کہا کہ وہ خوش ہو جائے حالانکہ وہ ایسی کم عمر نہیں تھی۔ ایک دم پکے ہوئے پھل کی طرح تھی۔ عورت کو خوش کرنے کا موقع آئے تو وہ موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''ہاں اب بھی زندگی میں تلخیاں ہیں اسی لیے تو ملازمت کرنے نکلی ہوں۔ یہاں آتے وقت ذہن الجھا ہوا تھا کہ نہ جانے یہ ملازمت ملے گی یا بھی نہیں؟ اگر ملے گی تو تنخواہ کتنی ملے گی؟''

میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اسے خوش خبری سنائی۔

''تمہاری ملازمت پکی ہے تنخواہ پانچ سو روپے ماہانہ ملے گی''۔

اس کام کے لیے پانچ سو روپے بہت زیادہ ہوتے ہیں مگر اس نے کچھ زیادہ خوشی کا اظہار نہیں کیا، مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ ہاتھ سے نکل جائے گی۔ میں نے جلدی سے کہا۔

''اوورٹائم کرو گی تو زیادہ پیسے ملیں گے''۔

اس نے پوچھا۔

''یعنی فاضل وقت میں کیا کام کرنا ہوگا؟''

میں نے جواب دیا۔

''میری کوٹھی میں بہت سے غیر مطبوعہ ناولوں کے مسودے پڑے رہتے ہیں۔ تم وہاں آ کر انہیں پڑھو گی اور ان مسودوں پر اپنی رائے دینے کے لیے نوٹس لکھو گی''۔

''کیا مسودہ پڑھنے کے لیے آپ کی کوٹھی میں آنا ضروری ہے؟ وہ تو دفتر میں بھی پڑھے جا سکتے ہیں''۔

کمبخت اشارہ نہیں سمجھ رہی تھی۔ یہ لڑکیوں کی بہت بری عادت ہے۔ سمجھتی بھی ہیں تو تجاہل عارفانہ سے کام لیتی ہیں۔ پہلی ملاقات میں

اسے سمجھنا مشکل تھا۔ میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں غیر مطبوعہ مسودے راز میں رکھے جاتے ہیں تا کہ دوسرے پبلشروں تک ان کی بھنک نہ پہنچے اس لیے میں انہیں دفتر نہیں لاتا ہوں اگر تم کوٹھی میں آ کر انہیں پڑھو گی تو پڑھنے کے تین سو روپے الگ سے ملیں گے۔ اس طرح تم ماہانہ آٹھ سو روپے حاصل کر سکو گی''۔

وہ ہولے سے مسکرائی جیسے آٹھ سو روپے بھی کچھ یوں ہی سے ہوں لیکن آنکھوں کی مسرت آمیز چمک کو نہ چھپا سکی۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ آٹھ سو روپے اس کی توقع سے زیادہ ہیں۔ اس نے ذرا بے نیازی سے کہا۔

''میں یہ ملازمت کروں گی مگر کوٹھی میں جانے والی بات ایسی ہے کہ ذرا سوچ کر جواب دوں گی''۔

''یہ تمہاری مرضی ہے میں نے تو تمہاری پریشانیاں دور کرنے کے لیے اضافی آمدنی کا راستہ دکھایا ہے۔ بہر حال کل سے تم ڈیوٹی پر آ جاؤ''۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھتی ہوئی بولیں ''آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ بہت مخلص اور مہربان ہیں، میں آپ کی پیشکش پر غور کروں گی''۔ وہ مسکراتی ہوئی وہاں سے گھوم کر میرے کمرے سے باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میری آنکھوں کے سامنے پھولوں سے لدی ہوئی شاخ لچکتی رہی۔ ہر نئی چیز سونے کی طرح چمکتی ہے۔ اس سنہری چمک کے سامنے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ جو سامنے سے چلی گئی تھی بس وہی بار بار نگاہوں کے سامنے لچک رہی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اسے کس طرح موم کیا جا سکتا ہے۔ میں ایک مدت سے ایسی ہی کسی حسینہ کا منتظر تھا۔ بڑے صبر سے انتظار کر رہا تھا اب وہ آ گئی تھی تو صبر نہیں ہو رہا تھا۔ نت نئے ہتھکنڈے سوچ رہا تھا کہ کسی بھی ترکیب سے وہ میرے عشق میں مبتلا ہو جائے۔

اسی وقت فون کی گھنٹی نے مجھے چونکا دیا۔ اس کی آواز ایسی کرخت تھی کہ شیشے کی شہناز چکنا چور ہو گئی۔ میں نے بڑی ناگواری سے ٹیلی فون کی طرف دیکھا۔ کوئی کاروباری کال ہو سکتی تھی۔ وہ ایک کال ہزاروں روپے کا منافع پیش کر سکتی تھی مگر اس وقت مجھے منافع کا بھی لالچ نہیں تھا۔ صرف شہناز کی تمنا تھی لیکن دفتر میں بیٹھ کر کتنے فرائض سے منہ موڑ سکتا تھا۔ مجبوراً مجھے ریسیور اٹھانا پڑا۔ دوسری طرف سے ایک لیڈی ڈاکٹر کی آواز آئی۔

''ہیلو۔ میں ڈاکٹر شازیہ بول رہی ہوں۔ کیا صادق صاحب موجود ہیں؟''

''میں صادق ہوں۔ میری بیگم کا کیا حال ہے؟''

''بہت سیریس کیس ہے۔ میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ زچگی کے وقت زچہ کی جان کا خطرہ ہے۔ آپ فوراً یہاں آ جائیں''۔

دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا۔ میں نے بھی جھنجھلا کر ریسیور کو کریڈل پر پٹخ دیا۔ کیسی خوابوں کی محفل سجی ہوئی تھی اور کیسے یہ زندگی مجھے پتھر مار رہی تھی۔ کہاں شہناز اور کہاں میری رئیسہ بیگم۔ ایک آمد بہار تھی تو دوسری رخصت بہار۔ اب شوہر کا فرض نبھانے کے لیے میٹرنٹی ہوم تک جانا ضروری تھا لہذا میں اسی وقت دفتر سے اٹھ گیا۔

میٹرنٹی ہوم کی طرف جاتے وقت میری آنکھیں کار کی ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہی تھیں اور دماغ دیوار گھڑی کی طرح ٹک ٹک کرتا ہوا کبھی شہناز کی طرف اور کبھی رئیسہ بیگم کی طرف ہو رہا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر نے کہا تھا کہ رئیسہ بیگم کی جان کو خطرہ ہے۔ یہ سن کر نہ جانے کیوں میں ذرا بھی پریشان نہ ہوا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ایک زنگ آلود چراغ بجھ رہا تھا اور ایک نئی جگمگاتی ہوئی شمع روشن ہو رہی تھی۔ میں بے ایمانی کی باتیں

دل میں چھپا کر نہیں رکھتا۔ صاف کہتا ہوں کہ رئیسہ بیگم کو رخصت ہو ہی جانا چاہیے۔ آدمی پرانا لباس کب تک پہن سکتا ہے اگر وہ لباس کسی پرانے رشتے کی یاد دلاتا ہو تو اسے زیادہ سے زیادہ اسٹور میں رکھا جا سکتا ہے۔ کبھی کبھی پرانی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے اسٹور میں جھانک کر دیکھا جا سکتا ہے۔ گھر میں رئیسہ بیگم کی یاد دلانے کی بہت سی چیزیں تھیں پھر رئیسہ بیگم کی کیا ضرورت تھی؟

آپ کہیں گے میں انسان نہیں شیطان ہوں۔ ایک وفادار اور خدمت گزار بیوی کی موت کی تمنا کر رہا ہوں۔ بظاہر آپ کی بات درست ہوگی مگر ایمان سے کہیں کہ کرنسی نوٹ کسے عزیز نہیں ہوتے؟ رئیسہ بیگم بھی مجھے اسی طرح عزیز ہے۔ مگر انگلیوں نے اس نوٹ کو چھوتے چھوتے میلا کر دیا تھا اور وہ جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ کیا آپ کسی بینک کے کاؤنٹر پر جا کر ایک پرانا نوٹ پھینک کر اس کی جگہ نیا نوٹ حاصل نہیں کرتے؟ یہ کون نہیں چاہتا کہ پرانی چیز کے بدلے نئی چیز مل جائے۔ اگر میں چاہ رہا تھا تو کون سا گناہ کر رہا تھا۔

میٹرنٹی ہوم تک پہنچتے پہنچتے میرے دماغ میں مثبت اور منفی سوچیں آپس میں لڑتی رہیں۔ مثبت سوچ مجھے اخلاق اور مروت سکھاتی رہی کہ دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں جو بڑی شرافت سے ایک ہی بیوی پر اکتفا کرتے ہیں لیکن میں نے ایسے لوگوں کو نہیں دیکھا۔ اگر دیکھا بھی ہے تو وہ لوگ اپنے حالات سے مجبور ہوتے ہیں یا اپنی شرافت کا بھرم قائم رکھنے کے لیے اپنے من کو مارتے ہیں ورنہ یہ بڑی تلخ حقیقت ہے کہ آج بھی اگر کوئی حوا زادی مسکرا کر ایک نجیب الطرفین آدم زاد کو دیکھ لے تو وہ خوف خدا کے باوجود اسکا ہاتھ تھام کر تہذیب کی جنت میں نکل جاتا ہے۔

اسپتال پہنچ کر معلوم ہوا کہ رئیسہ بیگم مرتے مرتے بچ گئی ہیں۔ زچہ اور بچہ دونوں خیریت سے ہیں۔ میں نے رئیسہ کے بیڈ پر پہنچ کر اسے دیکھا۔ وہ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آ رہی تھی۔ اس ڈھانچے پر جو کھال منڈھی ہوئی تھی وہ سادہ ورق کی طرح بالکل سفید تھی۔ سارا خون بچے نے نچوڑ لیا تھا لیکن لیڈی ڈاکٹر کہہ رہی تھی کہ میں نے اس کا خون نچوڑ لیا ہے۔ آج سے پہلے شہناز میری زندگی میں نہیں آئی تھی۔ اس کے باوجود میں نادانستگی میں یا غیر شعوری طور پر رئیسہ بیگم کو آہستہ آہستہ قتل کرتا آ رہا تھا۔

لیڈی ڈاکٹر مجھے اپنے کمرے میں بلا کر ڈانٹنے لگی۔

''دیکھیے صادق آپ جیسے پڑھے لکھے ذہین لوگ خاندانی منصوبہ بندی پر عمل نہ کریں تو یہ بڑے افسوس کا مقام ہے۔ میں نے رئیسہ بیگم کی پچھلی زچگی میں ہی آپ سے کہہ دیا تھا کہ اس عورت میں اب جان نہیں رہی۔ خدا کے لیے اسے بخش دیجئے لیکن پتہ نہیں آپ نے کتنے بچوں کے باپ بن کر ٹرافی حاصل کرنا چاہتے ہیں''۔

میں نے اسے جواب دیا۔

''بچے خدا کی دین ہوتے ہیں۔ اگر ہم انہیں وجود میں آنے سے روکتے ہیں تو دوسرے لفظوں میں ان بچوں کے قاتل بن جاتے ہیں''۔

''اسی لیے آپ اپنی بیوی کے قاتل بن رہے ہیں'' لیڈی ڈاکٹر نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''ایک عورت جو آپ کے گھر کو جنت بناتی ہے جو آپ کی آئندہ نسل کو اپنی گود میں پالتی ہے، آپ اس عورت سے محبت کیوں نہیں کرتے؟ جو آپ کی اولاد کو دودھ پلاتی ہے آپ اسے قطرہ قطرہ زہر دیتے ہیں۔ کیا یہ شرم کی بات نہیں؟''

میں نے غصے سے کہا۔

''ڈاکٹر میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں کہ آپ اس انداز میں گفتگو کر رہی ہیں۔ آپ اپنا رویہ درست کریں''۔

لیڈی ڈاکٹر کو ہوش آ گیا کہ وہ جوش میں باتیں کر رہی ہے۔ وہ ایک گہری سانس چھوڑتی ہوئی بولی ''سوری مجھے آپ کے ذاتی معاملات میں نہیں بولنا چاہیے۔ صرف ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے سمجھانا چاہیے مگر آپ سمجھنا نہیں چاہتے۔ بہرحال آئندہ آپ اپنی بیگم یہاں نہ لائیں۔ اس شہر میں اور بھی سینکڑوں میٹرنٹی ہوم ہیں''۔

''آپ کی اطلاع کا شکریہ''۔

میں اٹھ کر جانے لگا۔ لیڈی ڈاکٹر نے آواز دے کر کہا۔

''ایک بات سنتے جائیں۔ بچے کی ولادت ہمارے لیے پرابلم بن گئی تھی۔ میجر آپریشن کے ذریعے آپ کا یہ بچہ وجود میں آیا ہے۔ زچہ کے اندر کیا خرابی پیدا ہو گئی ہے یہ میں آپ کو نہیں بتا سکتی۔ یہ آپ اپنی بیگم سے پوچھ سکتے ہیں۔ میری طرف سے یہ وارننگ ہے کہ اب اگر رئیسہ بیگم حاملہ ہوں گی تو انہیں کوئی ڈاکٹر نہیں بچا سکے گا۔ اب آپ خود سوچ لیں کہ کسے قتل کرنا چاہتے بیوی کو یا اس بچے کو جو وجود میں نہیں آیا ہے۔ میں آپ کو یہ نکتہ سمجھا دوں کہ قتل اسی کا ہوتا ہے جس کا کوئی وجود ہوتا ہے۔ اس کے سمجھنے کے لیے آپ کے پاس عقل ہے''۔

اس کی بات ختم ہوتے ہی میں کوئی جواب دیئے بغیر دروازے کو ایک جھٹکے سے کھول کر اس کمرے سے نکل آیا۔ مجھے بہت غصہ آ رہا تھا۔ چہرے سے نقاب اتر جائے تو لازمی طور سے غصہ آتا ہے۔ وہ کمبخت لیڈی ڈاکٹر مجھے قاتل کہہ رہی تھی مگر قاتل کسے کہتے ہیں؟ کسی کو چھرا گھونپ کر، کسی کا گلا دبا کر شدید زخم پہنچا کر مار ڈالنا قتل ہے لیکن میں نے تو کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی۔ اگر میں اپنی بیوی کو محبت سے آغوش میں لیتا ہوں اور اس کی سیج کا ہم سفر بنتا ہوں اور ایسے میں وہ موت کی طرف جاتی ہے تو میں کیسے قاتل کہلاؤں گا؟ اگر ہم سب کی ازدواجی زندگی میں اور سماجی زندگی میں کوئی محبت سے دھیرے دھیرے مرتی ہے یا مرتا ہے تو یہ واقعہ قتل کے زمرے میں نہیں آتا۔ قانون کے کسی زمرے میں نہیں آتا۔ اگر آتا ہو تو کوئی مجھے گرفتار کر لے۔

میں نے رئیسہ کے پاس پہنچ کر اسے بتایا کہ وہ نک چڑھی لیڈی ڈاکٹر کس طرح ہماری پاکیزہ محبت کو مجرمانہ قرار دے رہی ہے اور کہتی ہے کہ ہم آئندہ بچے پیدا نہیں کریں۔ میں اس معاملے میں خوش نصیب ہوں کہ میری بیوی کٹر مذہبی قسم کی عورت ہے۔ وہ بھی عام عورتوں کی طرح بچوں کو خدا کی دین سمجھتی ہے اور شوہر کے کرتوت بھول جاتی ہے۔ وہ بھی آنے والے بچے سے دشمنی نہیں کرنا چاہتی تھی مگر اپنی کمزوری اور بیماری کے پیش نظر دوسرا راستہ اختیار کرتی تھی یعنی مجھ سے دور ہی دور رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔

''آپ ناراض نہ ہوں۔ لیڈی ڈاکٹر میری بھلائی کے لیے کہتی ہے اس بار آپ میری ایک بات مان لیں''۔

''وہ کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ سال چھ مہینے کے لیے مجھے میرے میکے چھوڑ دیں۔ میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی ہوں۔ میکے میں رہوں گی تو شاید کچھ صحت بن جائے''۔

وہ خود ہی میرے راستے سے ہٹنا چاہتی تھی۔ میں بھی یہی چاہتا تھا کہ مجھے معلوم تھا کہ شہناز اپنی ماہانہ آمدنی بڑھانے کی خاطر مسودے پڑھنے کے لیے میری کوٹھی میں آئے گی۔ اگر رئیسہ کچھ عرصے کے لیے چلی جاتی تو اس سے اچھی اور کیا بات ہو سکتی تھی لیکن میں فوراً ہی راضی نہ ہوا۔ بڑی محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر جذباتی انداز میں کہنے لگا۔

''تم نے مجھے اپنا عادی بنا دیا ہے۔ تمہارے بغیر میں کیسے وقت گزاروں گا۔ جانے سے پہلے ایک اور تصویر اتروا لینا۔ میں رات کو سرہانے رکھ کر دیکھا کروں گا''۔

میری باتوں سے وہ پگھل پگھل جاتی تھی۔ میں کچھ دیر تک اسے اس کی اہمیت کا احساس دلاتا رہا پھر اس کے ہاتھ چوم کر اس سے رخصت ہو گیا۔ چومتے وقت میرے ہونٹ اس کے ہاتھ کی ہڈیوں سے ٹکرائے۔ بیچاری!

دوسرے دن سے شہناز ڈیوٹی پر آنے لگی۔ کچھ روز تک میں اچھی طرح اس کی صورت نہ دیکھ سکا۔ اس کے بیٹھنے کے لیے دوسرے کمرے میں ایک میز اور کرسی مخصوص کر دی گئی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ دفتر کے سبھی لوگ اسے پروف ریڈنگ سکھانے کے لیے اس طرح اس کا طواف کرتے رہتے ہیں کہ صبح سے شام ہو جاتی ہے۔ پہلے تو میرے ادارے کے مینجر نے انہیں مکھیوں کی طرح ہنکایا پھر شہناز کی میز اپنی میز کے قریب کھینچ لایا تا کہ اسے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔

جب مجھے پتہ چلا کہ مینجر صاحب اپنا کام چھوڑ کر خود ہی اس کے حصے کی پروف ریڈنگ کرتے ہیں تو میں نے شہناز کی میز اور کرسی اپنے کمرے میں منگوالی۔ شہناز میرے کمرے میں آئی تو میرا کام رکنے لگا۔ وہ کتابت شدہ مسودہ اٹھا کر میرے پاس آ کر کھڑی ہو جاتی۔

''پلیز ذرا یہ بتا دیں۔ یہاں مسودے میں لکھا کہ سلیم انارکلی سے محبت کر رہا تھا مگر محبت تو کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے۔ کیا مصنف نے یہاں غلط نہیں لکھا؟''

میں نے اسے سمجھایا۔

دیوانہ ابلیس

عشق کا قاف اور **پکار** جیسے خوبصورت ناول لکھنے والے مصنف سرفراز احمد راہی کے قلم سے حیرت انگیز اور پراسرار واقعات سے بھرپور، سفلی علم کی سیاہ کاریوں اور نورانی علم کی ضوفشائیوں سے مزین، ایک دلچسپ ناول۔ جو قارئین کو اپنی گرفت میں لے کر ایک ان دیکھی دُنیا کی سیر کروائے گا۔ سرفراز احمد راہی نے ایک دلچسپ کہانی بیان کرتے ہوئے ہمیں ایک بھولی کہانی بھی یاد دلا دی ہے کہ گمراہی اور اَن دیکھی قباحتوں میں گھرے انسان کے لئے واحد سہارا خدا کی ذات اور اس کی یاد ہے۔ **کتاب گھر پر جلد آرہا ہے۔**

''بعض حالات میں محبت نہ ہو تو کوشش کرنے کے بعد محبت ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ درست ہے محبت کی بھی جاتی ہے۔ بے تکلفی معاف، کیا تم اپنی زندگی میں ایسا کوئی تجربہ نہیں کیا؟''

وہ ذرا جھجکنے لگی۔ پھر ہچکچاتے ہوئے بولی۔

''تجربہ تو نہیں مشاہدہ کیا ہے۔ آپ کے سمجھانے سے مجھے یاد آیا۔ بہت سی عورتیں شادی کے بعد اپنے شوہر سے محبت کرتی ہیں۔ اس طرح انہیں محبت ہو جاتی ہے''۔

''تم بیاہتا عورتوں کی باتیں کر رہی ہو لیکن انارکلی بیاہتا نہیں تھی، سلیم بھی کنوارا تھا۔ تم بھی کنواری ہو مگر تم تو کہتی ہو کہ کوئی تجربہ نہیں ہوا''۔

وہ میری باتوں سے جھینپ رہی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میرا مشورہ ہے کہ تم کسی سے محبت کرو جب کرنے کے بعد محبت ہو جائے گی تو ناول کا یہ فقرہ تمہاری سمجھ میں آ جائے گا''۔

وہ جلدی سے مسودہ اٹھا کر اپنی میز پر چلی گئی۔ مگر کتنی دور جا سکتی تھی، میز تو میرے ہی کمرے میں تھی اور ذرا فاصلے پر آمنے سامنے تھی لہذا وہ شرماتے ہوئے خود کو مجھ سے نہیں چھپا سکتی تھی۔ وہ اپنی میز پر پہنچ کر مسودے پر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ اپنے جذبات کو چھپانے میں عورتوں کو کمال حاصل ہوتا ہے۔ میں اتنے فاصلے سے اس کے چہرے کو اچھی طرح نہ پڑھ سکا۔ عینک لگانے کی ضرورت تھی لیکن میں عینک لگا کر اپنی عمر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

دوسرے دن اس نے اپنی پریشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ پارٹ ٹائم کام کرے گی کیونکہ دفتر آنے جانے اور یہاں لنچ کرنے میں کافی پیسے خرچ ہو جاتے تھے ان اخراجات کو سنبھالنے کے لیے مزید آمدنی کی ضرورت تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

''میری کوٹھی سوسائٹی میں ہے وہاں آنے جانے سے مزید اخراجات بڑھیں گے۔ اگر تم چاہو تو میں شام کو دفتر سے جاتے وقت تمہیں اپنی کار میں لے جاؤں گا۔ کوٹھی میں تم جتنی دیر چاہو پڑھتی رہنا وہاں سے میں تمہیں گھر پہنچا دیا کروں گا''۔

میں اس کے لیے آنے جانے کی سہولت فراہم کر رہا تھا۔ کراچی شہر میں جسے یہ سہولتیں مل جائیں وہ بہت خوش نصیب سمجھا جاتا ہے۔ شہناز نے پہلے تو مجھے احسان مندی سے دیکھا۔ پھر مجھ سے نظریں ملیں تو سر جھکا کر بولی۔

''آپ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ مگر میں آپ کی گاڑی میں جاؤں گی تو لوگ کیا کہیں گے؟''

''یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ لوگ پیٹھ پیچھے کیا کہیں گے۔ اتنا جانتا ہوں کہ منہ پر کوئی کچھ نہیں کہہ سکے گا کیونکہ یہاں سب میرے دست نگر ہیں۔ اونچی آواز میں کوئی بول نہیں سکتا اور نیچی آوازیں سنائی نہیں دیتیں۔ اس ادارے سے باہر جو کہنے والے لوگ ہیں ان کی فکر نہ کرو۔ انہیں کچھ کہنے کے لیے جتنی دیر لگے گی اتنی دیر میں ہماری کار کئی فرلانگ آگے نکل جائے گی۔ بدنامی کے پاؤں آج تک کسی دولت مند کا پیچھا نہیں کر سکے''۔

میں نے سمجھایا۔ وہ سمجھ گئی۔ اپنی اس دنیا کو سمجھنے کے لیے غیر معمولی بصیرت اور دانائی کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ عقل اتنا نہیں سمجھاتی جتنا کہ دل کے زخم سمجھا دیتے ہیں۔ شاید وہ بھی کہیں سے زخمی تھی اسی لیے اچھی طرح سمجھ کر شام کو میری کار میں آ کر بیٹھ گئی۔

ہم اگلی سیٹ پر پہلی بار ایک دوسرے کے قریب بیٹھے تھے۔ میں سمجھ نہیں سکتا تھا کہ اس پر اس قربت کا ردعمل کیا ہو رہا ہے کیونکہ وہ دوسری

طرف کھڑکی کے باہر گزرتے ہوئے مناظر کو دیکھ رہی تھی لیکن میں اس سے بے نیاز نہیں تھا۔ دو بالشت کے فاصلے سے اس کے بدن کی آنچ مجھ تک پہنچ رہی تھی اور معلومات میں اضافہ ہو رہا تھا کہ ایسے چور آتش دان بھی ہوتے ہیں جہاں سے آنچ آتی ہے۔ آگ نظر نہیں آتی۔ میں نے پھر اس پر ایک نظر ڈالی۔ خاموشی بوجھ بن گئی تھی۔ آخر مجھے ہی بولنا پڑا۔

''باہر کیا دیکھ رہی ہو یا کچھ سوچ رہی ہو؟''

وہ کھڑکی سے نظریں پھیر کر ونڈ اسکرین پر دیکھنے لگی پھر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر کہنے لگی۔

''دیکھ بھی رہی ہوں اور سوچتی بھی جا رہی ہوں۔ جب میں فٹ پاتھ پر چلتی ہوں تو کار والے بہت اونچے اور بہت ظالم نظر آتے ہیں۔ ہم پر کیچڑ اچھال کر گزر جاتے ہیں۔ انہیں احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ دوسرے انسان کا مذاق اڑاتے ہوئے گئے ہیں۔ اب کار میں بیٹھ کر دیکھ رہی ہوں تو یہ فٹ پاتھ پر چلنے والے بہت چھوٹے اور حقیر نظر آ رہے ہیں۔ یہ کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگنے والی زندگی کیسے گزار لیتے ہیں؟ پیدل چلتے ہیں، دھوپ میں چلتے ہیں اور گھنٹوں بس اور منی بسوں کا انتظار کرتے ہیں۔ میں نے حساب لگایا ہے کہ اگر وہ پچاس برس زندگی گزارتے ہیں تو زندگی کے ساڑھے بارہ برس کراچی کے بس اسٹینڈ پر کھڑے ہو کر گزار دیتے ہیں''۔

''تم ایک اچھی اکاؤنٹنٹ بن سکتی ہو لیکن فٹ پاتھ پر چلنے والوں کی تقدیریں نہیں بدل سکتیں''۔

''میں صرف اپنی تقدیر بدلنے نکلی ہوں۔ حالات نے مجھے سکھایا ہے کہ ایک زینہ اوپر چڑھنے کا موقع آئے تو گھبرا کر نیچے نہیں اترنا چاہیے۔ آپ نے پانچ سو کے بعد مزید تین سو کی آفر دی تو میں نے قبول کر لی۔ آپ مجھے فٹ پاتھ کی دھوپ سے بچا کر ائیر کنڈیشنڈ کار میں لے آئے تو میں نہیں گھبرائی۔ اب سے پہلے میں کئی بار گھبرا کر پیچھے رہ گئی۔ اب ایسی غلطی نہیں کرنا چاہتی۔ میرے ساتھ کی لڑکیاں مجھ سے بہت آگے نکل چکی ہیں۔ ان کے پاس کار ہے، کوٹھی ہے اور بڑھاپا گزارنے والا بینک بیلنس ہے اور میرا پرس ابھی خالی ہے''۔

''ویری انٹرسٹنگ'' میری دلچسپی بڑھ گئی۔ میں نے پوچھا ''تمہارے ساتھ کی لڑکیاں کیا کرتی ہیں؟''

شہناز نے ایک حسرت بھری سانس لینے کے بعد کہا۔

''ان لڑکیوں کے موجودہ شوہر شادی سے پہلے دفتروں میں ان کے باس تھے اور ان کی پرورش کرتے تھے۔ اب شادی کے بعد وہ اپنے دولت مند شوہروں کی پرورش کرتی ہیں''۔

اس کی باتوں سے مجھ میں کافی حوصلہ پیدا ہو گیا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

''میں نہیں چاہتا کہ تمہارا پرس خالی رہے لاؤ اپنا پرس مجھے دو''۔

اس نے جلدی سے اپنے پرس کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

''یہ میری عزت ہے میں سستی خواہشات کے عوض اسے بھرنا نہیں چاہتی۔ اس سے تو بہتر ہے کہ یہ خالی رہے۔ میں نے اپنی جن سہیلیوں کی مثال دی ہے وہ بازاری نہیں تھیں۔ نہ ہی میں ایسی ہوں۔ ہم عورتیں ایک سہانے مستقبل کے خواب دیکھ کر ملازمت کرنے گھر سے نکلتی ہیں۔ میرا

پرس صرف ایک شخص کے آگے کھلے گا''۔

''وہ خوش نصیب کون ہے؟''

''وہ ہے جو مجھے ایک خوشگوار مستقبل کی ضمانت دے گا''۔

میں سمجھ رہا تھا کہ وہ آسانی سے ہاتھ آجائے گی مگر اس کی باتوں نے سمجھا دیا کہ وہ سستی لڑکی نہیں ہے ایک باعزت اور معیاری زندگی کی متلاشی ہے۔ بہرحال وہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ یہ تو وقت رفتہ رفتہ سمجھانے والا تھا مگر یہ انسان کی فطرت ہے کہ جو چیز ہاتھ آتے آتے ذرا اور سرک جاتی ہے وہ اسی کے حصول کا دیوانہ بن جاتا ہے اس طرح میرے دل میں بھی شہناز کی تمنا اور بڑھ گئی۔

''میں تمہیں ایک خوشگوار مستقبل کی ضمانت دوں گا۔ بولو کیا چاہتی ہو؟''

''کچھ چاہنے سے پہلے آپ کو سمجھنا چاہتی ہوں کہ آپ کتنی سنجیدگی سے میرا مستقبل سنوارنا چاہتے ہیں''۔

''مجھے سمجھنے کے لیے کتنا وقت لگے گا؟''

''کچھ آپ سمجھاتے رہیں گے کچھ میں اپنے طور پر سمجھنے کی کوشش کرتی رہوں گی۔ جب ہمارے درمیان چاہت کے جذبات ہوں گے تو وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوگا۔ آپ وقت کا حساب نہ کریں''۔

وہ میری توقع سے زیادہ سمجھ دار نکلی۔ اس معاملے میں لڑکیاں قدرتی طور پر اپنی عمر سے زیادہ ذہین ہوتی ہیں جوان ہوتے ہی نجانے کس طرح اپنے بچاؤ کے ہتھکنڈے سیکھ لیتی ہیں۔ یہ بات اس طرح سمجھ میں آتی ہے کہ بہت زیادہ دولت ہو اور وہ تھوڑی سی چرا لی جائے تو دولت مند پر اس کا خاص اثر نہیں پڑتا لیکن جس کے پاس شباب کی تجوری میں ایک عزت کی ہی پونجی ہو اور وہ لٹ جائے تو سہانے مستقبل کا جوا کھیلنے کے لئے کچھ باقی نہیں بچتا۔ اسی لیے ذہین لڑکیاں ابتدا ہی میں سمجھ لیتی ہیں کہ آج کل عشق کے قمار خانے میں دور ہی دور سے پونجی دکھا کر چالیں چلی جاتی ہیں۔

میری کوٹھی خالی تھی۔ میں نے دو دن پہلے ہی رئیسہ کو بچے کے ساتھ اس کے میکے بھیج دیا تھا۔ شہناز میری شاندار کوٹھی میں داخل ہوئی.....تو وہاں کی شاندار سجاوٹ کو دیر تک دیکھتی رہ گئی۔ وہاں ایک عورت کے کون سے خواب کی تعبیر نہیں تھی وہاں جتنے کمرے تھے اتنے ہی کلر ٹی وی، ریڈیو گرام، ریکارڈ پلیئر اور کیسٹ ریکارڈر تھے۔ رومانی جذبوں کو ابھارنے کے لئے رنگین نظاروں اور سرنگیت کا مکمل اہتمام تھا۔ جدید طرز کے صوفے تھے جن پر بیٹھنے والے اٹھنا بھول جاتے تھے۔ سہ طرفہ آئینوں کی سنگھار میز پر حسن و شباب کی سلامتی اور شگفتگی کے لیے میکس فیکٹری کی تمام مصنوعات موجود تھیں جنہیں میری بیمار بیوی اب استعمال نہیں کر سکتی تھی۔ ایئر کنڈیشنڈ بیڈ روم کے فرش پر پھولدار قالین ملائم اور دبیز تھا۔ چلتے وقت اس میں پاؤں اتنے پیار سے دھنستے تھے جیسے ایک جذبہ دوسرے جذبے میں دھنستا ہے اور ہولے ہولے گدگداتا ہے ویسے ہی پاؤں کے تلوؤں میں ریشمی سرسراہٹ سی ہوتی تھی۔

میں نے صاف طور سے شہناز کو سنبھل سنبھل کر چلتے دیکھا۔ وہ دھنسنا نہیں چاہتی تھی اور نہ مجھ پر اپنی کوئی کمزوری ظاہر کرنا چاہتی تھی مگر اس کی کٹورا جیسی کاجل رچائی آنکھیں خواب ناک ہوگئی تھیں۔ اس کی نگاہوں کے سامنے بہت ہی خوبصورت پلنگ تھا۔ فوم کی لچکیلی سیج پر نفت رنگ

فانوس کے کتنے ہی رنگ پھسل رہے تھے۔ ایسے بستر پر خواب پیچھے رہ جاتے ہیں اور تعبیریں پھسل کر سامنے آجاتی ہیں۔ وہ فوراً ہی پلٹ کر تیزی سے چلتی ہوئی میرے بیڈروم سے باہر آگئی۔

''آپ.....آپ کی بیگم اور بچے کہاں ہیں؟'' اس کے منہ سے الفاظ نکلتے وقت ہانپ رہے تھے۔

''وہ بچوں کے ساتھ اپنے میکے میں رہتی ہیں''۔

میرے حلق میں آواز اٹکنے لگی۔ اس نے بڑی سادگی سے رئیسہ بیگم کا پوچھا تھا مگر مجھے اس کا سوال طنز آمیز محسوس ہوا کہ آپ کے پاس تو بیگم ہے پھر دگی تگی کی کیا ضرورت ہے؟ ''بیگم کی موجودگی کے باوجود میں ایک مجرد کی زندگی گزار رہا ہوں'' میں وضاحت کرنے لگا کہ رئیسہ سدا کی بیمار ہے اور ہمیشہ مجھ سے دور رہتی ہے۔ شہناز کو متاثر کرنے کے لئے میں نے ایک رومانی ناول کا مکالمہ ادا کیا۔

''شہناز میں وہ بدنصیب ہوں جس کی زندگی میں کبھی بہار کا ایک جھونکا نہیں آیا۔ میں اس شاندار کوٹھی کے کھنڈر میں ایک زندہ لاش کی طرح رہتا تھا۔ تمہیں پہلی بار دیکھتے ہی مجھ میں از سر نو جینے کی لگن پیدا ہوگئی۔ کیا تم مجھے ایک نئی زندگی دو گی؟ کیا تم میرے دل کی اور میرے گھر کی ملکہ بن کر رہنا پسند کرو گی؟ بولو شہناز بولو.....''

مکالمے کی اٹھان پر میں نے ڈرامائی انداز میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کے لئے رسمی طور پر کمزوری سی جدوجہد کی۔ میں نے نہیں چھوڑا۔ اس نے جلد ہی ہار مان لی کیونکہ میں صرف دل کی ملکہ نہیں بلکہ اسے شاندار کوٹھی کی ملکہ بنانے کی بات کر چکا تھا۔ مناسب وقت پر مناسب بات کی جائے تو اس کا اثر ہوتا ہے۔ وہ متاثر ہو کر بولی۔

''میں نہیں جانتی تھی کہ آپ اندر سے اتنے دکھی ہیں۔ میں آپ کے تمام دکھ سمیٹ لوں گی''۔

میں نے آگے بڑھ کر اسے دونوں بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

''پلیز!'' وہ منت سماجت کرنے لگی ''میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ ابھی یہ مناسب نہیں ہے۔ اگر آپ حد سے بڑھیں گے تو میں اپنی ہی نظروں میں گر جاؤں گی۔ پلیز مجھے چھوڑ دیجئے''۔

زبردستی کا سودا اچھا نہیں ہوتا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ مگر جتنی دیر وہ میرے بازوؤں میں سمٹی رہی (وہ لمحات بہت مختصر تھے) اتنی ہی دیر میں اس کے بدن نے ادھر ادھر سے سمجھا دیا کہ یہ عورت رئیسہ بیگم کی طرح ہڈیوں کا مجسمہ نہیں ہے۔ گوشت پوست کے بلوری بدن میں چھلکتا ہوا جام ہے۔ سر سے پاؤں تک سانس لیتے ہوئے گل بوٹے اور زردوزی کا کام ہے۔ ایسا ریشمی کامدار بدن مختصر سے لمحات میں اپنا ذائقہ بتا کر پرے ہٹ گیا۔ میں اسے حسرت سے دیکھنے لگا۔ میری آغوش خالی ہوگئی تھی۔ اس کا پرس بھی خالی تھا۔

ہم دونوں تھوڑی دیر تک خالی خالی کھڑے رہے پھر میں نے اسے اپنی شرافت کا احساس دلایا۔

''تم مجھے سمجھنا چاہتی ہو، اب سمجھ لو، میں تمہارے سامنے ہوں۔ ایک شریف آدمی کی طرح میں نے تنہائی سے اور تمہاری کسی کمزوری سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ کیا اب بھی مجھے سمجھنے کے لیے کچھ رہ گیا ہے؟''

''ہاں ابھی کچھ باقی ہے کیا آپ میرے گھر تک چلنے کی زحمت گوارا کریں گے؟''

''ضرور چلوں گا۔کوئی خاص بات ہے کیا؟''

''جی ہاں۔آپ نے مجھے اپنا گھر دکھایا ہے۔اب میں اپنا گھر دکھانا چاہتی ہوں۔گھر دیکھ کر گھر والے سمجھ میں آجاتے ہیں''۔

''تو پھر نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ابھی چلو مسودے کل سے پڑھنا'' وہ کوٹھی سے باہر جانے لگی تو میں نے کہا''ہم بالکل ہی اجنبی نہیں ہیں۔میں کوٹھی کے باہر تک تمہارا ہاتھ پکڑ کر چل سکتا ہوں۔اتنی آس تو دلاؤ کہ یہ ہاتھ ہمیشہ کے لئے میرے ہاتھ میں آنے والا ہے''۔

میں نے چلتے چلتے اس کا ہاتھ تھام لیا۔وہ چلتے چلتے ذرا بل کھائی،ذرا شرمائی مگر اس بار اپنا ہاتھ میرے پاس چھوڑ دیا۔میں نے کوٹھی سے باہر جانے کا راستہ بدل دیا۔اس کی دانست میں،گھوم گھوم کر تمام مقفل دروازوں کو چیک کر رہا تھا اور میں اپنی دانست میں اس کے گورے گورے پھسلتے ہوئے ہاتھ کو دیر تک اپنے ہاتھوں میں مقفل رکھ رہا تھا۔پتہ نہیں ایسا موقع بار بار ملتا یا نہیں،جو موقع مل گیا تھا اسی کو غنیمت جان کر زیادہ سے زیادہ وقت صرف کر رہا تھا۔

شاید وہ میری نیت کو سمجھ رہی تھی چونکہ میں صرف ایک ہاتھ کو تھام کر اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا لہذا وہ مجھے ڈھیل دے رہی تھی مگر قرض مانگی ہوئی کوئی بھی چیز ہوا سے واپس کرنا پڑتا ہے۔کوٹھی کے باہر کار کا دروازہ کھولتے وقت میں نے وہ قرض حسنہ واپس کر دیا۔وہ پہلے کی طرح پھر اگلی سیٹ پر میرے قریب بیٹھ گئی اور اپنے مکان کا پتہ بتانے لگی۔

فیڈرل بی ایریا میں تین کمروں کا ایک چھوٹا سا مکان تھا۔مکان کے دروازے پر نعیم درانی کے نام کی چھوٹی سی تختی لگی ہوئی تھی۔شہناز نے انٹرویو کے دن بتایا تھا کہ درانی اس کے باپ کا نام ہے۔میں نے پورا نام نہیں پوچھا اس نے بھی نہیں بتایا تھا۔نیم پلیٹ پڑھ کر پہلی بار پورا نام معلوم ہوا۔وہ کار سے اتر کر پہلے گھر میں گئی پھر مجھے بلایا۔میں نے گھر میں جانے سے پہلے کار کے عقب نما آئینے میں اپنا جائزہ لیا کہ کہیں سے بڑھاپا تو نہیں جھلک رہا ہے۔میری آنکھیں مجھے آئینے میں ایک گبرو جوان بنا پیش کر رہی تھی اگر یہ جھوٹ ہوتا تب بھی مجھے اس بات کا یقین تھا کہ شہناز کا باپ بوڑھا ہوگا۔بوڑھے کی آنکھیں کمزور ہوں گی۔آٹے میں نمک کے برابر جو مجھ میں بڑھاپا ہے وہ اس بوڑھے کو نظر نہیں آئے گا لہذا وہ مجھے ہونے والے سسر کی شفقت سے دیکھے گا۔

شہناز مجھے سامنے والے کمرے میں بٹھانے کی بجائے مکان کے آخری کمرے میں لے گئی۔جہاں نعیم درانی ایک بستر پر لیٹا ہوا تھا۔اس کے جسم پر پاؤں سے کمر تک ایک چادر پڑی ہوئی تھی۔اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ بوڑھا نہیں ہے آنکھوں کی گہرائی بتا رہی تھی کہ زندگی کے مصائب نے اسے بوڑھا بنا دیا ہے۔اس نے لیٹے ہی لیٹے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''میں نادم ہوں۔آپ کے استقبال کے لیے اٹھ نہیں سکتا۔میرے دونوں پاؤں فالج زدہ ہیں''۔

میں نے مصافحہ کرنے کے بعد کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''یہ سن کر افسوس ہو رہا ہے کہ آپ دونوں پاؤں سے معذور ہیں۔یہ معذوری کب سے ہے؟''

''تقریباً پانچ سال سے بستر پر پڑا ہوں۔ شہناز سے شادی کرنے کے چھ ماہ بعد ہی میری ٹانگوں پر فالج گرا تھا''۔

میرے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا۔ شہناز سے نعیم درانی کی شادی؟ کہیں میں غلط تو نہیں سن رہا ہوں۔ میں نے نظریں اٹھا کر شہناز کو دیکھا تو وہ نظریں جھکا کر یہ کہتی ہوئی چلی گئی کہ ابھی چائے لے کر آرہی ہوں۔ اس کی جھکی ہوئی نظروں نے اور کترا کر وہاں سے چلے جانے کے انداز نے یقین دلایا کہ وہ اچھوتی دوشیزہ نہیں ہے شادی شدہ ہے اور اس کے نام کے ساتھ جو درانی آتا ہے وہ اس کے شوہر کا نام ہے۔

اس کا شوہر نعیم درانی کچھ کہہ رہا تھا۔ میرے کان سن رہے تھے مگر دماغ نہیں سمجھ رہا تھا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھے کس قدر اپنی توہین کا احساس ہو رہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے شہناز مجھے اپنے گھر میں ایک طمانچہ مارنے لائی تھی۔ یہ بات تو وہ مجھے میری کوٹھی میں بھی بتا سکتی تھی۔ انٹرویو کے دن بھی بتا سکتی تھی۔ یہ کیسی ذلالت تھی کہ شوہر کا نام استعمال کرتی تھی اور باپ کا رشتہ بتاتی تھی۔ یہ ہماری دنیا میں کیسے کیسے تماشے ہوتے ہیں؟ جانوروں کے سماجی اور خونی رشتے سمجھ میں نہیں آتے۔ فریب کا پردہ چاک کیا جائے تو انسانی رشتے کب سمجھ میں آتے ہیں؟

اس وقت میری سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ کسی بہانے وہاں سے بھاگ جاؤں۔ اس ماحول میں دم گھٹ رہا تھا۔ فالج زدہ نعیم کو دیکھ کر یہ بھی خیال آرہا تھا کہ میں کسی بھی بہانے سے فوراً واپس جانے کا ارادہ ظاہر کر دوں تو وہ نہ جانے کیا سوچے گا۔ میرے کچھ سمجھنے سے پہلے اس نے بڑے دکھ سے کہا۔

''آدمی کے دونوں پاؤں بے کار ہو جائیں تو اس کا باقی جسم بھی بیکار ہو جاتا ہے۔ میں فالج زدہ پیروں پر جسم کا باقی بوجھ اٹھا کر کھڑا بھی نہیں ہو سکتا۔ چلنا تو دور کی بات ہے میرے سامنے اس دنیا کے تمام راستے بند ہو گئے ہیں صرف ایک ہی راستہ ہے زندگی کی معیاد پوری کرنے کے بعد اس بستر سے اٹھ کر قبرستان کے راستے پر چلا جاؤں گا۔ چار کاندھوں پر۔ نہ جانے اس کوٹھری سے نکل کر اس راستے پر جانے کے لیے اور کتنا انتظار کرنا ہوگا؟''

وہ ایک لاش کی طرح بستر پڑا ہوا تھا مگر اس کے اندر زندگی کی جو امنگ تھی۔ اٹھنے بیٹھنے اور دوڑ کر بھاگ کر اپنی محبوبہ بیوی کو بازوؤں میں اٹھا لینے کی جو خواہشات تھیں وہ سب اس کی گفتگو کے الفاظ میں، آواز کے درد میں بین کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میرے پاؤں آپ کی طرف نہیں جا سکتے مگر آپ کے پاؤں مجھ غریب کی طرف آگے ہیں، میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ باہر کی دنیا سے کوئی تو ایسا ہے جو میری عیادت کے لیے آیا ہے''۔

میں نے اس سے متاثر ہو کر کہا۔

''آپ مایوس نہ ہوں مجھے جب بھی فرصت ملے گی میں آپ سے ملنے آیا کروں گا''۔

''صادق صاحب!'' اس نے کہا ''دنیا والے صرف ایسے ہی لوگوں سے ملتے ہیں جن سے ان کی کوئی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ پہلے شخص ہیں جو میری دلجوئی کے لیے آئیں گے''۔

اسے کیا معلوم تھا کہ میں بھی اپنی ضرورت پوری کرنے یعنی اس کی بیوی کو حاصل کرنے کے لالچ میں وہاں گیا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ میں شہناز کو کسی کی بیوی کی حیثیت سے نہیں جانتا تھا۔ اب جان کر غصہ آ رہا تھا ایسے ہی غصے کے وقت وہ چائے لے کر آ گئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ پیالی اٹھا کر گرم چائے کو پھونک پھونک کر جلدی جلدی پینے لگا۔ چائے کی گرمی سے زبان جل رہی تھی۔ شہناز کی موجودگی سے دل جل رہا تھا۔ نفرت سے میرا سینہ پھٹا جا رہا تھا۔ میں نے پیالی خالی کر کے ٹرے میں رکھ دی پھر واپسی کے لیے اٹھ گیا۔ شہناز نے مجھے نہیں روکا۔ وہ کس منہ سے مجھے روکتی؟ اس کے شوہر نے مجھے دوبارہ آنے کے لیے کہا۔ میں جھوٹا وعدہ کر کے اس دم گھٹنے والے ماحول سے نکل گیا۔

اپنی کوٹھی پر پہنچا تو وہ ایسی خالی خالی سی تھی کہ وہاں کا ہر کمرہ منہ کھولے مجھے نگلنے کو تیار تھا۔ ایک گھنٹہ پہلے وہ اسی جگہ آئی تھی اور اپنے مہکتے ہوئے وجود سے ایک رومانی فضا پیدا کی تھی۔ میں اسے اچھوتی دوشیزہ سمجھ کر اس کے متعلق کتنی دور تک چلا گیا تھا جہاں ہر وقت میری بیوی کی کھانسیاں کسی بدروح کی طرح بھٹکتی رہتی تھیں وہاں میں نے اس کی کنواری سانسوں کی سرگوشی سنی تھی۔ اب وہ لمحاتی جنت پھر جہنم میں بدل گئی تھی۔

رات کو بہت دیر تک نیند نہیں آئی۔ میں ہر کروٹ پر اس کو کوستا رہا۔ اسے بازاری عورت اور سوسائٹی گرل سمجھ کر اپنے ذہن سے دور جھٹکتا رہا۔ ایسی عورت کا کیا بھروسہ جو اپنے خاوند کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کر میرے پاس ایک سنہرے مستقبل کا خواب دیکھتی ہوئی آئی تھی۔ کبھی وہ میرے برے وقت میں مجھے بھی دھوکہ دے سکتی ہے۔ عورت ذات پر بھروسہ کرنا ہی نہیں چاہیے۔ عورت کو گالیاں دے کر، اسے کمتر اور ذلیل بنا کر بڑا سکون ملتا ہے جب یہ سوچ کر میرے دل کو اطمینان ہوا کہ بحیثیت ایک مرد ایسی عورتوں سے افضل ہوں تو مجھے نیند آ گئی۔ یہ غور کرنے اور سمجھنے کے لیے اہم نکتہ یہ کہ ہم اپنی کمینگی کے باوجود جب تک ایک کمینی عورت سے خود کو برتر نہ سمجھیں اس وقت تک نہ تو کھانا ہضم ہوتا ہے اور نہ ہی سکون سے نیند آتی ہے۔

دوسرے دن میں دیر تک سوتا رہا۔ اس لیے دیر سے دفتر پہنچا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اب منہ نہ دکھائے گی مگر وہ اپنی میز پر سر جھکائے پروف ریڈنگ میں مصروف تھی۔ میرے جی میں آیا اسی وقت اسے ملازمت سے الگ کر دوں۔ مگر ذاتی کشیدگی کے باعث کسی کے پیٹ پر لات مارنا اچھی بات نہیں ہے اس لیے میں نے اسے برداشت کر لیا۔ تمام دن مجھ سے کام نہ ہو سکا کیونکہ وہ سامنے میز پر بیٹھی ہوئی تھی۔ بار بار میری نگاہیں اس طرح بھٹک جاتی تھیں۔ الو کی پٹھی ایسی جاذب نظر تھی کہ نظروں کو جذب کر لیتی تھی۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں مگر اٹھی ہوئی نگاہوں کی حشر سامانی مجھے یاد آ رہی تھی۔ وہ مجھے نہیں دیکھ رہی تھی لیکن جب دیکھا کرتی تھی اس وقت خواہ مخواہ اس بات کا یقین ہو جاتا تھا کہ وہ خوب صورت آنکھیں صرف مجھے دیکھنے کے لئے بنائی گئی ہیں۔

میں ٹھہر ٹھہر کر اسے دیکھ رہا تھا اور اس کے چہرے کا ایک ایک نقش مجھے سمجھا رہا تھا کہ ایسی حسین عورت کسی نصیب والے کے حصے میں آتی ہے۔ پہلے اسے ہمیشہ کے لیے میں اپنانا چاہتا تھا اب یہ کوئی ضروری نہیں تھا۔ ایسی حسین اور دلنشین عورت کے ساتھ صرف رنگین لمحات گزارے جا سکتے ہیں، سنجیدگی سے محبت کرنا حماقت ہے۔ میں نے اپنے آپ کو ٹٹولا تو یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی کہ گھر میں بیوی تو موجود ہے، ایک محبوبہ نہیں تھی۔ دراصل میں ایک محبوبہ یا دوسرے لفظوں میں ایک داشتہ کا خواہش مند تھا۔ میں نے پھر ایک بار نظریں اٹھا کر شہناز کو دیکھا تو اس کے لیے میرے خیالات یکسر بدل گئے۔ اب وہ ایسا کھلونا نظر آ رہی تھی جو اپنی عمر کی چابی سے جوانی کی مدت تک چلتا ہے پھر وہ مرد کے لیے بیکار ہو جاتی ہے۔ میری

بیوی بیکار ہونے کے باوجود بیکار نہیں ہوئی تھی کیونکہ وہ میری بیوی تھی۔

دوپہر کو لنچ کے بعد وہ میرے پاس میز کے قریب آ کر کھڑی ہوگئی۔ اس سے یہ طویل خاموشی برداشت نہیں ہوسکی تھی۔ وہ مسودہ لے کر پوچھنے کے بہانے سے چلی آئی۔ اس طرح بے اعتنائی برتی جائے تو عورت پیچھے پیچھے چلی آتی ہے۔ میں نے پھر بڑی بے نیازی سے کہا۔

''مسودہ مینیجر کے پاس لے جاؤ اور جو کچھ پوچھنا ہے اس سے پوچھ لو.....''

وہ جانے کے لئے میرے قریب نہیں آئی تھی ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی پھر آہستگی سے بولی۔

''میرے والد کا نام شہاب درانی ہے۔ اپنے باپ کے نام کی مناسبت سے میرا نام شہناز درانی ہے۔ جب سے میں پیدا ہوئی باپ کا یہ نام میرے نام کے ساتھ چلا آ رہا ہے اسی لیے انٹرویو کے دن میں نے صرف اپنے باپ کا ہی ذکر کیا تھا''۔

میں نے نفرت سے منہ بنا کر کہا۔

''تم باتیں بنا کر اپنی غلطی کو نہ چھپاؤ۔ شادی کے بعد عورت باپ کا نہیں، شوہر کا نام لیتی ہے''۔

''آپ درست کہتے ہیں مگر میں شادہ شدی ہونے کے باوجود خود کو کسی کی بیوی نہیں سمجھتی۔ کیا نعیم نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ شادی کے چھ ماہ بعد ہی اس کی دونوں ٹانگوں پر فالج گرا تھا۔ دنیا والوں کی نظروں میں میری شادی ہو چکی ہے لیکن میرے اندر کوئی جھانک کر نہیں دیکھ سکتا کہ کس طرح میں اپنے سہاگ کا سوگ منا رہی ہوں۔ میں خود کو کیا کہوں؟ بدنصیب کنواری یا سہاگن بیوہ؟''

میری ساری نفرت ڈھل گئی۔ میں اسے دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ واقعی اسے کیا کہا جا سکتا ہے۔ میں نے اس پہلو پر غور نہیں کیا تھا کہ نعیم فالج زدہ ہے اور شہناز پر کیا بیت رہی ہوگی اور وہ اپنی عمر کے سہانے شب و روز کیسے گزار رہی ہوگی۔ میں نے اس سے کہا۔

''ایسی بات ہے تو تمہیں نعیم سے قطع تعلق کر لینا چاہیے''۔

''کھانا باسی یا خراب ہو تو اسے پھینکا جا سکتا ہے۔ انسان کو نہ پھینکا جا سکتا ہے نہ اس کے برے وقت میں اس کا ساتھ چھوڑا جا سکتا ہے۔ آخر محبت اور مروت بھی تو کوئی چیز ہے۔ آپ کی بیگم دائمی مریضہ ہیں۔ کیا آپ ان کا ساتھ چھوڑ سکتے ہیں؟''

میں نے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھا تو پتہ چلا کہ پچھلی محبتوں سے قطع تعلق نہیں کیا جا سکتا۔ اگر میں اپنی بیمار بیوی کو چھوڑ دوں تو انسانوں کی دنیا میں انسان کیسے کہلاؤں گا اور شہناز جیسی عورتیں تو ہمیشہ بدنامی کے گڑھے کے پاس کھڑی رہتی ہیں۔ جہاں ان سے ذرا بھول چوک ہوئی، جہاں انہوں نے مجازی خدا کی ذرا سی برائی کی، وہاں ان پر نفرت کے پتھر برسنے لگتے ہیں۔ دوسری شادی کرنے کے باوجود بدنامی کے گڑھے سے نہیں نکل سکتیں۔ ان کا دوسرا شوہر بھی بے وفائی کے طعنے ضرور دیتا ہے۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ پھر مدھم لہجے میں بولی۔

''میں دن میں اپنی ذہنی الجھنوں میں گرفتار رہتی ہوں۔ نعیم بہت مجبور ہے۔ میں اس مجبور کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔ اس کے باوجود سوچتی ہوں کہ زندگی کی تمام خواہشیں کیا اسی طرح خاموشی سے دم توڑتی رہیں گی۔ کوئی تو ایسا راستہ ملے، کوئی تو ایسی صورت نکلے کہ میں بے وفا اور بے مروت نہ کہلاؤں اور زندگی کی ساری مسرتیں میرے دامن میں سمٹ کر آ جائیں''۔

''ہاں میں بھی کچھ ایسا ہی سوچتا ہوں کہ بیوی گھر کی چار دیواری میں قید رہے اور گھر سے باہر زندگی کی ساری مسرتیں اور خواہشیں تمہارے روپ میں مل جائیں۔ انسان قناعت پسند نہیں ہے۔ ہم جس محرومی کی آگ میں جل رہے ہیں وہاں قناعت پسندی ہم سے پہلے جل کر راکھ ہو جاتی ہے''۔

میں اپنی بات کہہ کر اس کا منہ تکنے لگا۔ جو بات میں نے کہی، وہی بات اس کے دل میں تھی۔ شرافت سے اور تہذیبی اصولوں سے کوئی صورت نہیں نکلتی کہ محرومی کی آگ کو کس طرح بجھائے، جب کوئی راستہ نہیں ملتا تو بہت ٹیڑھے میڑھے راستے نکل آتے ہیں اور انسان سہم سہم کر ان راستوں پر قدم رکھنا شروع کر دیتا ہے۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''اگر ہم اس طرح ملتے رہیں تو یہ کوئی بری بات تو نہ ہوگی؟''

''ہاں! مرد کے لئے کوئی بات بری نہیں ہوتی۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ گھر کی چار دیواری سے باہر کوئی ساتھی ہو۔ اتنی بڑی دنیا کے اتنے لمبے لمبے راستوں پر کوئی کب تک اکیلا چل سکتا ہے۔ اگر میں کسی نوجوان کا ساتھ تلاش کرتی تو راستے کے کسی موڑ پر وہ یہ کہہ کر میرا ساتھ چھوڑ سکتا تھا کہ میں کسی فالج زدہ کو ٹھیس پہنچا کر آئی ہوں۔ کئی برس کے بعد کل میرے دل میں آپ کے لیے جگہ پیدا ہوئی۔ یہ سوچ کر کہ آپ مجھے طعنہ نہیں دیں گے کیونکہ آپ بھی کسی مریضہ کے دل کو ٹھیس پہنچا کر میری طرف بڑھ رہے ہیں اور اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ اتنے لمبے لمبے راستوں پر نہ کوئی اکیلا چل سکتا ہے نہ کوئی اکیلی چل سکتی ہے۔ ان حالات میں کیا ہوتا ہے، کیا آپ بتا سکتے ہیں؟''

''ہاں ان حالات میں چور رشتے قائم ہوتے ہیں۔ اوپر سے تہذیب اور شرافت کا خول چڑھا رہتا ہے اندر سے خواہشات کی آگ سلگتی رہتی ہے۔ آج تک اس دنیا کا کوئی تہذیبی اصول اس بارود کو نہیں بجھا سکا۔ ہم اپنے جیسے انسانوں کے اندر جھانک کر دیکھیں تو کتنی ہی جگہ اس بارود کے دھماکے سے تہذیب کی دھجیاں اڑتی نظر آتی ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ہم سے کوئی کھل کر اس چور رشتے کا اظہار نہیں کرنا چاہتا۔ پہلے نالیاں زمین کی سطح پر بہتی تھیں اب زمین کی تہہ میں بہتی ہیں اور اوپر سے اجلے لباس کا ڈھکنا چڑھا دیتے ہیں''۔

شہناز نے مایوسی سے کہا۔

''یہ تو تقریر ہوگئی۔ ایسی تقریریں سماج کے مصلحین اور لیڈروں تک یا مصنفین کے قلم تک اچھی لگتی ہیں۔ اگر یہ باتیں قلم کی نوک سے باہر آجائیں تو اپنے اندر تھوک کا ذخیرہ رکھنے والے دوسروں پر تھوکتے ہیں، مگر ہم کیا کریں گے؟''

''وہی کریں گے جو حالات کا تقاضا ہے اگر نہیں کر سکیں گے تو تسبیح لے کر ایک گوشے میں بیٹھ جائیں گے کیونکہ ایک گوشے میں بیٹھ کر دنیا بھر کی ضروریات اور خواہشات سے پیچھا چھڑایا جا سکتا ہے''۔

''وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

''مگر یہ چور رشتہ بدنام کر دے گا، دستور کے مطابق آپ کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ ہم جیسی عورتوں کے سماجی رشتوں میں لچک کیوں نہیں پیدا ہوتی۔ یہ درست ہے کہ مذہبی اور قانونی اصولوں کے تحت عورت ایک فالج زدہ شوہر سے قطع تعلق کر سکتی ہے لیکن انسانی ہمدردی کا تقاضہ ہے کہ ان حالات میں ایسے مجبور خاوند کا ساتھ نہ چھوڑا جائے۔ وفا بھی تو کوئی چیز ہے۔ پیار بھی تو کسی جذبے کا نام ہے۔ آپ یقین

کریں جب میں نعیم کو بستر پر بے یارومددگار پڑا دیکھتی ہوں تو میرا دل محبت اور ہمدردی کے جذبے سے بھر جاتا ہے اور جب میں اپنے بستر پر تنہا لیٹی رہتی ہوں تو میرے اپنے جذبات اور خواہشات میری انسانی ہمدردی کے باوجود بغاوت کرنے لگتے ہیں۔ میرے اندر پلنے والے دکھ سے کوئی واقف نہیں۔ میں فیصلہ نہیں کر سکتی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے"۔

"تو پھر آپ وعدہ کریں کہ کوئی حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے ہم اس نئے راستے پر کوئی غلطی نہیں کریں گے"۔

"میں وعدہ کرتا ہوں"۔

میں نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ اس نے میرے ہاتھ پر اپنا نازک سا ہاتھ رکھ دیا۔ جس کسی بات کا عہد کیا جاتا ہے تو اس عہد کو مستحکم بنانے کے لئے ہم آپس میں ہاتھ ملاتے ہیں۔ ہم نے بھی ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا کہ کوئی غلطی نہیں کریں گے مگر اس کا ہاتھ تو میرے ہاتھ میں آ ہی گیا تھا۔ اس کے ہاتھ آنے میں کتنی دیر لگتی؟ غلطی کی ابتدا ہو چکی تھی یوں دیکھا جائے تو ہم نے ہاتھ ملا کر ایک دوسرے کو غیر شعوری طور پر چھونے کا بہانہ تلاش کر لیا تھا۔ اکثر غلطی کا آغاز شعوری طور پر نہیں ہوتا۔

دیکھتے ہی دیکھتے ہماری دنیا بدل گئی۔ شہناز سے پہلے یہ دنیا بلیک اینڈ وہائٹ نظر آتی تھی اب وہ میرے قریب آئی تو رنگوں کا اک ہجوم لے کر آئی۔ اب میں جہاں سے گزرتا مجھے عمارتوں کے، باغیچوں کے پھولوں کے اور گزرنے والی کاروں کے رنگ الگ الگ واضح طور سے نظر آتے اگر عورت کا وجود نہ ہوتا تو مرد کو رنگوں کی پہچان نہ ہوتی۔ شہناز کے احساسات بھی کچھ ایسے ہی تھے۔ وہ اکثر کہتی تھی۔

"اب میری زندگی میں دور دور تک مایوسی کے سائے نہیں ہیں۔ آپ کو پا کر ایک مضبوط سہارے کا یقین ہوتا ہے کیونکہ عورت کسی قابل اعتماد سہارے کے بغیر رشتوں کے ہجوم میں بھی تنہا رہتی ہے۔ اب میں نعیم کے پاس جاتی ہوں تو خیال مجھے پریشان نہیں کرتا کہ میں ایک ٹوٹی ہوئی عورت ہوں بلکہ اب میں پہلے زیادہ نعیم کی خدمت کرتی ہوں۔ آپ میری محبت ہیں لیکن وہ میرا فرض ہے اور کوئی عورت بھی فرض کو بھول کر سچائی سے محبت نہیں کرتی۔ کاش کہ ایسا نکاح بھی پڑھایا جا سکتا کہ جو نعیم جیسے شوہر کے لیے فرض تک محدود ہوتا اور ایسی محبت کا اجازت نامہ حاصل ہوتا جس کے تحت میں آپ کی دنیا کو جنت بنا دیتی"۔

"ایسا کبھی نہیں ہوگا شہناز، ایسا اسی وقت ہوگا جب قیامت سے پہلے اولادماؤں کے ناموں سے پکاری جائے گی۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا صرف ویسا ہوگا جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں یعنی چور رشتے....."

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ میرے بیڈروم میں ایک صوفے پر میرے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ ہماری ملاقات کو چھ ماہ گزر چکے تھے۔ اتنی مدت میں، میں صرف اس کے ہاتھ کو پکڑتا آیا تھا۔ اس روز میں نے اپنا دوسرا ہاتھ اس کی پشت پر سے لے جا کر اس کے شانے پر رکھا۔ وہ ذرا کسمسائی مگر جدوجہد نہیں کی۔ میں نے حوصلہ پا کر اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔ تب اس نے اعتراض کیا۔

"نہیں ہم کوئی غلطی نہیں کریں گے"۔

"ہاں غلطی نہیں کریں گے"۔ میں نے اس کے کان کے قریب جذبات سے ہانپتی ہوئی سرگوشی کی "لیکن پیار کرنا تو کوئی غلطی نہیں ہے"۔

اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے، لبوں کی کلیاں کھلیں پھر کچھ کہنے سے پہلے ہی میں نے اپنے ہونٹ ان پیاسی کلیوں پر رکھ دیئے۔ مدت سے بہار کا جھونکا نہیں آیا تھا۔ رات کی کوکھ سے صبح بہاراں کی شبنم نہیں ٹپکی تھی پہلی بار میرے ہونٹوں کی نمی نے پھول کی پنکھڑیوں کو تر بتر کیا تو اس کے حلق سے ایک لطیف سی کراہ نکلی۔ وہ جدوجہد کرنا بھول گئی۔ جب سانس لینا دوبھر ہو گیا تو میں نے ذرا الگ ہو کر دیکھا۔ پنکھڑیوں کی گلابی رنگت سرخ ہو گئی تھی۔ رخسار آنچ دے رہے تھے اور آنکھیں بھیگ رہی تھیں وہ میرے سینے پر سر رکھ کر سسکیاں لینے لگی۔

''میں کیا کروں؟ میری سمجھ میں نہیں آتا مجھے ڈر لگتا ہے، بہت ڈر لگتا ہے''۔

میں نے تسلیاں دینے کے بہانے اپنا ہاتھ ادھر سے ادھر پھیرتے ہوئے اسے سمجھایا۔

''ایک ڈر کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا ڈر پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ تم ڈرتی رہو گی تو ایک دن اپنی جوانی کا ماتم کرنے کے لئے بوڑھی ہو جاؤ گی۔ کوئی اس المناک حادثے کو نہیں سمجھ سکے گا کہ تمہاری جوانی کو خوف اور شرم کی دیمکوں نے کس طرح کھا لیا ہے۔ تمہارے بڑھاپے کو دیکھ کر کوئی یہ سمجھنے کی زحمت گوارا نہیں کرے گا کیونکہ بڑھاپا ایک لعنت ہے اور سمجھنے کے لئے ہمارے اطراف جوان عورتوں کا میلہ لگا رہتا ہے۔ ایسے میں کسے فرصت ملے گی کہ وہ تمہارے بارے میں سوچے اگر تم صحیح معنوں میں زندہ رہنا چاہتی ہو تو دوسروں کو اپنے متعلق سوچنے پر مجبور کرو''۔

ایسے مرحلے پر زیادہ سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ وہ سہاگن بیوہ سہاگ کی خوشیوں کی تلاش میں بھٹکتی ہوئی اس مقام تک پہنچ گئی تھی لہذا میں اس اسے مقام سے آگے لے جانے لگا تو وہ گھبرا کر بولی۔

''میں بدنام ہو جاؤں گی''۔

عشق کا قاف

عشق کا قاف سرفراز راہی کے حساس قلم کی تخلیق ہے۔ ع ش ق.....عشق.....ازل سے انسان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا یہ جذبہ جب جب اپنے رخ سے حجاب سرکاتا ہے' انہونیاں جنم لیتی ہیں۔ مثالیں تخلیق ہوتی ہیں۔ داستانیں بنتی ہیں۔ ''عشق'' کی اس کہانی میں بھی اسکے یہ تینوں حروف دمک رہے ہیں۔ ''عشق کا قاف'' میں آپ کو عشق کے عین' شین اور قاف سے آشنا کرانے کے لئے سرفراز راہی نے اپنی راتوں کا دامن جن آنسوؤں سے بھگویا ہے۔ اپنے احساس کے جس الاؤ میں پل پل جلے ہیں' ان انگارہ لمحوں اور شبنم گھڑیوں کی داستان لکھنے کے لئے خون جگر میں موئے بیان کیسے ڈبویا ہے' آپ بھی اس سے واقف ہو جایئے کہ یہی عشق کے قاف کی سب سے بڑی دین ہے۔ **عشق کا قاف** کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے **ناول** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

میں نے اسے سمجھا دیا کہ بدنامی کا اندیشہ نہیں ہے خاندانی منصوبہ بندی بڑی اچھی چیز ہے (ہاں میں وہی ہوں جو اپنی بیگم کے معاملے میں خاندانی منصوبہ بندی کو برا سمجھتا ہوں) وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ ایک وقت میں جو چیز نقصان دہ ہوتی ہے دوسرے کسی وقت میں فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔ پہلے ہتھیار ایک اچھے مقصد کے لیے اپنی حفاظت کے لیے بنائے گئے تھے پھر ہم اپنے مفاد کے لیے اس ہتھیار سے اپنی برائیوں کو قتل کرنے لگے۔ خاندانی منصوبہ بندی ایک صحت مند معاشرے کے لیے عمل میں آئی ہے مگر ہمارے یہاں تو ایک گھناؤنے معاشرے کے مفاد کے بھی کام آتی ہے۔ اس دنیا میں یہی ہوتا ہے کہ کوئی ایک راستے کے روشن کنارے پر چلتا ہے کوئی تاریک کنارے پر۔

خواب گاہ خاموش تھی ہم خاموش تھے، تنہائی سانسیں لیتی ہوئی بول رہی تھی۔ بستر کے سرہانے والی میز پر شہناز کا پرس رکھا ہوا تھا۔ پہلی بار جب وہ میرے ساتھ میری کار میں بیٹھ کر میری کوٹھی میں آ رہی تھی اور اس نے اپنی سہیلیوں کی باتیں کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس کا پرس خالی ہے تو میں نے اس کے پرس کے خلا کو پر کرنا چاہا تھا۔ وہ منظر مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اس نے فوراً ہی انکار کرتے ہوئے پرس کو سینے سے لگایا تھا جیسے وہ اپنی عزت کو کلیجے سے لگا رہی ہو۔ وہ عزت نما پرس میری خواب گاہ میں پڑا ہوا تھا۔ وہ بہت ہی خوبصورت پرس تھا۔ اس کے بدن پر رنگ برنگے موتی جڑے ہوئے تھے۔

وہ قیمتی موتی کہیں سے ابھرے ہوئے کہیں سے ڈوبے ہوئے تھے۔ میں ایک ایک موتی کو چھو کر اس کے حسن کو سمجھ رہا تھا۔

مرد کا بٹوہ ہو یا عورت کا پرس۔ وہ ہماری سماجی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ ایک دولت مند کی طرح مالا مال ہوتا ہے یا پھر غریب کی جیب کی طرح خالی رہتا ہے۔ وہ حاملہ عورت کے پیٹ کی طرح پھولا ہوتا ہے یا رئیسہ بیگم کی طرح پچک جاتا ہے اور شہناز کے وجود کی طرح ملائم اور لچک دار بھی ہوتا ہے۔ میں نے اس ملائم پرس کی زپ کھول دی اور اس کی ضروریات اور خواہشات کے ایک ایک سکے سے پہلی بار اس کے پرس کی گود بھر دی۔

پہلے ہم ایک دوسرے کی آرزو تھے اب ایک دوسرے کی ضرورت بن گئے تھے۔ اب وہ شام کو کوٹھی میں آ کر مسودے نہیں پڑھتی تھی کیونکہ میں اس کی زندگی کے مسودے پڑھتا رہتا تھا۔ اس کی تنخواہ اتنی ہی تھی محبت کا کمیشن بڑھ گیا تھا۔ میں ہر دوسرے تیسرے دن اسے ہزاروں روپے کی شاپنگ کراتا تھا۔ اس کے نام سے ایک بینک میں اکاؤنٹ بھی کھول دیا تھا اور وہ اکاؤنٹ بڑھتا جا رہا تھا۔ اگر سطحی طور پر دیکھا جائے تو یہ ایک کاروباری رشتہ تھا میں شاپنگ اور بینک اکاؤنٹ کے ذریعے اس کی جوانی کے لمحات خرید رہا تھا لیکن مجھ سے پوچھا جائے تو میں اسے اپنے دل کی بات کہوں گا کہ وہ دن بدن میرے دل میں سماتی جا رہی تھی۔ میں اسے خرید نہیں رہا تھا بلکہ محبت اور خلوص سے اس کے کام آ رہا تھا۔ جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے وہ میرے لیے زیادہ سے زیادہ پرکشش بنتی جا رہی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ جو چیز ضرورت کے وقت فوراً ہی آسانی سے حاصل ہو جائے اس کے لیے اتنی کشش نہیں رہتی اور جو چیز دنیا والوں کے خوف سے چوری چوری حاصل ہو اس کی جاذبیت اور کشش ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ اسی لیے بیوی سے زیادہ محبوبہ حسین نظر آتی ہے۔

اگر اس حسین زندگی کو پھر گہن لگنے لگا۔ میری رئیسہ بیگم میکے سے واپس آ گئی تھی۔ آٹھ ماہ کا عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا۔ اس دوران میں کتنے ہی بہانوں سے اپنی بیگم کو اس کے میکے میں روکتا رہا تھا۔ کبھی مہینے میں دو چار دن کے لیے لاہور چلا جاتا تھا اور اسے سمجھاتا تھا کہ لاہور کی آب و ہوا اسے

صحت منداور شگفتہ بنا رہی ہے۔ کراچی کی آب وہوا اسے پھر بیمار کر دے گی۔ میں اسے آغوش میں لے کر اس خوش فہمی میں مبتلا کرتا رہتا تھا کہ اب وہ میرے لیے صحت منداور پرکشش ہوگئی ہے اور میں کراچی جا کر اس کی قربت کے لمحات کو نہیں بھولتا ہوں (قربت کے لمحات میں، میں خاندانی منصوبہ بندی کو برا کہتا تھا) نتیجہ یہ ہوا کہ آٹھ ماہ کے بعد وہ اپنے بھاری پاؤں لے کر کراچی پہنچ گئی۔

لیڈی ڈاکٹر نے پورے یقین کے ساتھ فیصلہ سنا دیا تھا کہ اس بار وہ زچگی کے دوران زندہ نہیں بچے گی۔ میں اس کا مٹکا سا پیٹ دیکھ کر فکر مند ہوگیا۔ شہناز کے لیے میں نے دو بیڈ روم کا ایک مکان اور لے لیا تھا وہاں ہماری ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں اس نے مجھے فکر مند دیکھ کر پوچھا۔

''کیا بات ہے آپ اداس نظر آ رہے ہیں؟''

''ہاں! رئیسہ پھر ماں بننے والی ہے اس بار وہ نہیں بچے گی''۔

شہناز کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوگئی پھر وہ جلدی سے نظریں جھکاتی یا نظریں چراتی ہوئی بولی۔

''خداوند کریم آپ کی بیگم کو سلامت رکھے۔ آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں؟''

''یہ باتیں میں نہیں کہتا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں۔ تین سال پہلے رئیسہ کی زچگی کے وقت ایک ڈاکٹر نے صاف طور سے کہہ دیا تھا کہ اپنی بیوی کا پیچھا چھوڑ دو نہیں تو یہ مر جائے گی مگر ہمارے خاندان میں خاندانی منصوبہ بندی کو سبھی برا سمجھتے ہیں اور یہ درست بھی ہے کہ وجود میں آنے والے بچے کو قتل کرنا ایک بہت بڑا گناہ ہے''۔

شہناز نے بڑے کمزور لہجے میں تائید کی۔

''ہاں یہ گناہ ہے۔ اللہ کی دین سے انکار نہیں کرنا چاہیے''۔

''خاندانی منصوبہ بندی کے ادارے میں فیلڈ ورک کرنے والی عورتیں ہر دوسرے تیسرے ماہ رئیسہ کے پاس آتی ہیں اور منصوبہ بندی کے لیے پی سی ٹیبلٹ وغیرہ دے کر چلی جاتی ہیں۔ رئیسہ پہلے وہ چیزیں پھینک دیا کرتی تھی اب میں وہ تمہیں لا کر دیتا ہوں۔ ہر چیز اپنے صحیح مقام پر اچھی لگتی ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق رئیسہ مجھ سے دور رہنے لگی مگر ہم ازدواجی زندگی کی ڈور کے دو سروں پر بندھے ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے سے کتنی دور بھاگ سکتے ہیں؟ پچھلے برس وہ میٹرنٹی ہوم پہنچ گئی۔ پچھلے برس اس کی حالت بہت ہی نازک تھی۔ بدن میں نام کو خون نہیں تھا۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ بنی ہوئی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر نے مجھے سخت لہجے میں سمجھایا کہ میں اپنی بیوی کو محبت سے قتل نہ کروں۔ لیکن محبت قاتل ہوتی ہے۔ یہ میں نے کبھی نہیں سنا۔ میں اپنی بیوی کو دل وجان سے چاہتا ہوں۔ اب اس میں میرا کیا قصور ہے کہ محبت کے نتیجے میں وہ پھر میٹرنٹی ہوم جانے کو تیار بیٹھی ہے۔

''ہاں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ آپ خواہ مخواہ کیوں پریشان ہوتے ہیں''۔

اس کے سمجھانے سے میں سمجھ گیا کہ مجھے پریشان نہیں ہونا چاہیے مگر میرے اندر ضمیر نام کی کوئی چیز کھٹکتی رہتی تھی جو مجھ سے چور سرگوشیوں میں کہتی تھی کہ تم غیر شعوری طور پر رئیسہ کو ہٹا کر اس کی جگہ شہناز کو لانا چاہتے ہو۔ نہیں یہ جھوٹ ہے۔ میں جھلا کر اپنے اندر چیخنے لگتا تھا۔ اچھے خاصے

چھپے ہوئے جرم کا اقرار کوئی مجرم نہیں کرتا۔ میں اعتراف نہیں کرتا تھا مگر پریشان رہتا تھا۔ شہناز کے سمجھانے سے بھی پریشانی کم نہیں ہوتی تھی اور رئیسہ نہ سلیقے سے جیتی تھی نہ مرتی تھی کہ مجھے اندر سے سکون حاصل ہوتا۔ ایک روز میں نے شہناز کے سامنے اعتراف کیا۔

''شہناز! میرے اور تمہارے درمیان اب کوئی پردہ نہیں ہے جب ہم دونوں ایک دوسرے سے ہر بات کہتے ہیں تو میں یہ بات چھپانا بھی نہیں چاہتا تھا کہ رئیسہ میری وجہ سے موت کے منہ میں جا رہی ہے''۔

شہناز نے مجھے چونک کر دیکھا۔ اسے توقع نہیں تھی کہ میں اس حقیقت کا اعتراف کروں گا۔ میں نے کہا۔

''تم میری رازدار ہو اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں دنیا والوں کے سامنے اور تمہارے سامنے بھی خود کو ایک فرض شناس شوہر ثابت کرتا ہوں کیونکہ ہزار محرومیوں کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ مجھے اپنی بیوی سے بے حد محبت ہے مگر تمہارے وجود سے زندگی کی مسرتیں حاصل کرتے وقت رئیسہ دماغ کا پھوڑا بن جاتی ہے چپکے چپکے یہ بات دل میں آتی ہے کہ کسی طرح اس سے پیچھا چھوٹ جائے۔ نہ وہ ہمیشہ کے لیے میکے میں بیٹھتی ہے اور نہ ہی جلدی سے مرتی ہے تو ایسے میں جھلاہٹ طاری ہو جاتی ہے''۔

''ہاں ایسے میں جھلاہٹ طاری ہو جاتی ہے۔ بس یہی تمنا ہوتی ہے کہ راستے کی دیوار گر جائے''۔

یہ کہتے ہی وہ کانپ سی گئی۔ بے خیالی میں وہ ایسی بات کہہ گئی جو مرد کو زیب دیتی ہے مگر عورت کو بے حیا اور بے وفا بنا دیتی ہے۔ وہ جلدی سے سنبھل کر بولی۔

''مم..... میں نعیم کو بہت چاہتی ہوں۔ میں آپ کی طرح نہیں سوچ سکتی کبھی نہیں سوچ سکتی''۔

اچانک ہی وہ دونوں ہتھیلیوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ ہائے ری عورت! منہ چھپانے سے کیا خواہشات چھپ جاتی ہیں؟ اس انسانی نفسیات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مرد ہو یا عورت ہر ایک کے دماغ میں مثبت اور منفی دو سوچیں ہوتی ہیں۔ عورت کسی کو قتل کرنے کے لیے منفی انداز میں کبھی نہیں سوچتی مگر حالات کے تحت وہ سوچ اس کی مرضی کے خلاف ضرور کبھی کبھی سر اٹھاتی ہے۔ جب وہ سر اٹھاتی ہے اور جب عورت اس ذلیل سوچ کو روک نہیں سکتی تو وہ اپنے ہی اندر مرتی ہے اور بے بسی سے منہ چھپا کر رونے لگتی ہے اور وہ رو رہی تھی مگر میں مرد ہوں میرے پاس آنسو نہیں تھے۔

''میں مر جاؤں گی'' وہ سسکیوں کی تال پر کہنے لگی ''ایسا کیوں ہوتا ہے۔ اپنا دماغ اپنے بس میں کیوں نہیں رہتا؟ ایسی بات دماغ میں کیوں آتی ہے جو عورت کو زیب نہیں دیتی۔ نعیم نے میرا کیا بگاڑا ہے وہ تو اپنی آنکھوں میں سہانے خواب سجا کر مجھے اپنی دلہن بنا کر لایا تھا۔ بدنصیبی نے اسے توڑ کر رکھ دیا۔ وہ مجبور ہے، معذور ہے میرے سہارے کا محتاج ہے۔ وہ مجھے ازدواجی مسرتیں نہیں دے سکتا مگر میں تو اپنی محبت اور توجہ دے سکتا ہوں۔ عورت ہر جگہ کاروبار تو نہیں کرتی کہ مرد سے کچھ ملے تو معاوضے میں اپنی خدمت گزاری پیش کرے ورنہ منہ پھیر لے۔ مگر میں منہ نہیں پھیروں گی۔ میں اپنے گھر سے باہر جو کچھ بھی ہوں لیکن اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر نعیم کی آخری سانس تک اس کے فالج زدہ وجود سے لپٹی رہوں گی۔ اس کے لیے کھانا پکاتی رہوں گی، اس کے میلے کپڑوں سے اس کے پسینے بو سونگھ کر انہیں دھوتی رہوں گی۔ میں اس کے نصیب کو اجلا نہیں کر سکتی، اس کے لباس کو دھو کر تو اجلا کر سکتی ہوں۔ انسان ایسا بے مروت تو نہ ہو کہ مرتے کو اور مار کر ظلم کرے یہ مجھ سے کبھی نہیں ہو سکے گا۔ اب اگر نعیم کے خلاف

میرے دل میں کوئی بات آئی تو میں زہر کھا کر مر جاؤں گی"۔

میں بڑی خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا اور دل ہی دل میں اس کی شوہر پرستی پر کڑھ رہا تھا۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ محبت تقسیم ہوتی ہے۔ میں اپنی بیوی کی محبت کو تقسیم کر کے اس کا زیادہ حصہ شہناز کو دے رہا تھا۔ شہناز بھی میری طرح یہی کر رہی تھی لیکن اعتراض کی بات یہ تھی کہ میں بیوی پرست نہیں تھا۔ وہ شوہر پرست بن رہی تھی اگر یہی اس کے سوچنے کا انداز رہا تو وہ میری بیوی کے مرنے کے بعد اپنے شوہر کو نہیں چھوڑے گی؟

"شہناز تم نے کہا تھا کہ تمہاری سہیلیاں بہت دولت مند گھرانوں میں بیاہی گئی ہیں۔ ان کے پاس کوٹھیاں ہیں، کاریں ہیں اور بڑھاپا گزارنے کے لیے بھاری بینک بیلنس ہے۔ تم بھی یہی چاہتی تھیں، یہی خواہشیں تمہیں میرے قریب لے آئیں لیکن مجھ سے شادی نہیں کرو گی تو یہ خواہشیں کس طرح پوری ہوں گی۔ میں یہ سب کچھ تمہیں بیوی بنا کر ہی دے سکتا ہوں، گرل فرینڈ کو تو صرف شاپنگ کرائی جا سکتی ہے"۔

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی،

"اپنی سہیلیوں کی طرح خواب دیکھتے وقت میں نعیم کو بھول گئی تھی جس طرح محلوں کے خواب دیکھتے وقت ہم اپنی جھونپڑیوں کو بھول جاتے ہیں۔ خواب دیکھتے وقت ہوش نہیں رہتا کہ ہم زمین کی پستی سے بندھے ہوئے ہیں اور آسمان کی بلندیوں پر اڑ رہے ہیں۔ اب ہوش آیا تو الجھن میں پڑ گئی ہوں۔ میں آپ سے دور نہیں رہ سکتی اور نعیم کو چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسے چھوڑنے کے خیال سے میرے اندر کی عورت دم توڑنے لگتی ہے"۔

مجھے اس کی باتیں سن کر بڑا غصہ آیا مگر میں نے غصے کا اظہار نہیں کیا۔ میں نے سوچا "تمہاری شوہر پرستی کی ایسی کی تیسی۔ تم جہنم میں جاؤ مگر میری جنت میں آتی رہا کرو" اس وقت میں نے اپنے دل کو سمجھایا مگر رفتہ رفتہ میرے دل میں یہ خلش بڑھتی رہی کہ وہ میرے علاوہ کسی دوسرے شخص کو بھی چاہتی ہے۔ دوسرا شخص خواہ اس کا شوہر ہی کیوں نہ ہو، عورت کی یہ دوطرفہ محبت برداشت نہیں ہوتی۔ ہم جس پر پیسے خرچ کرتے ہیں چاہتے ہیں کہ وہ ہماری ملکیت بن جائے۔ کوئی دوسرا ہاتھ ہماری جائیداد کو میلا نہ کرے۔

ملکیت بنانے کی خواہش نے عورت کو بیوی بنایا۔ یہ بدذات ایسی ہوتی ہے کہ بیوی بنائے بغیر قابو میں نہیں آتی۔ شہناز کو صرف اپنے نام سے وابستہ کرنے کے لیے یا صرف اپنے لیے ریزرو رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ میں اسے بیوی بناؤں۔ توبہ توبہ کیسی بری بات ہے کہ کوئی دوسرا بھی اسی پلیٹ میں کھانے بیٹھے۔ بے شک میں گناہ گار ہوں لیکن جب عورت کی بات ہوتی ہے تو مرد کسی دوسرے کو اس گناہ میں شریک نہیں کرتا۔

میں بعض اوقات جھنجھلا جاتا۔ ایک تو رئیسہ اسپتال پہنچ گئی تھی اور وہاں کے ڈاکٹر اور لیڈی ڈاکٹر مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے تھے کیونکہ میں اپنی بیوی کی زندگی کو تقریباً کھا چکا تھا۔ دوسری طرف شہناز نے الجھا رکھا تھا۔ ایک دن میں نے اسے صاف طور سے کہہ دیا۔

"رئیسہ اب چند دنوں کی مہمان ہے جس روز زچگی ہوگی اس روز میرے راستے کی دیوار گر جائے گی۔ مگر تمہارا راستہ رکا ہوا ہے"۔

وہ سر جھکا کر بولی۔

"میں نعیم کو رکاوٹ نہیں سمجھتی۔ میں نے کوٹھی، کار اور بھاری بینک بیلنس کے خواب دیکھنے چھوڑ دیئے ہیں"۔

''اس کا مطلب ہے تم مجھ سے شادی نہیں کرو گی۔ تم جھوٹی محبت کا فریب دے کر اب تک مجھے بے وقوف بنا رہی تھیں''۔۔

میرے غصے اور نفرت کو اس نے محسوس کیا تو ایک دم سے پریشان ہو گئی اور لرزتی ہوئی آواز میں بولی'' آپ.....آپ مجھ سے بدگمان نہ ہوں۔ میں آپ کو اتنی شدت سے چاہتی ہوں کہ کبھی دھوکہ دینے کا تصور نہیں کر سکتی''۔

میں جھڑک کر کہا۔

'' بکواس مت کرو۔ یہ کیسی چاہت ہے کہ بیک وقت دو مردوں کو چاہتی ہو۔ یہ محبت نہیں مکاری ہے۔ میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ جو عورت اپنے شوہر کو دھوکا دے سکتی ہے وہ کسی دوسرے مرد سے بھی وفا نہیں کر سکتی''۔

وہ ایک دم سے سکتے میں آ گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اسے یہ توقع نہیں تھی کہ میں اسے بے وفائی کا طعنہ دوں گا۔ اس نے بڑے کرب سے پوچھا۔

'' بے حیائی اور بے وفائی کی بات صرف عورت کے لیے کیوں کہی جاتی ہے آپ جیسے کتنے مرد بیویوں کو دھوکہ دیتے ہیں اور مجھ جیسی کتنی ہی شہنازوں کو اپنی وفا کا یقین دلاتے ہیں۔ میں نے تو آپ سے کبھی یہ نہیں پوچھا کہ آپ اپنی ایک مجبور بیوی کو دھوکہ دے کر آئے ہیں تو مجھ سے کب تک وفا کریں گے''۔

میں نے غصے میں اٹھتے ہوئے کہا۔

''ہاں میں وفا نہیں کروں گا اور تم جیسی عورت سے وفاداری کی توقع بھی نہیں کروں گا۔ تم جاؤ اپنے اپاہج شوہر کے پاس۔ تمہارے بعد مجھے تم سے بھی زیادہ حسین لڑکیاں مل جائیں گی۔ میں رئیسہ کے سانس لینے تک تمہارا انتظار کروں گا اگر تم میری شریک حیات بننے کے لئے نہیں آؤ گی تو ہمیشہ کے لیے چور رشتہ ٹوٹ جائے گا''۔

وہ بالکل ہی نڈھال ہو کر صوفے کی پشت سے ٹک گئی۔ میرے اس فیصلے نے اسے اچانک ہی توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس وقت مجھے اس کی ذہنی اذیتوں کا ذرا بھی احساس نہ ہوا۔ اس وقت وہ دو بلندیوں کے درمیان پستی میں گری ہوئی تھی۔ ایک طرف کی بلندی پر میں تھا جو اسے ایک روشن مستقبل کی طرف بلا رہا تھا۔ دوسری طرف کی بلندی پر نعیم تھا جو اسے شوہر کی خدمت گزاری اور ایک مشرقی عورت کی نیک نامی کی طرف بلا رہا تھا۔ وہ پستی میں گر کر نے رونے لگی۔ میں نے ذرا تلخ لہجے میں کہا۔

''تم اپنے من کو مار کر زندہ نہیں رہ سکتی ہو، جھوٹی شوہر پرستی کو اپنے دماغ سے نکال دو۔ وہ جو تمہارے دماغ میں ایک منفی سوچ ابھرتی رہتی ہے کہ تمہیں نعیم سے نجات حاصل کر لینا چاہیے، دراصل وہ منفی نہیں بلکہ مثبت اور صحت مند سوچ ہے۔ مرد ہو یا عورت ایسے حالات میں سبھی اپنے راستے کا پتھر ہٹا دیتے ہیں اگر تم نہیں ہٹاؤ گی تو مجھے ہمیشہ کے لئے کھو دو گی۔ میں جا رہا ہوں تم اچھی طرح سوچ لو.....''

میں اسے سوچتے رہنے کے لئے چھوڑ کر چلا گیا۔ اس دن کے بعد وہ بالکل ہی بدل گئی۔ دوسرے دن آفس آئی تو اجڑی اجڑی سی تھی۔ ویران سے چہرے پر میک اپ ایسا نظر آ رہا تھا جیسے کسی کھنڈر کی شکستہ دیوار پر رنگ و روغن چڑھانے کی کوشش کی گئی ہو۔ اس شام میں اس کے ساتھ اس

پرائیویٹ کوٹھی میں نہیں گیا تھا جو میں نے اس کے لئے خریدی تھی۔ اس سے دور رہنا ہی مناسب تھا تا کہ وہ میری کمی محسوس کرے اور میری کمی کے وقت نعیم اس کے دماغ کا بوجھ بنا رہے۔ جب ہاتھ آئی ہوئی مسرتیں ہاتھوں سے پھسلنے لگتی ہیں اور زندگی کا معذور اپاہج اور بھیانک چہرہ سامنے آتا ہے تب اس شخص کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے جو مسرتیں مہیا کرتا ہے۔ شہباز کو بھی اسی طرح میری اہمیت کا احساس ہو سکتا ہے۔

میں روزانہ اسپتال جاتا تھا۔ رئیسہ کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ اسے دنیا کا کوئی ڈاکٹر بچا نہیں سکتا تھا۔ اسے خون دیا گیا تھا اور دوسری مہنگی دواؤں کے ذریعے اس کی جان بچانے کی کوشش کی جا رہی تھی مگر اس کا معدہ اچھی دوا اور اچھی خوراک کو قبول نہیں کرتا تھا۔ کوئی اسے کس طرح بچا سکتا تھا وہ ایسی کھنڈر بن گئی تھی کہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے الجھن سی ہوتی تھی۔ میں یہی کوشش کرتا تھا کہ کھڑے کھڑے اسے تسلیاں دے کر چلا آؤں اور ڈاکٹروں کا بھی سامنا نہ ہو کیونکہ وہ مجھے نفرت سے دیکھتے ہیں اور سیدھے منہ سے بات نہیں کرتے تھے۔

دوسری طرف شہناز کے سامنے اب میں اپنی بیوی کا ذکر زیادہ کرنے لگا تھا۔ وہ اپنی شوہر پرستی دکھا چکی تھی۔ اب میں رئیسہ کے ساتھ اپنی وفاداری ظاہر کرتا تھا۔ دو دن سے میں اس کے ساتھ پرائیویٹ کوٹھی میں نہیں گیا تھا۔ دفتر میں کبھی وہ کوئی بات چھیڑنا چاہتی تو میں فوراً ہی کہہ دیتا۔

''میں بہت پریشان ہوں۔ میری رئیسہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی ہے۔ کبھی کبھی اس کی سانسیں رکنے لگتی ہیں۔ ابھی سے یہ حالت ہے تو زچگی کے وقت کیا ہوگا۔ میں تمام رات اس کے لیے دعائیں کرتا رہتا ہوں''۔

''جینے کی یا مرنے کی؟''

شہناز نے میری آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔ میں گڑبڑا سا گیا پھر جلدی سے بولا۔

''میں اس کی درازی عمر کے لیے دعا کرتا ہوں۔ وہ میری بیوی ہے وہی آخر دم تک میرا ساتھ دے گی۔ تمہاری طرح اس کے راستے میں کوئی دیوار نہیں ہے''۔

وہ بڑے دکھ بھرے لہجے میں بولی۔

''کیا آپ مجھے اسی طرح طعنے دیتے رہیں گے۔ جب آپ پہلی بار میری طرف بڑھے تو آپ کو علم ہو چکا تھا کہ میرے راستے میں دیوار ہے مگر اس وقت آپ نے اس دیوار کو نظر انداز کر دیا۔ کیونکہ اس وقت میں ایک انمول خزانہ تھی۔ آپ کے دل میں بے چینی تھی کہ یہ خزانہ حاصل ہو سکے گا یا نہیں؟ اب وہ بے چینی دور ہو چکی ہے۔ میں نے آپ کو حصول کا موقع دے کر اپنی اہمیت کھو دی ہے۔ اب میں بے شرم تو بن چکی ہوں، آپ مجھے نعیم کی طرف سے بھی بے وفا بنا دینا چاہتے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟''

''اس دنیا کا ہر شخص صرف اپنے حق میں انصاف کرتا ہے اس لیے میں تمہیں اپنا حق سمجھ کر تمہیں اپنے لیے مخصوص کرنا چاہتا ہوں ورنہ یہ چور رشتہ کب تک قائم رہے گا؟''

''میرے مرتے دم تک چلتا رہے گا۔ اس چور رشتے کی جڑیں بہت گہرائی تک اتر گئی ہیں۔ ایک عورت کے لیے اس رشتے کو توڑنا ممکن نہیں''۔

''میں خود بھی نہیں توڑنا چاہتا۔ تم میری خواہش کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میری یہ شدید خواہش ہے کہ تم صرف میری بن کر رہو، اس بات سے

اپنے والہانہ پن کا اظہار نہیں ہوتا ہے؟''

''میں آپ کی دیوانگی کو سمجھتی ہوں جو صرف میرے لیے ہے جب میں سوچتی ہوں کہ آپ مجھے اپنا بنانے کے لئے مجھ اپنا سمجھ کر غصہ کرتے ہیں تو دل میں ایک عجیب طرح کی خوشی ہوتی ہے، بڑی اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ عورت یہ چاہتی ہے کہ کوئی اسے غصہ دکھانے والا اور کوئی اسے ڈانٹنے والا بھی ہو جب میں آپ کی طرف سوچتی چلی جاتی ہوں تو بار بار نعیم کی طرف سے کمزور پڑ جاتی ہوں۔ میں بیان نہیں کر سکتی کہ ان دو دنوں کے اندر میرے دماغ میں کتنے برے برے خیالات آتے رہے ہیں۔ خدا کے لیے میرے سامنے ایسی کوئی شرط پیش نہ کریں کہ میرا دماغ نعیم کو بوجھ سمجھنے لگے۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ خدا کے لیے ایک عورت کا مان رکھ لیجئے''۔

میں فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں اس کے حسب منشا کوئی تسلی بخش جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نے رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے رئیسہ کی فکر ہے۔ میں اسپتال جا رہا ہوں اگر تم چاہتی ہو کہ میں تمہاری فکر ہی کروں تو پھر فیصلے پر عمل کرو۔ اس کے بغیر تم مجھ سے دور ہوتی چلی جاؤ گی''۔

میں وہاں سے جانے لگا تو اس نے میرا بازو تھام کر پوچھا۔

''کیا یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے؟''

''ہاں! مرد کے فیصلے نہیں بدلتے''۔

''اچھی بات ہے آپ شام کو کوٹھی میں آئیں میں بھی اپنا آخری فیصلہ سناؤں گی''۔

اس نے میرا بازو چھوڑ دیا۔ میں اس کی طرف دیکھے بغیر تیر کی طرح دفتر سے نکل گیا۔ اسپتال کی طرف جاتے وقت مجھے کسی حد تک یقین تھا کہ وہ میرے حق میں فیصلہ کرے گی۔ شہناز جیسی کوئی بھی حسین اور نوجوان عورت ایک اپاہج کے ساتھ ساری زندگی نہیں گزار سکتی۔ اس کی اپنی عمر کے کچھ تقاضے ہیں، جسم کی کچھ مانگ ہے۔ اس کی اپنی کچھ چور خواہشات ہیں جو اسے میری طرف آنے پر مجبور کر رہی ہیں۔ اگر وہ ایک مشرقی عورت کی طرح نادانی میں فیصلہ کرے گی تو میں نے اسے شہر میں ایک ایسی عورت کو بھی دیکھا ہے جو پھٹے پرانے کپڑے پہن کر اپنے اپاہج شوہر کو دو پہیوں کی ایک ٹوٹی پھوٹی گاڑی میں بٹھا کر اس گاڑی کو کھینچتی رہتی اور اللہ کے نام پر بھیک مانگتی رہتی ہے۔ شہناز کا انجام کچھ ایسا ہی عبرتناک ہوگا۔

میں اسپتال پہنچا تو وہاں رئیسہ کو اٹینڈ کرنے والی ایک نرس کو بہت پریشان دیکھا۔ وہ ایک بار کسی کام سے زچہ خانے سے باہر آئی تو میں نے اس سے رئیسہ کی خیریت پوچھی تو اس نے مجھے گھور کر نفرت سے دیکھا اور یہ کہتی ہوئی چلی گئی۔

''اگر وہ عورت مر جائے گی تو آپ کے لیے کیا فرق پڑے گا اور وہ مر رہی ہے اور ہمارے تجربات اسے بچا نہیں سکتے''۔

اس کی باتیں سن کر مجھے بہت غصہ آیا۔ میں نے اس وقت اپنے دل کو ٹٹولا تو یہی بات سمجھ میں آئی کہ میں نفرت کے قابل ہوں۔ جو میرے رحم و کرم پر زندگی گزارنے کے لئے دلہن بن کر آئی تھی اب میں اسے تقریباً قتل کر چکا ہوں مگر یہ بھی اطمینان تھا کہ اس دنیا کا کوئی قانون مجھے قاتل ثابت نہیں کر سکے گا کیونکہ محبت سے قتل کرنا کوئی جرم نہیں ہے اگر جرم ہوتا تو مجھ جیسے شوہر کم از کم سوسائٹی میں شریف زادے نہ کہلاتے۔

دوسری بار وہ نرس زچہ خانہ سے باہر نکلی تو اس نے میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ خود ہی بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔

''اور کیا ہوگا۔ اسے تو مرنا ہی تھا مر گئی بیچاری.....''

میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ مر گئی۔ میں اسے مارنا چاہتا تھا۔ خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف تقریریں کرتا تھا لیکن جب وہ مر گئی تو مجھے یوں لگا کہ سکڑ کر بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میری کمر جھک گئی ہے۔ میرے گھٹنے کانپ رہے ہیں۔ کھڑا نہ رہ سکا، قریب ہی اسپتال کی ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ اب نادم ہونے اور پچھتانے کا وقت تھا۔ جب اسے زچہ خانے سے اسٹریچر پر ڈال کر زنانہ وارڈ کے ایک کمرے میں لے جانے لگے تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایسے وقت ہر شریف مرد کو رونا چاہیے۔ ہماری اور آپ کی دنیا میں ایسے آنسوؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو سماج کے شریف مگر مچھوں کی آنکھوں سے نکلتے ہیں۔

پھر مجھے اچانک خیال آیا کہ اگر وہ مر گئی ہے تو اسے کمرے میں لے جایا گیا ہے؟ میں تیزی سے چلتا ہوا اس کمرے میں پہنچا۔ وہاں رئیسہ کو آکسیجن پہنچانے کے انتظامات کیے جا رہے تھے۔ ڈاکٹر نے مجھے دیکھتے ہی بڑی ناگواری سے ہاتھ جھٹک کر باہر کی طرف اشارہ کیا۔ مطلب یہ تھا کہ میں باہر چلا جاؤں۔ میں نے ایسی توہین کبھی برداشت نہیں کی تھی مگر اسپتال کا وہ کمرہ ایک عدالت تھا۔ ڈاکٹر منصف تھا۔ وہ مجبور تھا کہ مجھے پھانسی کی سزا نہیں دے سکتا تھا مگر اس کمرے سے نکال سکتا تھا۔

میں باہر آ گیا۔ اس وقت میں بری طرح جھنجھلایا ہوا تھا کیونکہ رئیسہ زندہ تھی اور یہ لوگ خواہ مخواہ مجھ سے نفرت کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ نرس باہر آئی تو میں نے اس کا راستہ روک کر پوچھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟ تم نے یہ کیوں کہا تھا کہ میری بیگم مر گئی ہے؟''

نرس نے حیرانی سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے کب کہا تھا کہ وہ بے چاری مر گئی ہے۔ میں تو یہ بڑبڑاتی جا رہی تھی کہ بچی بہت خوبصورت تھی مگر پیدا ہوتے ہی مر گئی۔ آپ کے دماغ میں تو آپ کی بیگم کی موت سمائی ہوئی ہے آپ اور کیوں سوچیں گے؟''

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی پھر ذرا رک کر بولی۔

''صبح تک زچہ سے کوئی نہیں مل سکتا۔ اب آپ یہاں سے چلے جائیں۔ ہمیں ڈسٹرب نہ کریں''۔

وہ اونچی ایڑی کی سینڈل کھٹکھٹاتی ہوئی چلی گئی۔ میں نے دروازے کے شیشوں سے جھانک کر دیکھا۔ رئیسہ ایک زندہ لاش کی طرح بستر پر پڑی تھی۔ وہ بڑی سخت جان تھا۔ وہ میرے لیے نہ سہی، اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے لیے جینے کا عزم کر چکی تھی۔ خدا اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ آکسیجن پہنچانے کے لیے اس کے چہرے پر شیشے کا ایک ماسک رکھا ہوا تھا۔ پھولتا اور پچکتا ہوا بریتھنگ بیگ اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ اس کی سانسیں اعتدال پر آ رہی ہیں۔

میں نادم ہو کر شہناز کے پاس آیا تو بازی پلٹ گئی تھی۔ وہ بستر پر پڑی آخریں سانسیں لے رہی تھی۔ اس کے سرہانے خواب آور

گولیوں کی ایک شیشی رکھی ہوئی تھی جو خالی ہو چکی تھی۔ میں گھبرا کر ایمبولینس کو فون کرنا چاہتا تو اس نے میری آستین پکڑ لی اور اکھڑی اکھڑی سانسوں کے ساتھ کہنے لگی۔

''بہت دیر ہو چکی ہے۔ میں نے ایک خط لکھ کر میز پر رکھ دیا ہے کہ میں اپنی خوشی سے مر رہی ہوں۔ اپنی خوشی سے جی نہیں سکتی، مر تو سکتی ہوں۔ میں نے بہت سوچا۔ بہت غور کیا۔ یہی بات سمجھ میں آئی کہ نعیم سے ہی میری نیک نامی قائم رہ سکتی ہے۔ کیونکہ مجھ جیسی عورتیں تمہاری اس مطلبی دنیا میں..... نیک نامی کے بغیر..... زندہ نہیں رہ سکتیں۔ نعیم میری زندگی ہے اور تم صرف..... ایک بہلاوا ہو..... تم میری خالی خواہشات کے پسینے کو پونچھنے والا..... صرف ایک رومال تھے..... صرف ایک ایسے..... کپڑے کا ٹکڑا تھے..... جس سے سماج کی گندگی..... پونچھ کر نالی میں پھینکا جا سکتا ہے۔ مشکل یہ کہ اس..... کپڑے کو بھی سماج کے ڈر سے..... اپنے پرس میں چھپا کر..... رکھنا پڑتا ہے..... میں تمہیں پرس سے نکال کر پھینک نہیں سکتی تھی۔ جب میرے ضمیر نے مجھے سمجھا دیا..... کہ..... کہ میں نے اپنے اعتماد کرنے والے شوہر کو دھوکہ دیا ہے..... نہ میں باحیا رہی نہ باوفا رہی..... نہ ادھر کی رہی نہ ادھر کی رہی..... تو اب میں اپنی حیثیت معلوم کرنے کے لیے..... اس کے پاس جا رہی ہوں..... جس نے مجھے..... خواہشات کا روگ دے کر اس دنیا میں پیدا کیا..... خواہشات کا روگ..... خواہشات کا..... رو..... رو.....''

وہ خواہشات کی بات کرتے کرتے چپ ہو گئی۔ ہزاروں خواہشیں تھیں اور ہر خواہش پر دم نکلتے نکلتے آخر نکل ہی گیا

O☆O

کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com

مقید خاک

ساحر جمیل سید کا ایک اور شاہکار ناول..... مقیدِ خاک..... سرزمین فراعنہ کی آغوش سے جنم لینے والی ایک تحیّر خیز داستان۔

ڈاکٹر شکیل ظفر:- ایک ہارٹ اسپیشلسٹ، جو مردہ صدیوں کی دھڑکنیں ٹٹولنے نکلا تھا..... یوساف بے:- وہ ساڑھے چار ہزار سال سے مضطرب شیطانی روحوں کے عذاب کا شکار ہوا تھا..... بیوسا:- ایک حرماں نصیب ماں، جسکی بیٹی کو زندہ ہی حنوط کر دیا گیا..... مریاقس:- اسکی روح صدیوں سے اس کے جسدِ خاکی میں مُقیّد تھی..... شیلندر رائے ہریجہ:- ایک پرائیویٹ ڈیٹکٹر، اسے صدیوں پرانی ممی کی تلاش تھی..... مہر جی:- پرکالۂ آفت، انسانی قالب میں ڈھلی ایک آسمانی بجلی..... ایکشن، سسپنس اور تھرل کا ایک نہ رکنے والا طوفان.....

یہ ناول کتاب گھر پر جلد آ رہا ہے، جسے ایکشن ایڈونچر مہم جوئی ناول سیکشن میں پڑھا جا سکے گا۔

کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com

سدا سہاگن

میں نے اسے دیکھا۔ وہ شیشہ تھی۔
میں نے ہاتھ لگایا۔ وہ پتھر تھا۔
وہ تھی اور وہ تھا۔

ایک متعفن ماحول میں ایک نازک جذبے کی کہانی
جو نازک دلوں میں اتر کر لہو کی طرح گھل جاتی ہے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب جوانی اٹھان پر تھی اور مجھے ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نظر آتی تھی۔ میں ادھ کھلی کلی اور ایک شاداب پھول کی شگفتگی کے فرق کو سمجھنے لگا۔ ایسے ہی وقت میں نے زلیخا کو دیکھا تو لگا کہ جاڑے کی ہلکی سنہری دھوپ آنکھوں کے دریچوں سے اتر کر دل کو آنچ دے رہی ہے۔

زندگی میں پہلی بار ایسا چندن سا روپ دیکھا تھا اس لیے بڑی محویت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ داتا دربار کے اس دروازے پر کھڑی ہوئی تھی جو خواتین کی آمد و رفت کے لیے مخصوص تھا۔ اس کے قریب ایک خسرا اپنے زانوں پر ڈھولک رکھے زینے پر بیٹھا ہوا تھا۔ آنے جانے والی خواتین کی بھیڑ میں وہ کبھی نگاہوں سے اوجھل ہو رہی تھی اور کبھی اجاگر ہو رہی تھی۔ حسن چھپتا رہے اور جھلکتا رہے، پردہ گرتا رہے اور اٹھتا رہے تو لمحہ بہ لمحہ جلوے کی تابناکی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ وہ چاند سا مکھڑا عورتوں کے سیلاب میں لہر لہر چمک رہا تھا۔ میں داتا صاحب سے کچھ مانگنے آیا تھا۔ کیا مانگنے آیا تھا؟ اس وقت بھول گیا تھا یعنی اس سخی داتا سے مانگنا ضرور تھا مگر دعا بدل گئی تھی۔ پہلے زبان سے مانگنے آیا تھا اب دل سے مانگ رہا تھا اور اس یقین کے ساتھ کہ وہ دینے والا میرے حسن طلب کو خوب سمجھتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھی عورت شیرینی اور اگربتیاں لے کر اس کے پاس آئی۔ خسرا زینے پر بیٹھا رہا اور وہ بوڑھی عورت کے ساتھ دربار میں داخل ہو گئی۔ میں بھی جلدی سے پلٹ کر دوسرے دروازے پر آیا جو مردوں کے لیے مخصوص تھا۔ وہاں میں نے ٹوکن لے کر جوتیاں جمع کیں اور دل کو سنبھالتا ہوا مزار مقدس تک پہنچ گیا۔ مزار کے ایک طرف مرد کھڑے دعائیں مانگ رہے تھے اور کلام پاک کی تلاوت کر رہے تھے دوسری طرف عورتیں نذر نیاز میں مصروف تھیں۔ میں نے وہاں پہنچتے ہی پہلے داتا صاحب کے حضور سجدہ کیا۔ حالانکہ سجدہ صرف خدا کے سامنے کیا جاتا ہے مگر وہاں

میری طرح اکثر لوگ سجدے کرتے ہیں۔ اس پر بحث نہیں کہ ہم ایسا کیوں کرتے ہیں بس عقیدت سے سر جھکتا ہے اور سجدے تک پہنچ جاتا ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا۔

میں سجدے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھا دیئے۔ اٹھے ہوئے دونوں ہاتھوں کے درمیانی فاصلے سے میں نے مزار کے دوسری جانب دیکھا جہاں عورتیں کھڑی ہوئیں تھیں۔ پرائی عورتوں کو دیکھنا مقصود نہ تھا۔ میں جسے داتا صاحب سے مانگنے آیا تھا اسے تلاش کر رہا تھا۔

میں اس جگہ تھا جہاں لوگ دنیا کی دولت بھی مانگنے آتے ہیں اور دل کی دولت بھی۔ اس مقدس مزار کو چھو کر ایک غریب ماں اپنی بیٹی کو سہاگن بنانے کی آرزو کرتی ہے، وہیں ایک نائیکہ اپنی بیٹی کے پاؤں میں گھنگھرو باندھنے سے پہلے یہ منت لے کر آتی ہے کہ کاروبار چل نکلا تو وہ وہاں کے لنگر خانے میں چار دیگیں پہنچا دے گی۔ وہاں ایک مجبور اور بیمار شخص بھی آتا ہے اور ایک صحت مند اسمگلر بھی۔ میں نے ایسے فلم پروڈیوسر بھی دیکھے ہیں جو ریلیز سے پہلے فلم کے ڈبے لے کر وہاں آتے ہیں۔ آدھی اگربتیاں مزار پر رکھتے ہیں، آدھی اگربتیاں فلم کے ڈبوں پر۔ پھر اس فلم کے سپرہٹ ہونے تک پانچوں وقت کی نمازیں پڑھتے ہیں۔ دراصل بے ایمانی اتنی عام ہو گئی ہے کہ اب لوگ اسے ایمان کی طرح برتنے لگے ہیں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں اپنے طور پر کسی حد تک ایک ایماندار تھا اور ایک پرائی لڑکی کی آرزو کرنا کہاں تک درست تھا میں یہ بھی نہیں جانتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ محبت کرنے والے بھی مرادیں مانگنے آتے ہیں لہذا میں بھی آ گیا تھا۔

میں نے اسے دیکھا وہ عورتوں کی بھیڑ سے گزرتی ہوئی مزار کی جالی کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی اور دعا مانگنے سے پہلے اپنے سر پر آنچل کو درست کر رہی تھی۔ وہ سرخ لباس میں تھی، لباس کی سرخی اس کے گورے مکھڑے پر جھلک رہی تھی۔ عجیب سحر انگیز حسن تھا۔ میرا دل و دماغ اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ میں دل سے دیکھ رہا تھا اور آنکھوں سے دعا مانگ رہا تھا کہ ''اے داتا! اے مظہر نور خدا! خدا سے میرے لیے اس لڑکی کو مانگ لے۔ میں اور کچھ نہیں چاہتا''۔

اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو ہاتھوں کے ساتھ اس کی نگاہیں بھی اٹھ گئیں۔ چند لمحوں تک اس کی نگاہیں مجھ پر ٹھہر گئیں۔ میں خود کو یوسف ثانی نہیں سمجھتا۔ مگر مجھ میں کوئی بات تھی یا میرے دعا مانگنے کا انداز ایسا تھا کہ وہ متوجہ ہو گئی تھی۔ شاید وہ سمجھنا چاہتی تھی کہ میں دعاؤں میں گم ہو گیا ہوں یا اس بہانے سے اسے دیکھ رہا ہوں۔ میرے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی اور وہ سمجھ گئی کہ میری نگاہیں پر اس پر مرکوز تھیں۔ اس کی پلکیں فوراً ہی جھک گئیں۔ اس کے سر کا آنچل اپنی جگہ موجود تھا پھر بھی وہ ہاتھ اٹھا کر اسے خواہ مخواہ ادھر ادھر سے درست کرنے لگی۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ وہ کچھ بدحواس سی ہو گئی ہے۔ میری نگاہوں سے چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی اس لیے اپنے دوپٹے سے بدن کو ڈھانپ رہی تھی۔

اس کے بعد دوبارہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے وقت اس نے دیکھا کہ کہیں میں اسے دیکھ تو نہیں رہا ہوں۔ میں اسے برابر دیکھے جا رہا تھا اس لیے اس کی آنکھیں فوراً ہی جھک گئیں، دونوں ہاتھ اٹھے رہ گئے تھے۔ ہمارے درمیان زیادہ سے زیادہ آٹھ دس فٹ کا فاصلہ تھا۔ مجھے صاف طور سے اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ نظر آ رہے تھے۔ وہ دعا کے لیے کھڑی تھی مگر دعا سے خالی تھی مجھے یقین تھا کہ وہ میری نگاہوں کو اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی۔

بڑی دیر تک ہم روبرو کھڑے رہے۔ بڑی دیر کے بعد اس نے پھر جھجکتے ہوئے نظریں اٹھائیں شاید اس نے سمجھا تھا کہ میں چلا گیا ہوں یا

جواباً نظریں نہ ملانے سے مایوس ہو کر اب اسے نہیں دیکھ رہا ہوں مگر میں بھی دھن کا پکا تھا۔ اسے دیکھتا ہی جا رہا تھا۔ اس نے جلدی سے سر کے آنچل کو کھینچ کر گھونگٹ بنا لیا۔

نصف چہرہ چھپ گیا۔ شرافت کا تقاضہ یہ ہے کہ جو چھپ رہا ہے اسے جبراً نہیں دیکھنا چاہیے لیکن اس کے چھپنے کی ادا اتنی پیاری تھی کہ میری نگاہیں اس کے سوا دنیا کے کسی نظارے کو دیکھنا نہیں چاہتی تھیں۔ میں اس کی اداؤں سے یہ سمجھنا چاہتا تھا کہ وہ میرے متعلق کیا سوچ رہی ہے۔ چھپنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مجھے نہ دیکھو۔ ایک مطلب یہ ہوتا ہے کہ ابھی ترستے رہو، چاند پھر کبھی گھونگھٹ سے طلوع ہوگا، یہ ایک محبوبانہ انداز ہے۔

لیکن نہیں، محبوبانہ انداز اس وقت سمجھا جاتا جب وہ جواباً مسکرا کر دیکھتی میرے لیے کوئی ہلکا سا، نازک سا اشارہ چھوڑ دیتی یا پھر ناگواری سے منہ پھیر لیتی تو یہ قصہ ہی ختم ہو جاتا۔ نہ اقرار نہ تھا نہ انکار۔ وہ ان لڑکیوں میں سے نہیں تھی جو پہلے ہی مرحلے میں آنکھیں لڑا کر حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔ اس کی معصومیت میرے لیے ایک معمہ بن گئی تھی۔

پھر وہ سر جھکا کر میری جانب دیکھے بغیر واپس جانے لگی۔ میں بھی الٹے پاؤں واپس ہو گیا۔ میں اور کہاں جاتا؟ ایک عرصے سے تنہا بھٹک رہا تھا۔ بچپن ہی میں ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ ایک ظالم چچا نے مار پیٹ کر میری پرورش کی۔ آٹو رکشہ کی ریپئرنگ ورکشاپ میں ایک روپیہ روز پر کام کرتا تھا۔ جوان ہوتے ہوتے اچھا خاصا کاریگر بن گیا ہوں۔ جنازگاہ کے قریب رکشوں کی مرمت کا ایک چھوٹا سا کارخانہ کھول لیا ہے۔ ہر ماہ ہزار روپے کی بچت ہوتی ہے۔ چچا بھی مر چکا ہے۔ میں بالکل تنہا ہوں مجھ اکیلے کے لیے ہزار روپے کی بچت بہت زیادہ ہے۔ ان دنوں یار دوست ہیرا منڈی کا راستہ دکھاتے تھے، میرے بہکنے کا وقت آ چکا تھا نہ کوئی نصیحت کرنے والا تھا اور نہ ہی میں کسی کے رعب اور دبدبے میں تھا، میرا بہکنا لازمی تھا۔ ایسے ہی وقت وہ میری نگاہوں کے سامنے آ گئی اور میرے دل میں سما گئی۔

میں تو سمجھ رہا تھا کہ تقدیر مجھے غلط راستے سے بچا کر اس اجنبی لڑکی کے راستے پر لے جا رہی تھی۔ دربار سے نکل کر وہ باہر آئی اور دروازے کے قریب مجھے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

بوڑھی عورت نے اس سے کچھ کہا، شاید اس کی گھبراہٹ کی وجہ پوچھ رہی تھی اور وہ نفی میں سر ہلا کر اس کے سوال کو ٹال رہی تھی۔ بوڑھی عورت نے بڑی محبت سے اس کی بلائیں لیں پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر جانے لگی۔ خسرا ان کے ساتھ چل رہا تھا۔ میں پیچھے دس قدموں کے فاصلے پر تھا۔ آگے جا کر وہ رک گئے۔ مین روڈ پر ٹریفک زیادہ تھی۔ سڑک پار کرنے سے پہلے وہ ذرا گردن گھما کر دیکھنے لگی کہ کہیں میں پیچھا تو نہیں کر رہا ہوں۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے جلدی سے منہ پھیر لیا اور سڑک کی جانب تکنے لگی۔

پھر وہ سڑک پار کر کے بھاٹی گیٹ کی طرف جانے لگیں۔ میں سوچتا ہوا اس کے پیچھے چل رہا تھا اور یہ فیصلہ کر رہا تھا کہ ورکشاپ میں نہیں رہوں گا، اس محلے میں ایک مکان کرائے پر حاصل کروں گا جہاں وہ رہتی ہے۔ مجھے محبت کا جواب محبت سے ملے نہ ملے مگر اب اس کے قریب رہ کر ہی دل کو قرار آ سکتا تھا۔

وہ بھاٹی گیٹ سے گزر کر آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ تنگ راستے کے اطراف صدیوں پہلے کی بوسیدہ عمارتیں تھیں۔ دو منزلہ اور تین منزلہ عمارتیں، جن کی شکستہ دیواریں اس طرح جھکی ہوئی تھیں جیسے اب تب میں گرنے والی ہوں۔ وہ آگے اور آگے بڑھتی جا رہی تھی اور آگے ہیرا منڈی کی سرحد قریب آتی جا رہی تھی۔ میرا دل ڈوبنے لگا کہ کیا وہ بدنام علاقے کی رہنے والی ہے؟ دل نہیں مانتا تھا۔ وہ ایسی شرمیلی تھی کہ مجھ جیسے اجنبی سے نظریں نہیں ملا سکتی تھی، اس کے چہرے پر ایسی معصومیت تھی جو بازار حسن کی لڑکیوں میں بھولے سے بھی نظر نہیں آتی پھر میں کیسے مان لیتا کہ وہ اس بازار کی رہنے والی ہے۔

آؤٹ آف بونڈ کا بورڈ دور سے نظر آ رہا تھا، اس کے قدم بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ اس کے چلنے کے انداز سے پتا چل رہا تھا کہ وہ اپنے پیچھے میری موجودگی کو محسوس کرتی جا رہی ہے۔ پھر وہ ممنوعہ علاقے تک پہنچنے سے پہلے ہی ایک گلی میں مڑ گئی۔ میرا خیال صحیح نکلا۔ وہ ایک شریف زادی تھی۔ جس بوسیدہ عمارت کی طرف وہ جا رہی تھی وہاں شریف لوگ رہتے تھے۔

مکان کے قریب پہنچ کر وہ رک گئی۔ محلے کے بچے اس کے آس پاس اچھلتے کودتے شور مچا رہے تھے۔

''سہاگن باجی آ گئی، سہاگن باجی آ گئی۔ باجی ہمیں تھوڑی سی شیرینی دو.....''

چاروں طرف گھومتے ہوئے بچوں کو دیکھنے کے بہانے اس نے گھوم کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے حیرانی ظاہر ہو رہی تھی جیسے پوچھ رہی ہو کہ میں کیوں اس کے پیچھے اتنی دور تک چلا آیا ہوں۔ اس بار میں نے اور توجہ سے اسے دیکھا، بچوں نے اسے سہاگن باجی کہا تھا لیکن وہ دبلی پتلی سی نازک اندام لڑکی مجھے سہاگن نظر نہیں آ رہی تھی۔ حالانکہ اس نے سرخ جوڑا پہن رکھا تھا۔ ایسے لال جوڑے تو کنواریاں بھی پہنتی ہیں۔ اس کی جسمانی ساخت ایسی تھی کہ پندرہ یا سولہ برس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ آدھ کھلی کلی کا چہرہ بتا رہا تھا کہ ابھی اس نے سہاگ کا سفر شروع نہیں کیا ہے۔

میں سوچ رہا تھا کہ خود کو مایوسی سے بچانے کے لیے ہر ممکن طریقے سے دل کو سمجھا رہا تھا۔ اسی وقت ایک مکان کا دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے اس نام نہاد سہاگن کو دیکھ کر بڑی محبت سے مخاطب کیا ''زلیخا بیٹی! داتا کے دربار سے آئی ہو۔ شیرینی کے دو دانے میری بیٹی کو بھی دو۔ تمہارے ہاتھوں میں کتنی برکت ہے۔ اے بیٹی! مجھے بھی.....'' دوسرے مکان کی کھڑکی سے کسی عورت نے آواز دی۔ پھر تو آس پاس کے مکانوں کی کھڑکیاں اور دروازے کھلنے لگے۔ کہیں سے عورتیں اور کہیں سے مرد آواز دے رہے تھے اور اسے اپنے ہاں بلا رہے تھے۔ وہ اپنے لبوں پر سنجیدہ سی مسکراہٹ لیے باری باری سب ہی کے دروازوں پر جا رہی تھی۔ کسی کے ہاتھ میں شیرینی کے دانے رکھ رہی تھی تو کوئی التجا کر کے اسے اپنے گھر کے اندر آنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ محلے کے تمام لوگ اس کی بے انتہا عزت کرتے ہیں۔ وہ کسی کے دروازے پر چلی جائے تو اس کیلئے آنکھیں بچھا دی جاتی ہیں۔

میں ایک پان والے کی دکان کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اب وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی شاید اس لیے کہ دکان کے سامنے کچھ نوجوان کھڑے ہوئے تھے۔ وہ اپنے چہرے اور لباس سے چھٹے ہوئے بدمعاش معلوم ہوتے تھے مگر وہ بھی زلیخا کو بڑی عزت اور عقیدت سے دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

''خدا کی قدرت بھی عجیب ہے کیسی کیسی مخلوق پیدا کرتا ہے۔ زلیخا کو دنیا جہان کا حسن دیا ہے مگر کسی کی کیا مجال کہ کوئی اسے میلی نظر سے دیکھ لے۔ دیکھے گا تو ساری عمر پچھتائے گا''۔

''ہاں یار!'' دوسرے نے کہا ''اس پر فرشتوں کا سایہ ہے انسان اسے چھو نہیں سکتا''۔

میں حیرانی سے ان کی باتیں سن رہا تھا وہ لفنگے جو عورت کو کھلونا سمجھتے ہیں۔ بدمعاشی پر اتر آئیں تو کسی بھی جوان لڑکی کو کاندھوں پر اٹھا کر لے جا سکتے ہیں وہ زلیخا کے متعلق ایسی باتیں کر رہے تھے جیسے اس لڑکی کو کوئی ماورائی ہستی سمجھ رہے ہوں۔ جو فرشتوں کی دنیا سے آئی ہے اور جسے انسان چھونا چاہے تو کسی عذاب میں مبتلا ہو جائے۔ اس لڑکی میں کوئی بات تھی جب ہی محلے کے بچے، بوڑھے، جوان، عورت اور مرد سب کے سب اس کی ایسی عزت کر رہے تھے جیسے وہ آسمان سے اتر کر آئی ہے۔ کوئی نوجوان اسے ایک عاشق کی نظر سے نہیں دیکھ رہا تھا۔ مجھے بھی محتاط ہو جانا چاہیے تھا مگر اس کی ذات سے میری دلچسپی اور بڑھ گئی۔ ایک تجسس پیدا ہو گیا کہ آخر وہ کون ہے؟ اس میں کیا بات ہے، سب ہی اسے عزت و احترام سے دیکھتے ہیں۔ وہ ایک مکان سے نکل کر اپنے مکان کی طرف جا رہی تھی۔ ایک نوجوان نے اسے آواز دی۔

''زلیخا! مجھے بھی دو دوا نے دیتی جا.....!''

اس کے قدم رک گئے۔ اس نے نوجوان کی طرف دیکھا۔ پھر مجھے دیکھ کر ذرا جھجکنے لگی۔ دوسرے نوجوان نے کہا۔ تیرے آنچل میں بڑی برکت ہے۔ شیرینی کبھی ختم نہ ہوگی۔ لا ہمیں بھی دے دے۔ وہ ان کی جانب آہستہ آہستہ سر جھکا کر بڑھنے لگی۔ مجھے یوں لگا کہ وہ میری طرف آ رہی ہے۔ یہ اچھا موقع تھا۔ میں اسے سنانا چاہتا تھا کہ میں اس کے قریب رہنا چاہتا ہوں۔ میرا ارادہ وہاں سے واپس جانے کا نہیں ہے۔ جب وہ قریب آ کر ان نوجوانوں میں شیرینی تقسیم کرنے لگی تو میں نے پان والے سے کہا۔

''بھائی صاحب میں کرائے پر ایک مکان تلاش کر رہا ہوں۔ کیا اس محلے میں مل سکتا ہے؟''۔

وہ جو حرف حرف چراغ تھا

نگہت بانو کا تحریر کردہ ایک رومانی ناول جس میں مصنفہ نے انسانی رشتوں ناتوں میں محبت اور اپنائیت کے فقدان کا ذکر بہت خوبصورتی اور مہارت سے کیا ہے۔ پاکستانی معاشرے میں گھر کا ہر فرد ایک اکائی کی حیثیت رکھتا ہے اور جب تک یہ اکائیاں ایک دوسرے سے جڑی رہتی ہیں گھر بنا رہتا ہے لیکن انہی اکائیوں کے بکھرتے ہی پیار اور محبت سے بنا آشیانہ بھی بکھر جاتا ہے اور گھر محض سجے سجائے مکانوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہ ناول کتاب گھر پر دستیاب۔ جسے **ناول** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

''تمہارے ماں باپ اور بیوی بچے ہیں؟'' دکاندار نے پوچھا۔ ''نہیں میں اس دنیا میں بالکل تنہا ہوں''۔ زلیخا کی نظریں میری جانب اٹھ گئیں۔ دکاندار نے جواب دیا'' پھر تو مشکل ہے۔ اکیلے آدمی کو بڑی مشکل سے کوئی مکان دیتا ہے۔ کیوں زلیخا! میں ٹھیک کہتا ہوں نا؟''

یہ بات بھی عجیب سی تھی کہ مکان کے سلسلے میں بھی اس لڑکی کی رائے پوچھی جارہی تھی۔ مجھے یقین ہوتا جارہا تھا کہ وہ حقیقتاً ایک محترم ہستی ہے۔

وہ سر جھکا کر مجھ سے نظریں چراتی ہوئی پان والے کے پاس آئی اور شیرینی کے چند دانے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

''نکے ماما! اس سے پوچھ، کیا یہ پانچوں وقت کی نمازیں پڑھتا ہے؟''

پان والے نے مجھ سے پوچھا۔ میں ذرا جھجکنے لگا۔ مجھے بچپن سے کسی نے نماز روزے کی تعلیم نہیں دی تھی۔ وہاں زلیخا کے ذریعے مذہبی احکامات پر عمل کرنے والے کو مکان مل سکتا تھا۔ اگر انکار کر دیتا تو اس کے قریب رہنے کا موقع ہاتھ سے نکل جاتا۔ میں نے جھوٹ کا سہارا لیا۔

''جی ہاں! میں نماز پڑھتا ہوں''۔

میں نے محسوس کیا کہ زلیخا نے اطمینان کی سانس لی ہے۔ وہ نکے پان والے سے بولی ''تو باقی باتیں کرلے میں ماں جی کو بھیج دیتی ہوں''۔

یہ کہہ کر وہ اپنے مکان کی طرف واپس جانے لگی۔ نکے نے مجھ سے پوچھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

میں تفصیل سے اسے بتانے لگا۔ میرا نام اقبال ہے۔ بچپن میں والدین اقبالے کہتے تھے پھر یہ نام گھستے گھستے بالے بن گیا۔ جنازگاہ کے پاس آٹو رکشہ کی مرمت کرتا ہوں۔ معقول آمدنی ہے۔ مکان کا کرایہ باقاعدگی سے ادا کرتا رہوں گا۔ جہاں میرا ورکشاپ ہے وہاں سے معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ میں ایک شریف آدمی ہوں، نشہ تو دور کی بات میں پان سگریٹ کو بھی ہاتھ نہیں لگاتا۔ یہاں رہوں گا تو کبھی مالک مکان کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا''۔

نکے نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا'' دیکھو وہاں سے یہاں تک جتنے مکانات ہیں۔ یہ سب کے سب زلیخا کے نام پر ہیں۔ یہاں اس کے پانچ کرایہ دار ہیں، وہ ہمیشہ پاک صاف رہتے ہیں۔ زلیخا انہیں پہلے ہی سختی سے تاکید کر دیتی ہے۔ کرایہ دار اس کے مکان کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ ایک رات وہ شراب پی کر مکان میں آیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ زلیخا کی پاک روح اسے نہیں دیکھ رہی ہے جیسے ہی اس نے دہلیز کے اندر قدم رکھا، اسے ابکائی سی آئی۔ وہ لڑکھڑا کر گرا اور خون کی قے کرنے کے بعد ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا ہو گیا۔

مرنے والے کی بیوی کا بیان ہے کہ وہ گرنے کے بعد اس دیوار کی طرف دیکھ رہا تھا جس کے پیچھے زلیخا رہتی ہے۔ وہ تڑپ رہا تھا اور ہکلاتے ہوئے معافی مانگ رہا تھا مگر بہت دیر ہو چکی تھی۔ اسے اچانک خون کی ایک قے ہوئی اور وہ مر گیا۔

دیکھو بالے بھائی! راتوں کو ہم بھی نشہ کرتے ہیں۔ اپنی..... عادت سے مجبور ہیں مگر ہم زلیخا کے قریب یا اس کے مکان کے دروازے پر نہیں جاتے۔ وہی کبھی مہربان ہو کر ہمارے قریب آتی ہے اور ہمیں نیاز کی شیرینی دے کر چلی جاتی ہے، وہ بڑی کرموں والی ہے، جس روز میری دکان پر آتی ہے میری آمدنی بڑھ جاتی ہے۔ وہ سدا سہاگن ہے جس کنواری کے سر پر ہاتھ رکھ دیتی ہے وہ کچھ ہی دنوں میں سہاگن بن جاتی ہے۔

زلیخا کہہ گئی ہے تمام باتیں تمہیں سمجھا دوں۔ سمجھانے کے بعد بھی تم نے جھوٹ کہا اور اسے دھوکا دینے کی کوشش کی تو تمہیں توبہ کی مہلت بھی نہیں ملے گی اور تم ایک عبرتناک انجام کو پہنچ جاؤ گے۔

نکے پان والا سمجھا رہا تھا اور میں سمجھ رہا تھا مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ اس ہستی کے روحانی پہلو سے زیادہ میں اس کے رومانی پہلو کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ میں دل سے مجبور تھا۔

میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھے اتنی آسانی سے وہاں مکان مل جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تقدیر مجھے ایک بڑے اور بہت اہم تجربے سے دوچار کرنا چاہتی تھی اس لیے مجھے وہاں لا پھینکا تھا بہرحال اس وقت میں اپنے آپ کو بہت ہی خوش نصیب سمجھ رہا تھا۔

وہ دو کمروں کا مکان تھا۔ آنگن میں دو دروازے تھے۔ ایک دروازہ باہر کی طرف کھلتا تھا جو فی الحال بند تھا اور میری سب سے پہلی کوشش یہی تھی کہ وہ میرے دل کی طرح اس کی نگاہوں کے سامنے کھل جائے۔ کچھ اور بھی کوششیں تھیں ایک تو پاک صاف رہنے کی کوشش، دوسرے نماز کی پابندی۔ کوئی دنیاوی دولت حاصل کرنے کے لیے کوئی عقبیٰ میں جنت حاصل کرنے کے لیے نماز پڑھتا ہے، میں زلیخا کو خدا سے مانگنے کے لیے نماز پڑھ رہا تھا، اس کی ابتدا ایک جھوٹ سے ہوئی تھی مگر رفتہ رفتہ مجھے نماز میں ایک ایسا سکون اور سرور محسوس ہونے لگا جس سے پہلے میں نا آشنا تھا۔

جب میں سجدے کے دوران اس کون و مکاں کی عظمت کا اعتراف کرتا تو اس وقت میرے دل و دماغ کے کسی گوشے میں دنیاوی لالچ کی ہلکی سی رمق بھی نہ ہوتی مگر ہاں، جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا تو اس دینے والے سے ایک ہی چیز مانگتا۔ زلیخا، زلیخا اور زلیخا.....

اور زلیخا کے آنگن میں وہ دروازہ کھلنے لگا۔ کبھی اس کی بوڑھی ماں نذر نیاز کا حلوہ یا شیرینی لے کر آتی کبھی میں ایسے ہی چیزیں لے کر ان کے ہاں پہنچ جاتا۔ کبھی وہ چولہے کے پاس نظر آتی اور کبھی کمرے میں بیٹھی کپڑے سلائی کرتی رہتی۔ اپنے ہوں یا پرائے، سب سے باتیں کرتی تھیں ایک مجھ سے ہی ذرا کتراتی تھی۔ دو ماہ کا عرصہ گزرنے کے بعد بھی وہ اسی طرح چور نظروں سے مجھے دیکھتی تھی کہ کہیں میں اسے دیکھ تو نہیں رہا ہوں۔ اس نے اب تک ناراضگی ظاہر نہیں کی تھی اور نہ میری میٹھی نظروں کا خاطر خواہ جواب دیا تھا۔

اس دوران مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ وہ سہاگن نہیں ہے۔ اس روز محلے کے بچوں نے اور نکے پان والے نے نہ جانے کیوں اسے سہاگن کہہ دیا تھا۔ میں نے کوئی ایسا مرد یا رقیب نہیں دیکھا تھا جو وہاں خاوند کے رشتے سے زلیخا کے ہاں رہتا ہو۔ وہاں عورتوں کے علاوہ وقتاً فوقتاً کئی مرد آتے تھے مگر کوئی منہ بولا چچا تھا، کوئی ماموں اور کوئی پھوپھا تھا۔ سب اس کے سامنے سر جھکا کر بیٹھتے تھے۔ رفتہ رفتہ میں سمجھنے لگا کہ وہ کیوں آتے ہیں؟

وہاں آنے والے بوڑھے عقیدے کے لوگ تھے۔ زلیخا کو کوئی آسمانی ہستی سمجھتے تھے جو انسان کے روپ میں آئی ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ وہ ایک پاک روح ہے۔ اس دنیا کا کوئی بھید اس سے چھپا ہوا نہیں ہے اس لیے ایک صاحب اس سے نمبر پوچھنے آتے تھے (سٹے کا نمبر)۔ دوسرے صاحب محلے کا چیئرمین بننے کے لیے الیکشن لڑنے والے تھے انہیں یقین تھا کہ زلیخا کے ایک اشارے پر تمام محلے کے لوگ انہیں ووٹ دینے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ ایک اور صاحب زمینوں کے مقدمے میں تین سال سے الجھے ہوئے تھے اور اب زلیخا کی دعاؤں سے مقدمہ جیتنے کے آثار پیدا ہو گئے تھے، کوئی اولاد کے لیے آتا تھا یا آتی تھی، کوئی شادی بیاہ کے لیے، کوئی خاوند کی شکایت لے کر اور کوئی بیوی کی شکایت لے کر آتا تھا غرضیکہ

سب ہی چھوٹی بڑی ضرورتوں کے لیے زلیخا کے سامنے زانو تہ کرتے تھے۔

مجھے اس دھان پان سی معصوم صورت لڑکی میں کوئی روحانی قوت یا خاصیت نظر نہیں آتی تھی البتہ یہ خاصیت تھی کہ وہ حد درجہ حسین تھی۔ لوگ دنیا جہاں کی آرزوئیں لے کر اس کے پاس آتے تھے اور میں اس کی آرزو میں بیٹھا ہوا تھا۔

پھر میرا پیار، میری چاہت کچھ اثر دکھانے لگی۔ ایک شام کو میں گھر واپس آیا تو میرے میلے کپڑے دھلنے کے بعد آنگن کی رسی پر سوکھ رہے تھے۔ اس کی بوڑھی ماں نے بتایا کہ وہ کپڑے زلیخا نے دھوئے ہیں۔ میں نے خوش ہو کر کہا۔

''مجھے آج معلوم ہوا کہ زلیخا میرا اتنا خیال رکھتی ہے''۔

بوڑھی ماں نے مسکرا کر کہا۔

''میری بیٹی کو صفائی کا بڑا خیال رہتا ہے۔ پہلے تو میں تمہارے کمرے کی صفائی کیا کرتی تھی۔ اب مجھ سے بار بار اٹھنا بیٹھنا نہیں ہوتا۔ وہی جھاڑو دیتی ہے، فرش کو دھوتی ہے اور تمہارے کمرے کو سجا بنا کر رکھتی ہے''۔

میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ میں بوڑھی ماں سے باتیں کرتا ہوا اس کے آنگن میں آیا تا کہ شکریہ ادا کرنے کے بہانے اس سے باتیں کرنے کا سلسلہ بھی شروع کر دوں مگر وہ آنگن میں تنہا نہیں تھی۔ اس کے پاس دو خسرے بیٹھے ہوئے اپنا دکھڑا رو رہے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا۔

''اے بی بی! ہم بھی انسان ہیں ہم بھی مسلمان ہیں..... مزاروں پر جاتے ہیں، شادی بیاہ کے موقعوں پر ناچتے گاتے ہیں، دوسروں کی خوشیوں میں شریک ہوتے ہیں مگر ہمارے دکھوں میں کوئی شریک نہیں ہوتا۔ مذہبی معاملات میں کوئی ہمیں مسلمان نہیں سمجھتا ہے۔ اگر ہم مر جائیں تو.....''

وہ کہتے کہتے مجھے دیکھ کر رک گیا پھر مسکرا کر ہاتھ نچاتے ہوئے بولا ''اے بالے! تم بڑے نصیب والے ہو۔ سدا سہاگن کے سائے میں رہتے ہو۔ تم سے ہزاروں بلائیں دور رہیں گی''۔

سدا سہاگن کے الفاظ سن کر میں پھر الجھ گیا۔ میں اس سلسلے میں کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ اگر وہ واقعی سہاگن نکلی تو میری چاہت کا کیا بنے گا؟ میں خود کو فریب دینا چاہتا تھا کہ وہ کنواری ہے۔ اس لیے میں نے کچھ پوچھنے کی بجائے مسکرا کر کہا۔

''زلیخا! میں تمہارا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔ آج مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے میرے کپڑے دھوئے ہیں اور ہمیشہ میرے کمرے کی صفائی کیا کرتی ہو''۔

وہ جواب دینے کی بجائے اپنے سینے پر دوپٹے کی تہہ جمانے لگی۔ اس کے دوپٹہ اوڑھنے کا انداز دوسری لڑکیوں سے قدرے مختلف تھا۔ دوپٹہ بھی تقریباً تین گز سے کم نہیں ہوتا تھا۔ ایک بڑی سی چادر کی طرح اسے اوڑھے رہتی تھی۔ گردن کے نیچے اس کی اتنی تہیں ہوتیں کہ سینے کی شادابیاں چھپ کر رہ جاتی تھیں۔

اگر یہ گناہ ہے تو میں اس گناہ کا اعتراف کرتا ہوں کہ اس کے حسن سے متاثر ہو کر میری نگاہیں چوری چوری دور سے اس کے جسم کو ٹٹولتی

تھیں۔ یہ مقصود بالذات تک پہنچنے کا ایک عام قاعدہ ہے کہ پہلے نگاہیں وہاں تک پہنچتی ہیں، اسے چھوتی ہیں، ٹٹولتی ہیں اور اسے اچھی طرح سمجھ کر اس شاہکار پر عاشق ہوتی ہیں۔ اگر میں ایسا کر رہا تھا تو یہ کوئی عجیب، انوکھی اور نئی بات نہیں تھی۔ ویسے یہ میری ناکامی تھی کہ میں نے اس دوپٹے کی تہہ میں سانسوں کی ابھرتی ہوئی شادابیوں کو کبھی نہیں دیکھا۔ وہ میری نگاہوں سے گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھ گئی اور جلدی سے کمرے کے اندر جانے لگی۔

میں نے غلط موقعے پر شکریہ ادا کیا تھا۔ مجھے اس کے لیے تنہائی کا موقع تلاش کرنا چاہیے تھا۔ بہرحال غلطی ہوگئی تھی۔ میں نے سوچا کہ وہ میرے کمرے سے دلچسپی لے کر میرا حوصلہ بڑھا رہی ہے لہذا اب اگر تنہائی نصیب ہوئی تو میں اسے باتیں کرنے پر مجبور کروں گا۔

یہ سوچ کر باہر جانے لگا۔ اسی وقت اس کی رس بھری آواز سنائی دی ''سنئے!''

میرے قدم رک گئے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا وہ اپنے کمرے کے دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ مجھ سے نظریں ملتے ہی سر جھکا کر بولی۔

''آپ میری ایک بات مانیں گے؟''

ہائے! پہلی بار وہ مجھے مخاطب کر رہی تھی، التجا کر رہی تھی، میں نے خوش ہو کر آگے بڑھتے ہوئے کہا ''ایک نہیں ہزار باتیں مانوں گا تم حکم کرو''۔

میرے کہنے کے انداز میں ایسی اپنائیت تھی کہ وہ ذرا سمٹ گئی۔ دروازے سے کچھ اور چپک گئی پھر ہچکچاتے ہوئے بولی۔

''صمدو چاچا کی ایک عزیزہ فوت ہوگئی ہیں۔ کیا آپ کاندھا دینے جا سکتے ہیں؟''

میں ایک نئی امید ایک نئی زندگی کی آس میں آگے بڑھا تھا اور وہ مجھے کسی کی موت کی خبر سنا رہی تھی۔ جو کچھ بھی تھا اس نے پہلی بار التجا کی تھی۔ میں اس کی التجا پر ایک نہیں، ہزار جنازوں کو کاندھا دے سکتا تھا۔ اس لیے صمدو چاچا کا پتہ پوچھ کر مغل پورے کی طرف چلا گیا۔

مجھے کسی صمدو چاچا سے دلچسپی نہیں تھی لیکن زلیخا کی اس التجا کا میری کہانی سے گہرا تعلق ہے لہذا وہاں میں نے جو کچھ دیکھا وہ مختصر طور سے بیان کر رہا ہوں۔ میں اپنے محلے کے ہونے والے چیئرمین کا ذکر کر چکا ہوں وہاں اس چیئرمین کے دو ملازم نظر آئے اور وہ صاحب بھی جو زلیخا سے سٹے کا نمبر پوچھنے آتے تھے۔ ان کے علاوہ زلیخا کے پاس آنے والے دو چار عقیدت مند اور بھی نظر آئے۔ صمدو چاچا کے متعلق اتنا معلوم ہوا کہ انہوں نے پچھلے ہی دنوں مغل پورہ کے اس محلے میں وہ چھوٹا سا مکان کرائے پر لیا تھا۔ ان کی بیوی اسپتال میں بیمار تھی۔ پچھلی رات انتقال ہوگیا تھا اور وہ اسپتال سے اس مکان میں لائی گئی تھی۔ صمدو چاچا محلے والوں سے کہہ رہے تھے کہ وہ مکان اس کے لیے منحوس ثابت ہوا ہے لہذا مرحومہ کی تجہیز و تکفین کے بعد وہ اس مکان کو چھوڑ دیں گے۔

میں نے ان سے ہمدری ظاہر کی۔ جنازے کے ساتھ قبرستان تک گیا۔ اس کی نماز جنازہ ادا کی اور اسے دفنانے کے بعد جب اپنے محلے میں واپس آیا تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ آس پاس کے تمام مکانوں پر نیند کی خاموشی مسلط ہوگئی تھی۔ گلی کا راستہ بھی سنسان ہوگیا تھا۔ نکے پان والے کی دکان بھی بظاہر بند ہو چکی تھی مگر دکان کا پچھلا دروازہ ذرا سا کھلا تھا۔ تین ماہ کے عرصے میں مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ نکے غیر قانونی طور سے چرس بیچتا ہے۔ دن ہو رات نشہ کرنے والے دکان کی پچھلی طرف سے آتے تھے اور کھرے دام دے کر چرس کی گولیاں لے جاتے تھے۔

ایک نکے ہی اکیلا مجرم نہیں تھا۔ دن کی روشنی میں جائز کاروبار کرنے والے کتنے ہی لوگ منافع کی شرح بڑھانے کے لیے ناجائز کاروبار کا

ایک پچھلا دروازہ ضرور بناتے ہیں۔ میں اس دکان سے کترا کر اپنے دروازے پر آ گیا۔ تالا کھول کر میں نے دروازے کے دونوں پٹوں کو آہستگی سے وا کیا۔ آنگن سے پرے میرے کمرے میں روشنی نظر آ رہی تھی اور کمرے کی ایک دیوار پر اس کا سایہ سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔

اس کا سایہ جسے میں ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔

میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ میں نے دروازے کو آہستگی سے بند کیا اور دبے پاؤں آنگن سے گزرتا ہوا اپنے دروازے پر آ گیا۔

وہ میری منجی کے سرے پر میرے تکیے کو دونوں بانہوں میں لیے اسے سینے سے بھینچے ہوئے سر جھکائے بیٹھی تھی اور رو رہی تھی۔

مجھے اس کی آمد سے جتنی خوشی ہوئی تھی اس کے آنسو دیکھ کر اتنی ہی حیرانی بھی ہوئی کہ وہ کیوں رو رہی ہے؟

''زلیخا!''

میری ہلکی سی میٹھی آواز اس کے لیے دھماکہ ثابت ہوئی۔ وہ یکبارگی اچھل کر کھڑی ہو گئی، اس کے چہرے پر ایسی پریشانی اور گھبراہٹ تھی جیسے چوری کرتی ہوئی پکڑی گئی ہو۔ فرار ہونے کے راستے پر میں کھڑا تھا ورنہ وہ پلک جھپکتے ہی وہاں سے بھاگ جاتی۔ جب بھاگنے کا راستہ نہ ملا تو وہ منہ پھیر کر اپنے آپ کو دوپٹے میں چھپانے لگی۔

میں نے آگے بڑھ کر ذرا نرمی سے پوچھا ''زلیخا! کیا تم مجھ سے ڈرتی ہو؟''

وہ خاموش رہی۔ میں ذرا اور قریب چلا گیا۔

''ایک عرصہ گزر گیا ہے زلیخا! میں خاموشی سے تمہیں دیکھے جا رہا ہوں۔ میں نے آج تک زبان نہیں ہلائی۔ کیا اب تک تمہیں میری شرافت کا یقین نہیں ہوا ہے؟ تمہارے اس طرح منہ پھیر لینے کو میں کیا سمجھوں۔ خوف یا نفرت؟''

وہ سر جھکا کر اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

''تم کیوں رو رہی ہو؟ مجھے بتاؤ، مجھے اپنا سمجھ کر بتاؤ، میں..... میں تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں۔ میں تمہارے لیے آیا ہوں۔ تمہارے لیے یہاں رہتا ہوں۔ جب تک میری سانس چلتی رہے گی، میں تمہاری آس لگائے یہاں بیٹھا رہوں گا۔ مجھے اپنی محبت کا سہارا دو زلیخا!''

وہ فرش پر ایسے بیٹھ گئی جیسے نہ بیٹھتی تو گر پڑتی۔ پھر منجی کے پائے سے لگ کر نفی میں سر ہلاتی ہوئی بولی۔

''نہیں، نہیں۔ آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ میں آپ کے قابل نہیں ہوں''۔

''کیسی باتیں کرتی ہو۔ تم کس قابل ہو یہ میرا دل جانتا ہے۔ کیا تم میری محبت، میری دیوانگی کو نہیں سمجھتی ہو؟''

میں نے اس کے قریب دو زانو ہو کر اس کے بازوؤں کو بڑی محبت سے تھام لیا۔ وہ ہولے سے کسمسانے لگی۔

''مجھے چھوڑ دیجئے، مجھے ہاتھ مت لگائیے۔ میں سہاگن ہوں''۔

میری امیدیں مرجھانے لگیں۔ میں نے دل برداشتہ ہو کر پوچھا ''کون ہے تمہارا خاوند؟ میں نے تو کبھی اسے نہیں دیکھا''۔

اس نے ایک سرد آہ بھری۔ میں نے سمجھا کہ وہ جواب دینے والی ہے مگر وہ دل سے نکلنے والی آہ کے بعد خاموش ہو گئی اور ڈوپٹے سے اپنے

چہرے کو چھپانے لگی۔

جس ہاتھ سے دوپٹے کو تھام کر وہ پردہ کر رہی تھی میں نے اس ہاتھ کو تھام لیا، التجا کی ''مجھ سے منہ نہ چھپاؤ زلیخا! میرے سوال کا جواب دو۔ کون ہے تمہارا خاوند؟''

وہ نفی میں سر ہلانے لگی ''کوئی نہیں، کوئی نہیں۔ میں کسی خاوند کے متعلق کبھی سوچ بھی نہیں سکتی۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں؟ میں سدا سہاگن ہوں''۔

''تعجب ہے۔ یہ بھی کہتی ہو خاوند نہیں ہے۔ یہ بھی کہتی ہو کہ سہاگن ہو۔ کیا یہ پاگل پن کی باتیں نہیں ہیں؟''

اس کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔ وہ تھرتھراتے ہوئے لہجے میں بولی ''اللہ! میں آپ کو کیسے سمجھاؤں۔ آپ سدا سہاگن کا مطلب نہیں سمجھتے ہیں۔ میں آپ کو کیسے سمجھاؤں؟''

اس نے اپنا ہاتھ میری گرفت سے چھڑا لیا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو ڈھانپ کر اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''میں پیدائشی سہاگن ہوں'' اس کی آواز آنسوؤں اور ہچکیوں میں ڈوبنے لگی۔ میں خدا کی ایک عجیب تخلیق ہوں۔ جب میں پیدا ہوئی تو میرے ماں باپ بھی مجھے نہ پہچان سکے کہ میں مرد ہوں یا عورت۔ بعد میں انہیں پتہ چلا کہ اس دنیا میں کبھی کبھی مجھ جیسی ہستیاں بھی پیدا ہوتی ہیں جن کی صحیح تشخیص نہیں ہوتی چونکہ ان میں عورتوں کی خصوصیات زیادہ ہوتی ہیں اس لیے انہیں واضح طور پر عورت کہنے کی بجائے سدا سہاگن کہا جاتا ہے''۔

میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس وقت میں کتنی حیرانی سے اور کیسی بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اتنا حیرت انگیز انکشاف تھا کہ کچھ دیر کے لیے میری قوت گفتار ختم ہو گئی تھی۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ عورت نہیں تھی مگر عورت تھی۔ ان بے ڈھنگے خسروں سے بالکل مختلف تھی جو اس دنیا میں آنے کے بعد مرد سے عورت بنتے ہیں۔ جو مرد کی تذلیل کرتے ہیں اور عورت کی ایک نقل بن کر نہ ادھر کے رہتے ہیں نہ ادھر کے۔ زلیخا ان سے مختلف تھی۔ اس کی جسمانی ساخت، شاعرانہ نزاکت، بدن کی ریشمی ملائمت، حیران حیران سی سیاہ آنکھیں، ستواں ناک اور پتلے خمیدہ رس بھرے ہونٹ۔ یہ سب اپنی زبان بے زبانی سے کہہ رہے تھے کہ قدرت نے اسے ایک حسین سانچے میں ڈھالا تھا اور عورت کے درمیان رکھ کر ایک ادھوری تخلیق کے طور پر اس دنیا میں بھیج دیا تھا۔

میرے کمرے میں سو کینڈل پاور کا بلب روشن تھا لیکن آنکھوں کے سامنے مایوسی کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اس اندھیرے میں اس کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ اپنی بدبختی پر رو رہی تھی کہ وہ عورت ہو کر بھی عورت نہیں تھی۔ وہ کسی کی بہن، بیٹی، بھانجی اور بھتیجی بن سکتی تھی لیکن قدرت نے اسے ان خزانوں سے محروم رکھا تھا جنہیں پا کر عورت بیوی بنتی ہے اور پھر ماں بنتی ہے۔

میں قسمت کی آڑھی ترچھی لکیروں پر چلتا ہوا اس عجیب مخلوق تک پہنچ گیا تھا اور اب بھی اس کے حسن اور اس کے سمیں بدن کی نزاکتوں سے متاثر ہو رہا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس سے محبت کرنے اور اس کے تمام دکھوں کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لینے کی آرزو پہلے سے زیادہ شدید ہو گئی تھی۔

میں بڑی آہستگی سے ذرا اس کے قریب کھسک آیا اور اپنی دونوں ہتھیلیوں میں اس کے حسین مکھڑے کو سجا کر بولا۔

''زلیخا! میں یہ سوچنا نہیں چاہتا کہ تم کون ہو؟ اور کیسی ہو؟ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا۔ مجھ سے تمہارے آنسو نہیں دیکھے

جاتے۔ چپ ہو جاؤ میری جان..... میری آرزو..... میری زندگی''۔

میں نے محبت کے جذبوں سے مغلوب ہو کر اسے سینے سے لگا لیا۔ وہ میرے بازوؤں کے حصار میں ایک سہمے ہوئے پنچھی کی طرح کانپنے لگی اور بڑی کمزوری سے احتجاج کرنے لگی۔

''چھوڑ دیجئے! اللہ! مجھے چھوڑ دیجئے! یہ اچھی بات نہیں ہے میں، میرا دل گھبرا رہا ہے۔ میں سدا سہاگن ہوں مجھے چھوڑ دیجئے''۔

''تم پہلے سہاگن نہیں تھی مگر اب میرے نام سے سہاگن ہوگی۔ کیا تمہارا جی نہیں چاہتا کہ کوئی تمہیں چاہے تم سے بے انتہا محبت کرے.....''

میرے بازوؤں کی قید میں اس کی سرد آہ سرسرائی، اس کے دونوں ہاتھ آہستگی سے لرزتے ہوئے میری پشت پر آئے۔ وہ میرے سینے سے لگی ہوئی تھی کچھ اور لگ گئی۔ میری آغوش میں جذب ہو جانے کی خاموش ادا سے اس نے ظاہر کر دیا کہ اسے چاہے جانے کی آرزو ہے۔ انسان کوئی بھی ہو۔ مرد ہو، عورت ہو یا زلیخا۔ سب کی یہی آرزو ہوتی ہے کہ کسی ایک ہستی کی منفرد محبت اسے ملے ایسی محبت کہ کوئی دوسرا اس میں شریک نہ ہو۔ اس کے محبوب کا تمام پیار اور تمام توجہ اسے حاصل ہو۔ خصوصاً عورت اپنی فطرت سے مجبور ہوتی ہے۔ محبت کو بھی ایک جائیداد بنا کر اپنی ذات تک محدود رکھنا چاہتی ہے۔

وہ بھی ایک جائیداد تھی جسے میں نے بڑے انتظار کے بعد پایا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے مطلوب اور مقصود تھے۔ میں اسے ادھر ادھر سے سمیٹ رہا تھا وہ بھی بڑی خاموشی سے مجھ میں جذب ہوتی جا رہی تھی۔ میں اس خاموشی کو توڑنا چاہتا تھا اور اس کی جھجک اور بے نام خوف کو دور کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے پیار بھری سرگوشیوں میں اسے یقین دلا رہا تھا۔

میں تمہارا ہوں، دل کی گہرائیوں سے تمہیں چاہتا ہوں، تم اپنی زندگی کی آخری سانس تک مجھے محسوس کرو اور سوچو اور یقین کرو کہ میں ہی تمہارا محافظ ہوں۔ میرے بغیر تم ادھوری ہو، بے سہارا ہو تم..... میرا سہارا لے کر ہی مجھے اپنا کر ہی اپنی تکمیل کو پہنچ سکتی ہو.....''

میں اسے سمجھا رہا تھا میری سانسوں کی سرگوشیاں اس کے لبوں پر مچلتی رہیں، اس کے رخساروں پر تڑپتی رہیں، اس کے کانوں میں گنگناتی رہیں اور صبیح گردن کے نشیب میں پھسلتی رہیں۔ اس پر ایک سحر طاری ہو رہا تھا۔ اسے ایسی محبت اور ایسی آغوش نصیب ہو رہی تھی جس کی وہ توقع نہیں کر سکتی تھی لہٰذا وہ بڑی اپنائیت سے اپنے آپ کو رفتہ رفتہ میرے حوالے کر رہی تھی۔

ایک عورت جب تنہائی میں خود کو اپنے محبوب کے حوالے کرتی ہے تو اس کے نیک و بد مقاصد بڑی دور تک جاتے ہیں۔ میں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ زلیخا جس انداز میں خود کو میرے حوالے کر رہی تھی اس میں کسی برے ارادے کا دخل نہیں تھا۔ وہ قدرت کی ایسی ادھوری تخلیق تھی کہ اس کے وجود کے کسی حصے میں گناہ کا کوئی دروازہ نہیں کھلتا تھا۔ میں اسے دیکھ سکتا تھا، اس سے محبت کر سکتا تھا، اسے آغوش میں لے کر اپنے دل کی دھڑکنوں سے لگا سکتا تھا اور اسے چوم سکتا تھا اور بس اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔

وہ سدا سہاگن تھی۔ اس دنیا کا کوئی مرد اس کے ساتھ سہاگ کا سفر نہیں کر سکتا تھا۔ میرے نصیب سے مجھے ایسی محبوبہ ملی تھی جسے میں صرف ایک تصویر کی طرح سجا کر رکھ سکتا تھا۔ اسے بانہوں کے ہار پہنا سکتا تھا لیکن کبھی یہ شکایت زبان پر نہیں لا سکتا تھا کہ تصویر تیری دل میرا بہلا نہ سکے گی۔

ایسی صورت میں یہ بڑی سخت آزمائش تھی کہ میرا پیار کتنا پائیدار ہے اور میں کب تک کسی غرض لالچ کے بغیر اس کی قربت کے کٹھن مرحلوں سے گزرتا رہوں گا۔

اسے پاک روح اس لیے کہا جاتا تھا کہ وہ انسانی ہوس کی غلاظتوں سے وابستہ نہیں کی جاسکتی تھی کہ کسی کنواری کے سر پر ہاتھ رکھتی تو سہاگن بن جاتی۔ حقیقت کچھ اور تھی چونکہ وہ اس دنیا کی آلودگیوں سے پاک تھی اس لیے اسے جاننے والے ایک متبرک اور محترم ہستی مانتے تھے۔

وہ سدا سہاگن لڑکی اور لڑکے والوں کے ہاں جا کر کہہ دیتی کہ میرے دل میں یہ بات اتری ہے یا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ فلاں لڑکی اور فلاں لڑکے کا رشتہ ہو جانا چاہیے تو دونوں خاندانوں کے بزرگ اس کی بات تسلیم کر لیتے تھے۔

زلیخا نے مجھے بتایا کہ ایک آدھ بار اسے ناکامی ہوئی ورنہ عقیدت مند ایسے تھے کہ اس کی بات نہیں ٹالتے تھے یہی وجہ تھی کہ صرف بوڑھے ہی نہیں جوان لڑکیاں اور لڑکے بھی اس کے احسان مند تھے۔ اسے دعائیں دیتے تھے اور ہمیشہ اس کی عزت کرتے تھے۔ اسی کے مشورے پر لوگوں نے حاجی خدا بخش کو ووٹ دے کر محلے کا چیئرمین بنا دیا تھا۔ ایک بار اس نے موسیٰ بھائی سے پانچ وقت کی نمازیں پڑھنے کے لیے کہا تھا۔ اتفاق سے سٹے کے کھیل میں وہ پانچ نمبر پر لگ گیا، اس دن سے موسیٰ بھائی پانچ وقت کی نماز پڑھنے لگا تھا۔ بلاشبہ انسان مطلب کا بندہ ہے مطلب براری کے لیے بندگی پر مائل ہوتا ہے اور وہ جو شراب پینے کے بعد خون کی قے کر کے اس جہاں سے رخصت ہو گیا تھا تو بے چاری زلیخا نے اسے بددعا نہیں دی تھی۔ شراب میں ملاوٹ کرنے والوں سے کوئی غلطی ہو گئی تھی۔ وہ ایک سیدھی سادی سی لڑکی تھی۔ اس کی معصومیت اور خدمت خلق کے جذبے نے اسے لوگوں کی نظر و میں محترم پاک روح، پراسرار ہستی اور نہ جانے کیا کچھ بنا دیا تھا۔ میری نظروں میں صرف اس محبت کی اہمیت تھی جو صرف میرے لیے تھی۔

تقریباً چھ ماہ کا عرصہ گزر گیا تو وہ محبت آہستہ آہستہ مجھے ڈسنے لگی۔ اگر مجنوں اور فرہاد بھی اتنے عرصے اپنی لیلیٰ اور شیریں کے ساتھ راتیں گزارتے اور صبح اپنی محبوباؤں کو بغیر پڑھے ایک کوری کتاب کی طرف بند رکھتے تو میری طرح ذہنی خلجان اور اعصابی بے چینی میں مبتلا ہو جاتے یا پھر بہت مجبور ہو کر ان کوری کتابوں میں اپنی ہوس کی داستان لکھ کر مر جاتے۔ لیکن وہ اس لحاظ سے خوش نصیب تھے کہ انہوں نے وصال سے زیادہ ہجر کی گھڑیاں گزاری تھیں اور میں وصال میں ہجر کے صدمے سہہ رہا تھا۔

محبتوں کے ہی درمیاں

خواتین کی مقبول مصنفہ **نگہت عبداللہ** کے خوبصورت ناولٹوں کا مجموعہ، **محبتوں کے ہی درمیاں**، جلد کتاب گھر پر آ رہا ہے۔ اس مجموعہ میں انکے چار ناولٹ (تمہارے لیے تمہاری وہ، جلاتے چلو چراغ، ایسی بھی قربتیں رہیں اور محبتوں کے ہی درمیاں) شامل ہیں۔ یہ مجموعہ کتاب گھر پر **ناول** سیکشن میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اب تک میں حوصلے اور ضبط سے کام لے رہا تھا اور خود کو سمجھا رہا تھا کہ محبت بے لوث اور بغیر کسی لالچ کے بھی کی جا سکتی ہے یا پھر میں دوسرے مسائل میں اب تک خود کو الجھا کر بہلا رہا تھا۔ اس دوران میں پھر زلیخا کی التجا پر دوبارہ ایسے جنازوں کو کاندھا دینے گیا جن سے میں واقف نہیں تھا۔ صمد و چاچا کا ذکر میں کر چکا ہوں، دوسری بار موسیٰ بھائی کے میت رکھی تھی۔ وہ کراچی کے رہنے والے تھے۔ سال بھر میں لاہور کے کئی چکر لگاتے تھے، اچھرے میں ایک چھوٹا سا مکان خرید رکھا تھا۔ اس بار انہوں نے اپنے پڑوسیوں کو بتایا تھا کہ ان کی بیوی آج رات کی ٹرین سے لاہور آ رہی ہے لیکن آدھی رات کے بعد ان کی بیوی اپنے پیروں سے چل کر نہیں آئی چار آدمی اس کی لاش لے کر آئے۔

اس لاش کو وہی لوگ لے کر آئے جو صمد و چاچا کی مرحومہ کو اسپتال سے لائے تھے۔ اس لاش کو اسی بوڑھی عورت نے غسل دیا جو صمد و چاچا کی بیوی کو غسل دے چکی تھی۔ اگر وہ مغل پورے کی غسالہ تھی تو تقریباً آٹھ میل دور اچھرے میں آنے والی لاش کو غسل دینے کیوں آئی تھی؟ لاشوں کو لانے والے وہ مخصوص لوگ کون تھے؟

یہ سوالات میرے ذہن میں اس وقت پیدا ہوئے جب تیسری بار زلیخا کے کہنے پر میں اس کے منہ بولے ماموں احمد دین کے ہاں جنازہ اٹھانے گیا۔ اس بار لاش کہیں باہر سے نہیں آئی تھی۔

احمد دین کرشن نگر میں پچھلے دو سال سے اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا اور اپنی بیوی کو سخت پردے میں رکھتا تھا۔ پڑوس کی چند عورتوں نے ایک آدھ بار اس کی بیگم کی جھلک دیکھی تھی۔ بیگم بڑی نک چڑھی اور مغرور تھی اس لیے محلے کی عورتوں سے دوستی نہ ہو سکی۔ احمد دین کا مزاج بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ وہ محلے پڑوس والوں سے خود بھی دور رہتا تھا اور اپنی بیگم کو بھی کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں دیتا تھا اسی لیے بیگم کے جنازے پر محلے کے دو چار آدمی نظر آئے۔ باقی وہی لوگ تھے جنہیں صمد و چاچا اور موسیٰ بھائی کے ہاں دیکھ چکا تھا اور وہ غسالہ بھی میری جانی پہچانی تھی۔

اس رات میں اپنے کمرے میں آیا تو مجھے ہلکا ہلکا سا بخار تھا ایسے بخار کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی ہے۔ یہ تو پھر بھی اترتا چڑھتا رہتا ہے مگر میں اندر ہی اندر جس بخار میں پھنک رہا تھا وہ اب ناقابل برداشت ہو چلا تھا۔ تمام دن اس انتظار میں گزرتا کہ رات آئے گی تو وہ میرے کمرے آئے گی۔ جب رات آتی تو مجھ ایک عجیب سی گھبراہٹ طاری ہو جاتی کہ اب آزمائش کا وقت آ رہا ہے، صبح تک مجھے بے لوث محبت کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے تیار کیا ہوا سالن لے کر آئے گی، میرے ساتھ بیٹھ کر کھائے گی۔ میں بستر پر لیٹ جاؤں گا تو وہ میرے ہاتھ پاؤں دبائے گی۔ مجھ سے ٹھنڈے ٹھنڈے موضوعات پر گفتگو کرے گی۔ میں اسے آغوش میں لوں گا، وہ انکار نہیں کرے گی میں اسے پیار کروں گا، وہ شرمائے گی، میں اپنے جذبات کا اظہار کروں گا، وہ گھبرائے گی میں ضد کروں گا، وہ دامن بچا کر نکل جائے گی۔

بس یہی روز کا معمول تھا۔ میں محبت کی اس محدود یکسانیت سے بے زار ہو گیا تھا۔ وہ ایسی تھی کہ اسے دیکھے بغیر قرار بھی نہیں آتا تھا۔ اس سے دور رہ کر سکون نہیں ملتا تھا لہذا میں ہی اپنے صبر کو آزماتا تھا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ میں نیند کا بہانہ کر کے آنکھیں بند کر لیتا تاکہ ملاقات مختصر ہو جائے۔ کبھی اس سے ناراض ہو کر کروٹ بدل لیتا لیکن وہ کسی نہ کسی طرح اپنی پیار بھری اداؤں سے میری ناراضگی دور کر دیتی تھی۔

اس رات وہ آئی تو میں ان پراسرار جنازوں کے متعلق سوچ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا "یہ تمہارے کیسے رشتے دار ہیں جن کی گھر

والیاں کہیں باہر سے وفات پا کر آتی ہیں اور ان کا جنازہ اٹھانے کے لیے مخصوص لوگ آتے ہیں؟''

وہ میری جانب چند لمحوں تک حیرانی سے دیکھتی رہی پھر اس نے پوچھا ''کیا ممانی کی لاش گھر میں نہیں تھی؟''

''گھر میں تھی، ہوسکتا ہے کہ میرے وہاں پہنچنے سے پہلے کہیں سے لائی گئی ہو۔ پچھلی بار ایسا ہو چکا ہے۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ احمد دین کی بیوی کی لاش بھی کہیں سے لائی گئی تھی''۔

میں اسے صمد و چاچا اور موسیٰ بھائی کے ہاں ہونے والی میت کے متعلق بتانے لگا۔ میری باتیں سن کر وہ پریشان ہوگئی تھی کسی قدر گھبرا گئی تھی۔ وہ سر جھکا کر کچھ دیر سوچتی رہی پھر آہستگی سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

''میں نہیں کہہ سکتی کہ ایسا کیوں ہوتا ہے لیکن جو کچھ بھی ہوتا ہے اس کے اچھے برے کو سمجھنے والا خدا ہے۔ ہم کسی کو سمجھ کر یا سمجھا کر کچھ حاصل نہیں کر سکتے۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ کہ آپ کو اگر کوئی خوشی یا غمی میں بلائے تو ضرور جانا چاہیے۔ مرنے والی بے چاری کوئی بھی ہو، اس نے زندگی اچھی طرح گزاری ہو یا بری طرح۔ برے انسان کو بھی آخری وقت پرائے کاندھوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ آپ انہیں کاندھا دے کر نیکی کرتے ہیں۔ اگر آپ کی نیکیاں صرف اچھوں کے لیے ہیں اور بروں کے لیے اتنی نفرت ہے کہ آخری وقت کاندھا دینا بھی گوارا نہیں ہے تو آئندہ ایسی جگہ نہ جائیں۔ میں بھی آئندہ آپ سے التجا نہیں کروں گی''۔

وہ منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے ناراض ہوگئی۔ میں نے کہا۔

''میں نے تمہاری کسی بات سے انکار نہیں کیا ہے۔ تم جہاں کہو گی میں وہاں جاؤں گا مگر میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ تمہارے یہ نام نہاد رشتہ دار کوئی سنگین جرم کر رہے ہیں''۔

''نہیں۔ میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں وہ مجرم نہیں ہیں''۔

''پھر وہ لاشیں کس کی ہوتی ہیں؟''

''چند گناہ گاروں کی جن کا بوجھ اٹھا کر قبرستان تک جانا کوئی گوارا نہیں کرتا''۔

میں نے تعجب سے اسے دیکھا پھر اپنی سمجھ کے مطابق کہا ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ صمد و چاچا، موسیٰ بھائی اور احمد دین کی داشتائیں تھیں''۔

''ہاں''

ذرا دیر کے لیے اطمینان ہوگیا کہ میں..... سچائی تک پہنچ گیا ہوں۔ پھر میرے دماغ میں بات آئی کہ بھلا داشتاؤں کے لیے ایسی رازداری کی کیا ضرورت ہے؟ کتنے ہی دولت مند داشتائیں رکھتے ہیں اور اس سماج میں معزز کہلاتے ہیں۔ ان کی داشتاؤں کو آخری وقت کاندھا دینے والے بھی سینکڑوں مل جاتے ہیں، ان کے جنازے کبھی ایسی رازداری سے اٹھائے نہیں جاتے۔

میری یہ باتیں سن کر اس نے جواب دیا ''میں نہیں جانتی کہ وہ ایسی رازداری کیوں برتتے ہیں مجھے جو کچھ معلوم تھا وہ میں نے آپ سے کہہ دیا''۔

''نہیں زلیخا! میں سمجھتا ہوں کہ کوئی اور بات تم مجھ سے چھپا رہی ہو''۔

''میں کچھ نہیں چھپا رہی ہوں''

''میں جانتا ہوں''۔

''کیا؟'' اس نے پوچھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا ''کیا وہ عورتیں بھی تمہاری طرح سدا سہاگن تھیں؟''

وہ ہنسنے لگی۔ بڑی مترنم ہنسی تھی۔ وہ رس بھری گنگناتی ہوئی ہنسی خفتہ جذبات کو چھیڑتی تھی۔ پھر وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی پر قابو پاتی ہوئی بولی۔

''آپ بھی عجیب باتیں کرتے ہیں کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مجھ جیسی عورتیں ہر دوسرے تیسرے گھر میں پیدا ہوتی ہیں؟ میں تو ایک عجوبہ ہوں اور عجائب المخلوقات ہر جگہ نہیں پائی جاتی۔ ہوسکتا ہے کہ یہاں لاکھوں کی آبادی میں مجھ جیسی دو چار اور موجود ہوں مگر میں انہیں نہیں جانتی۔ آپ خود ہی سوچئے اگر وہ سدا سہاگن ہوتیں تو صمد و چاچا کی شریک حیات یا داشتائیں نہ بنتیں۔ ہمارے متعلق ایسا سوچنا بھی گناہ ہے''۔

وہ درست کہہ رہی تھی یہ میرا ذاتی تجربہ تھا۔ اگر میں زلیخا کو شریک حیات بنانا چاہتا تو اس کی ماں اور محلے والے کبھی اجازت نہیں دیتے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ وہ پاک روح ہے اور پاک روح کسی انسان کی نفسانی خواہشات کا شکار نہیں ہوسکتی۔

میں نے اسے نظر بھر کر دیکھا تو حسن سراپا میرے جذبات کو پکار رہا تھا۔ میں نے موضوع بدل کر کہا۔

''تمہارے متعلق سوچنا بھی گناہ نہیں ہے۔ میں تمہیں شریک حیات بنانا چاہتا ہوں مگر تم مجھ سے اس لیے کتراتی ہو کہ ابھی تک ہمارے درمیان وہ گہرا اور اٹوٹ رشتہ قائم نہیں ہوا جس کے بعد ہم ایک دوسرے کی ضرورت بن جاتے''۔

''آپ نے پھر وہی باتیں چھیڑ دیں'' اس نے شکایت کی۔ میں نے اسے بازوؤں میں بھر کر پوچھا ''کیا صرف باتوں سے زندگی گزر جائے گی؟''

اس نے میرے شانے پر سر رکھ کر کہا ''جو میرے اختیار میں ہے اس سے میں انکار نہیں کرتی۔ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ آپ کے لیے جان بھی دے سکتی ہوں لیکن گناہ گار نہیں بن سکتی''۔

''تم چاہتی ہو میں ہمیشہ تڑپتا رہوں؟''

''گناہ کے لیے تڑپنا نادانی ہے''۔

''انسان ایسی نادانی نہ کرے تو فرشتہ بن جائے گا'' میں نے اسے چوم لیا۔

اس نے کسمسا کر میری گرفت سے نکلنے کی کوشش کی۔ میری گرفت ہمیشہ مضبوط ہوتی تھی لیکن میں جان بوجھ کر ڈھیل دیا کرتا تھا اس لیے کہ وہ میری آغوش سے نکلنا نہیں چاہتی تھی صرف میری دست درازی پر مجھے روکتی اور سمجھاتی رہتی تھی۔

وہ ایک ایسی آگ تھی جس میں حرارت نہیں تھی۔ اس کی پہلی اور آخری خواہش یہی تھی کہ میں اسے ٹوٹ کر پیار کروں۔ وہ ایک شمع کی طرح

والہانہ محبت کی آرزو کرتی تھی کہ پروانہ آئے، دیوانہ وار اس کا طواف کرے۔ اس سے کچھ نہ مانگے اس کے لیے تڑپتا رہے اور تڑپنے کی سکت باقی نہ رہے تو خاموشی سے جل کر مر جائے۔ اس کے مرنے کے بعد بھی وہ جلتی رہے گی۔ اس دنیا میں کچھ ایسی چیزیں ہیں جو جلتی ہیں، جلاتی ہیں اور اپنی آگ سے ذرا بھی واقف نہیں ہوتیں۔

میں اس کی بے حسی سے جھنجھلا گیا تھا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق بار بار کبھی التجائیں اور کبھی نصیحتیں کرنے لگی۔ میں نے اسے پرے دھکیل دیا اور منجی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں پہلے بھی اس سے ایسا سلوک کر چکا تھا۔ اسے پرے ہٹا کر اور کروٹ بدل کر ناراضگی سے منہ پھیر لیا تھا مگر اس رات اسے بستر پر تنہا چھوڑ کر اٹھ گیا تو یوں گھبرا کر دیکھنے لگی جیسے میں اسے چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔

میرا ارادہ بھی یہی تھا۔ میں نے جھلا کر کہا ''میں سمجھ گیا ہوں کہ تم صرف اپنی محبت سے مجبور ہو کر یہاں آتی ہو۔ تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے اگر ہوتی تو تم میرے جذبات کو سمجھتیں اور میری خوشیوں کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے دریغ نہ کرتیں مگر قربانیاں تو دور کی باتیں ہیں، تم میری ایک چھوٹی سی خوشی بھی پوری نہیں کر سکتیں.....''

وہ تڑپ کر بستر سے اٹھی اور میری گردن میں بانہیں ڈال کر لپٹ گئی۔ ''میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ جب آپ سامنے نہیں ہوتے ہیں تب بھی میں آپ ہی کو یاد کرتی ہوں اور آپ کے متعلق سوچتی رہتی ہوں۔ آپ کے سوا میرا دنیا میں کوئی نہیں ہے جسے میں اپنا کہہ سکوں۔ آپ مجھے سمجھنے کی کوشش کیجیے۔''

میں اس کے ہاتھوں کو اپنی گردن کے اطراف سے ہٹا کر ذرا دور ہو گیا ''میں تمہیں خوب سمجھتا ہوں۔ سمجھنے کے لیے چھ ماہ کا عرصہ کم نہیں ہوتا۔ آج تک میں تم سے قریب رہ کر تڑپتا رہا اب تم مجھ سے دور رہ کر تڑپتی رہو۔ میں تم سے دور چلا جاؤں گا تب ہی تمہیں معلوم ہو گا کہ تڑپ اور بے چینی کیا ہوتی ہے''۔ یہ کہہ کر میں اپنی چپلیں پہننے لگا۔ وہ مجھ سے پھر لپٹ گئی۔ میں نے ایک جھٹکے سے اسے الگ کیا اور دھکا دے کر منجی پر گرا دیا پھر تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

''بالے..... بالے!'' وہ مجھے پکار رہی تھی۔

میں آنگن میں آیا تو وہ کمرے کے دروازے پر آئی۔

''رک جایئے خدا کے لیے رک جایئے۔ مجھے چھوڑ کر نہ جایئے میں مر جاؤں گی''۔

وہ دھیمی آواز میں التجا کر رہی تھی تاکہ اس کی آواز دوسرے آنگن میں نہ پہنچے جہاں اس کی ماں گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔

پھر وہ تیزی سے چلتی ہوئی آنگن میں آئی۔ اس وقت تک میں دروازے کے باہر چلا آیا تھا۔ اس کے قریب آنے سے پہلے میں نے دروازے کو باہر سے بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا۔ مجھے ڈر تھا کہ اس کے آنسوؤں اور التجاؤں سے پھر پگھل جاؤں گا۔ وہ بند دروازے کے پیچھے سے ہولے ہولے مجھے پکار رہی تھی اور مجھے واپس آنے کے لیے کہہ رہی تھی مگر میں وہاں سے پلٹ کر اس کی آواز سے دور ہوتا چلا گیا۔

میں چاہتا تھا کہ وہ بھی جدائی کی تڑپ اور جلن کی اذیتوں کو سمجھ لے تب ہی اسے میرے جذبات کا شدت سے احساس ہو گا۔ میں

ورکشاپ میں آ کر سو گیا۔

وہ رات میں نے بڑی بے چینی سے گزاری۔ کبھی سوتا رہا۔ کبھی جاگتا رہا۔ میں اسے رلا کر آیا تھا۔ اس لیے اس کی آنسو بھری آنکھیں بار بار نگاہوں کے سامنے گھوم رہی تھیں۔ دوسری صبح میں کام میں مصروف ہو گیا۔ دوپہر کو تھوڑی دیر کے لیے گھر میں آیا۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ صرف لباس بدلنے آیا ہوں اور آج رات کو بھی واپس نہیں آؤں گا۔

وہ اپنی ماں کے ساتھ میرے کمرے میں آ گئی۔ میں نے اسے صرف ایک نظر دیکھا پھر اس طرح منہ پھیر لیا جیسے اس کی پرواہ نہ ہو۔ اس ایک نظر میں، میں نے اس کے چہرے کی اڑی ہوئی رنگت، بکھری ہوئی زلفوں اور سوجی ہوئی آنکھوں سے اندازہ لگا لیا کہ پچھلی تمام رات جاگتی رہی ہے۔ اس کی ماں نے پوچھا۔

''کیا بات ہے بیٹا! پچھلی رات تم گھر نہیں آئے تھے؟ میں نے صبح اٹھ کر دیکھا تو باہر تالا پڑا تھا''۔

''جی ہاں'' میں نے جواب دیا ''آج کل کام بہت زیادہ ہے، میں ورکشاپ میں سویا کروں گا''۔

وہ میرے جھوٹ کو سمجھ گئی۔ میری بات کے جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی مگر میں نے اسے موقع نہیں دیا۔ اتنی تیزی سے کمرے کے باہر چلا آیا جیسے واقعی کام بہت زیادہ ہے اور وہاں ٹھہر کر اپنا وقت برباد نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے باہر دروازے پر تالا لگایا اور ورکشاپ میں وقت گزارنے چلا آیا۔ یہ میں خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ مجھے دل و جان سے چاہتی ہے۔ اس کی موجودہ حالت دیکھ کر یہ بھی یقین ہو گیا تھا کہ دور رہ کر اسے تڑپانے والا نسخہ کامیاب ثابت ہو رہا ہے۔

رات کے آٹھ بجے ایک بوڑھا خسرا میرے پاس آیا۔ مجھے خسروں سے سخت نفرت ہے۔ وہ اپنے بے ڈھنگے جسموں پر عورتوں کا لباس پہن کر اتنے بھدے اور برے لگتے ہیں کہ میں انہیں دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا لیکن وہ زلیخا کا ہم جلیس تھا وہ گھنٹوں اس کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہتا تھا لیکن میں نے کبھی اس خسرے سے بات نہیں کی تھی۔ وہ اچانک ہی پہلی بار میرے پاس آیا تو میں سمجھ گیا کہ ضرور کوئی بات ہے۔ زلیخا کے پاس بیٹھنے والا یقیناً اس کا کوئی پیغام لایا ہے۔

میں ملازموں سے ذرا دور ورکشاپ کے ایک گوشے میں آ کر بیٹھ گیا۔ ایک ملازم کو میں نے چائے لانے کے لیے کہا۔ وہ خسرا میرے سامنے ایک لکڑی کی چوکی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''تم تو مجھے جانتے ہو میرا نام اختری ہے۔ میں ابھی زلیخا کے پاس سے آ رہی ہوں'' یہ کہہ کر اس نے میری آنکھوں کو گہری نظروں سے دیکھا۔ میں نے نظریں جھکا لیں تو وہ میری بلائیں لیتا ہوا بولا۔

''میں صدقے، میں واری، تمہارا چہرہ بھی پیلا پڑ گیا ہے۔ زلیخا کی بھی یہی حالت ہے۔ میں سب جانتی ہوں، زلیخا نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے''۔

میں نے اس سے نہیں پوچھا کہ اس نے کیا بتایا ہے۔ میں اس کی زبان سے سننا چاہتا تھا۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔

''میں زلیخا کو دل و جان سے چاہتی ہوں۔ وہ میری دریافت ہے''۔

میں نے چونک کر اسے دیکھا اور پوچھا ''دریافت کا مطلب کیا ہوا؟''

''اس کا مطلب ہے اپنے جنس کی تلاش کرنا۔ جن گھروں میں ولادتی ہوتی ہے وہاں چھٹی کی رسم میں ہم ناچنے گانے ضرور جاتی ہیں۔ کوئی بلائے یا نہ بلائے مگر ہم وہاں پہنچ کر ضد کرتی ہیں کہ ہمیں بھی خوشی منانے کا موقع دیا جائے۔ پڑھے لکھے گھرانوں میں ہمیں اجازت نہیں ملتی۔ مگر پڑھے لکھے ہیں کتنے؟ ہم ان کی طرف نہیں جاتیں اگر جانے کا موقع دیا جائے تو میرا دعویٰ ہے کہ میں دولت مند گھرانوں میں بھی زنخوں کو ڈھونڈ نکالوں گی۔ شاید اسی ڈر سے وہ ایسی خوشی کے موقعوں پر ہمیں نہیں بلاتے۔ ہماری بجائے رنڈیوں کو نچاتے ہیں اونہہ!''

اس نے اس طرح منہ بنا کر اونہہ کیا جیسے وہ رنڈیوں سے افضل ہوں اور محض ناقدری کی وجہ سے انہیں اونچے طبقے میں جانے کا چانس نہیں ملتا ہے۔

''مگر ہم اپنی قدر کرانا جانتے ہیں۔ کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی کے ہاں ایک سدا سہاگن پیدا ہوتی ہے۔ ہم وہاں چھٹی کی رسم میں ناچتے گاتے پتہ کر لیتی ہیں کہ کوئی ایسی مخلوق پیدا ہوئی ہے جس کا شمار نہ مردوں میں ہے نہ عورتوں میں۔ وہاں ہم یہ ثابت کرتی ہیں کہ اس دنیا میں آخر اگر ہم خسرے بن گئی ہیں تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے قدرتی طور سے بھی ہماری جیسی تیسری جنس پیدا ہوتی ہے۔ اگر وہ قابل نفرت نہیں ہے تو ہم سے کیوں نفرت کی جاتی ہے۔ کوئی مرد کے نقش قدم پر چلتا ہے کوئی عورت کے نقش قدم پر۔ ہم سدا سہاگن کے نقش قدم پر چلتی ہیں کیا میں غلط کہتی ہوں؟''

میں نے اکتا کر جواب دیا۔ ''میں تمہارے مسائل پر بحث نہیں کر سکتا۔ تم زلیخا کے متعلق کچھ کہہ رہی تھیں؟''

''ہاں، میں زلیخا کے بارے میں کہہ رہی ہوں، تم اسے حاصل کرنا چاہتے ہو تو ہماری زندگی کو بھی سمجھو۔ نہیں سمجھو گے تو کسی دن زلیخا بدنام ہو جائے گی''۔

اس نے کوئی ایسا کام نہیں کیا ہے کہ بدنام ہو جائے گی'' میں نے کہا۔

وہ ہنسنے لگا پھر رازدارانہ لہجے میں بولا ''زلیخا مجھے رازدار سہیلی سمجھ کر سب کچھ بتا دیتی ہے۔ نہ بھی بتاتی تو میں کچھ کم نہیں ہوں، اڑتی چڑیا کے پر گن لیتی ہوں۔ بھلا یہ کوئی ماننے والی بات ہے کہ راتوں کو تمہارے ساتھ سوئے اور صبح پاک باز عورت کی طرح اٹھے۔ وہ اپنی پاک بازی جتاتی ہے مگر میں نہیں مانتی۔ اگر میں یہ بات پھیلا دوں تو جو لوگ پاک روح سمجھ کر اس کی عزت کرتے ہیں وہ عزت مٹی میں مل جائے گی اور لوگ اسے ہماری طرح پیشہ ور مخنث سمجھنے لگیں گے''۔

میں نے غصے سے اسے دیکھا، میرے جی میں آیا کہ مار مار کر اس کا کچومر نکال دوں۔ وہ ایک سیدھی سادی شریف عورت کو بدنام کرنے کی دھمکی دے رہا تھا۔ میں اسے غصے اور نفرت سے دیکھتا رہا اور ضبط کرتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ اس پر ہاتھ اٹھانا دانشمندی نہیں ہے۔ یہ خسرے اول درجے کے ڈھیٹ اور بے شرم ہوتے ہیں۔ وہ مار کھا کر سامنے سڑک پر جائے گا اور ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے اور زلیخا کو کوسے گا۔ میرے عشق کی داستان عام ہو گی اور زلیخا بدنام ہو جائے گی۔ جس لڑکی کو تمام محلے میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا، آنکھوں میں بٹھایا جاتا تھا، میں اسے رسوا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس نے میرے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر کہا ''میں زلیخا کی دشمن نہیں ہوں اگر دشمن ہوتی تو بچپن ہی سے اسے اپنی ٹولی میں اٹھا کر لے جاتی کیونکہ جہاں کوئی سدا سہاگن پیدا ہوتی ہے، اس دروازے پر ہماری ٹولی دھرنا دے کر بیٹھ جاتی ہے کہ اس سدا سہاگن کو ہمارے حوالے کردو کیونکہ وہ ہماری جنس سے تعلق رکھتی ہے۔

ہوتا یوں ہے کہ جس گھر میں وہ پیدا ہوتی ہے اس کے والدین اس کی اصلیت چھپاتے ہیں۔ باپ شرم سے کسی کو نہیں بتا سکتا کہ بیٹا ہے یا بیٹی۔ اکثر بیٹی ہی مشہور کرتے ہیں۔ زلیخا کی اصلیت کو میں نے پہچان لیا تھا پھر میں اپنی ٹولی کے ساتھ وہاں جا کر شور مچانے لگی تو سارے محلے والوں کو خبر ہوگئی۔ زلیخا بڑی منتوں اور مرادوں کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ اس کا باپ جاہل تھا مگر بہت پیسے والا تھا۔ میں نے اس سے سمجھوتہ کرلیا۔ ایک ایسا سمجھوتا جس کے متعلق ابھی میں تمہیں نہیں بتا سکتی کیونکہ تم زلیخا سے ناراض ہو کر آئے ہو۔ اگر تم نے اس کا دل نہیں توڑا اور اسے اپنا بنا کر رکھا تو میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی کہ میرے اور زلیخا کے درمیان کتنا اہم رشتہ ہے اتنا اہم کہ میں کسی موقعے پر بھی اسے بدنام نہیں کرنا چاہتی۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ تم اسے دیوانگی کی حد تک چاہتے ہو۔ کسی بات پر ناراض ہو کر پچھلی رات سے گھر نہیں جا رہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں تمہارے پاس جاؤں اور تم سے منت اور سماجت کروں کہ راتوں کو گھر سے باہر نہ رہا کرو۔ ایک محبت کی ماری تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ جاؤ بالے! اس کا دل نہ توڑو۔ وہ بہت کمزور لڑکی ہے۔ اسے محبت ہی محبت ملی ہے کسی کی ناراضگی کبھی نہیں ملی۔ یہ تم ہو کہ اس سے ناراض ہو کر آئے ہو۔ وہ تمہاری بے رخی برداشت نہیں کر سکے گی۔ اپنی جان کو روگ لگا لے گی۔ ابھی یہاں سے سیدھے گھر چلے جاؤ، وہ تمہارا انتظار کر رہی ہے''۔

اس کی باتیں سن کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ میری توقع کے مطابق میرے لیے تڑپ رہی تھی۔ میری ضرورت محسوس کر رہی تھی اور میں یہی چاہتا تھا۔

ایک گھنٹے کے بعد میں ورکشاپ بند کر کے گھر واپس آیا تو تمام محلے میں رات کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ گلی سنسان تھی اور نکے پان والا دکان کے پچھلے دروازے سے کاروبار کر رہا تھا۔

میں تالا کھول کر اندر آیا اور دروازے کو بند کر کے جب کمرے میں پہنچا تو وہ میرے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دوڑتی ہوئی آئی اور میرے قدموں سے لپٹ کر فرش پر بیٹھ گئی۔ پھر میں نے اس کی سسکیاں سنیں۔ اس کا بدن کانپ رہا تھا اور وہ رو رہی تھی۔

مجھے اس کی محبت اور دیوانگی نے اتنا متاثر کیا کہ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ کسی کو ایسی محبت کرنے والی ہستی مل جائے تو وہ کتنا خوش نصیب ہوتا ہے۔ یہ میں اس رات سمجھ گیا۔

میں نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا اور سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ وہ میری آغوش میں ایک ننھی بچی کی طرح ہمکنے اور شکایتیں کرنے لگی میں اسے پچکارنے اور چومنے لگا۔

''آپ مجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے، کیوں چلے گئے؟''

''یہ دیکھنے کہ تم میرے بغیر کس طرح تڑپتی ہو؟''

اللہ! آپ نے بہت ظلم کیا ہے۔ میں کیا بتاؤں کہ میری کیا حالت ہوگئی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میری جان نکل گئی ہے۔ میری زندگی میرے پاس نہیں ہے، آپ کے ساتھ چلی گئی ہے اور میں بالکل خالی ہوگئی ہوں۔ کسی سے باتیں کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ بھوک پیاس مرگئی تھی۔ ماں جی پوچھتی رہیں کہ مجھے کیا ہوگیا ہے، صبح سے میں نے کچھ کھایا کیوں نہیں ہے مگر میں انہیں ٹالتی رہی کہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے کھانے کو جی نہیں چاہتا۔ نہ جانے آپ میں کیا جادو ہے کہ آپ کے بغیر بھوک پیاس.....''

میں نے اس کے لبوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ اس کی آواز گھٹ گئی پھر میں نے اسے چوم کر کہا ''اور باقی باتیں بعد میں ہوں گی تم صبح سے بھوکی ہو۔ جاؤ روٹیاں لے کر آؤ میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے کھلاؤں گا'' اس نے خوش ہو کر مجھے دیکھا۔ پھر میرے گلے میں بانہیں ڈال کر بولی ''ایسا لگتا ہے کہ آپ کو کھو کر بڑی مدت کے بعد پایا ہے، چھوڑ کر جانے جی نہیں چاہتا''۔

میں نے اسے سمجھا بجھا کر روٹی لانے کو بھیج دیا اور منجی پر آ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ سالن اور روٹیاں لے کر آئی، ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کر کھانے لگے۔ کبھی میں نوالہ بنا کر اسے کھلاتا تھا اور کبھی وہ مجھے کھلاتی تھی۔ اس وقت اتنی بڑی دنیا ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔ اس کائنات میں صرف ہم دو محبت کرنے والے تھے۔ ہمارے علاوہ کوئی دنیا، کوئی ہستی اور کوئی آواز نہیں تھی۔ وہ بول رہی تھی میں سن رہا تھا۔ میں محبت کے گنگناتے وعدے کر رہا تھا وہ خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔

کھانے کے بعد اس نے برتنوں کو ایک طرف رکھ دیا۔ پھر میرے پہلو میں آ کر بیٹھ گئی اور پچھلی رات سے اب تک کے ہجر کی داستان سنانے لگی کہ کس طرح اس کی نیند اڑ گئی تھی دن کے وقت بھی وہ سو نہ سکی میرے انتظار میں اب تک جاگتی رہی۔ میں نے کہا۔

''تمہیں اب سو جانا چاہیے چلو یہاں لیٹ جاؤ میں تمہیں سلا دیتا ہوں''۔

یہ کہہ کر میں وہاں سے اٹھ گیا اور سوئچ بورڈ کے پاس آ کر لائٹ آف کر دی۔ کمرے میں اندھیرا پھیل گیا، نگاہوں سے ہر چیز اوجھل ہوگئی۔ اس تاریکی اور خاموشی میں صرف منجی بول رہی تھی کہ ایک مہکتا دہکتا بدن کروٹ لے رہا ہے۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا منجی پر آ گیا اور اس کے پہلو میں لیٹ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ پھر اس کے کان میں سرگوشی کی ''تم صرف کل سے تڑپ رہی تھیں، میں چھ ماہ سے تڑپ رہا ہوں۔ اب تمہیں میری تکلیف کا احساس ہوگیا ہوگا''۔

وہ خاموش رہی۔ شاید اس لیے نہیں بول رہی تھی کہ کوئی بات میرے مزاج کے خلاف ہوگی تو پھر میں روٹھ کر چلا جاؤں گا۔ اس کی خاموشی میرے لیے سودمند تھی۔ میں اس خاموش مجسمے سے کھیلنے لگا۔

چاند کی چاندنی آنگن میں اتر رہی تھی اور اس کی دھندلی سی روشنی کمرے کی تاریکی سے کھیل رہی تھی۔ اس دھندلکے میں زلیخا کا وجود کچھ چھپ رہا تھا اور کچھ جھلک رہا تھا۔ میرے ہاتھ ہر جنبش پر چھپنے اور سمٹنے والی کو دریافت کر رہے تھے۔ وہ کبھی کبھی میرے بے باک ہاتھوں کو پکڑ لیتی تو میں اپنے ہونٹوں سے اس کے ہونٹوں میں ڈوبتا ابھرتا اور اسے سمجھاتا۔

''مجھ سے نہ شرماؤ۔ میں تمہارا ہوں اور تم میری ہو۔ گناہ کے تصور کو ذہن سے نکال دو۔ میں تمہیں صدق دل سے اپنا رہا ہوں اگر تمہیں مجھ

پر اعتماد نہیں ہے تو اس قربت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دو۔ مجھے کہیں دور چلے جانے دو.....''

دور ہونے کے ذکر پر وہ گھبرا کر مجھ سے لپٹ جاتی تھی۔ میں نے اسے اچھی طرح خوف زدہ کر دیا تھا اس لیے وہ میری بے باکیوں پر برائے نام احتجاج کر کے ہار جاتی تھی۔ میرے حوصلے بڑھتے گئے، میں حجاب کے پردے ہٹاتا گیا۔ اس کے نازک بدن کی ملائمت سے آشنا ہوتا گیا کچھ دیر بعد مجھے بھٹکنے کا احساس ہوا کہ کمرے کی نیم تاریکی میں ہوس کی چمگادڑ بھٹک رہی ہے، اندھیرے کی دیواروں سے ٹکریں مار رہی ہے، پھڑ پھڑا رہی ہے مگر اسے دیوار کے اس پار جانے کا راستہ نہیں مل رہا ہے کوئی دروازہ نظر نہیں آ رہا ہے۔

میں ہوش سے بے گانہ ہو رہا تھا، مدہوش ہونے کے لیے مزید نشے کی ضرورت تھی۔ نشہ وہ بھی ہوتا ہے جو نکے پان والا فروخت کرتا ہے لہذا پہلی بار، زندگی میں پہلی بار میں اس دکان کے پچھلے دروازے پر گیا اور نشے کی انتہا کو چھو لیا۔ اف! کیسا ظالم اور کیسا مہربان نشہ تھا۔ میں ان نشیلے لمحات کو کبھی بھول نہیں سکتا۔ وہ لمحات جبکہ میں خود کو اور ساری دنیا کو اور نیکی و بدی کو بھلا بیٹھا تھا۔

جب مجھے ہوش آیا تو وہ اپنی بانہوں میں منہ چھپائے رو رہی تھی۔

میرا سر ندامت سے جھک گیا۔ جب جوش اور جذبے سرد پڑ گئے تب احساس ہوا کہ جسے میں جان سے زیادہ عزیز سمجھتا ہوں، اسے تکلیف پہنچائی ہے۔ اس کے ساتھ ایک غیر انسانی سلوک کیا ہے۔ میں بڑی دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا اور وہ ہچکیاں لے کر روتی رہی۔ شرمندگی سے میری زبان نہیں کھل رہی تھی، میں نے خاموشی سے اسے تسلی دینے اور چپ کرانے کے لیے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا۔ اس نے فوراً ہی میرا ہاتھ پرے جھٹک دیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے ایک غلاظت کو اپنے جسم سے جھٹک رہی ہو پھر وہ کھسکتی ہوئی منجی کے سرے پر گئی اور اپنے لباس کو درست کیا اور کراہتی اور کانپتی ہوئی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

نیم تاریکی میں وہ ایک سائے کی طرح نظر آ رہی تھی اور سسکیاں لیتی، کراہتی ہوئی قدم قدم پر ڈگمگاتی اور سنبھلتی ہوئی مجھ سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کیوں جا رہی ہے؟ میں اسے روکنا چاہتا تھا، ایک بار سینے سے لگا کر تسلی دینا چاہتا تھا مگر میری زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

میں ایک مجرم کی طرح خاموش رہا اور وہ چلی گئی۔ دوسری صبح بیدار ہوا تو آنگن میں دھوپ پھیل گئی تھی۔ دوسری طرف آنگن میں کچھ مردوں اور عورتوں کی باتیں کرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر کسی عورت کے رونے کی آواز سن کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔

''زلیخا کے گھر میں کوئی عورت کیوں رو رہی ہے؟ یہ سوال میرے دماغ میں چیخنے لگا۔ میں دروازے کھول کر اس آنگن میں گیا، وہاں محلے کی عورتیں تھیں کچھ جانے پہچانے لوگ تھے اور ان کے درمیان زلیخا کی ماں بیٹھی رو رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟''

ایک نے جواب دیا ''زلیخا پر سکتہ طاری ہے کچھ بولتی نہیں ہے۔ پتہ نہیں اسے کیا ہو گیا ہے؟''

میں تیزی سے چلتا ہوا اس کے کمرے میں آیا، وہاں بھی مرد عورتوں کی بھیڑ لگی تھی۔ سب ہی اسے چاہتے تھے اس لیے اس کے دکھ میں

شریک ہونے آ گئے تھے اور اسے آوازیں دے دے کر اپنی طرف مخاطب کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

وہ اپنی منجی پر لیٹی ہوئی چھت کی جانب تک رہی تھی۔ پلکیں نہیں جھپک رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ دیدے پتھر ہو گئے ہیں۔ بستر پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر صاف ستھرا سرخ رنگ کا لباس تھا۔ وہ ہمیشہ سرخ لباس پہنتی تھی کیونکہ سدا سہاگن تھی اور ایک پاک روح تھی۔ ہمیشہ پاک صاف رہتی تھی۔ وہ پاک روح ہو نہ ہو لیکن میں ندامت سے مرا جا رہا تھا کہ اس کی پاکیزگی کو دھبہ لگایا تھا۔

اس کی ماں روتی ہوئی کمرے میں آئی۔ ایک شخص نے پوچھا۔

''ماں جی! یہ کل شام تک اچھی بھلی تھی پھر اچانک اسے کیا ہو گیا ہے؟''

وہ اپنے آنسو پونچھتی ہوئی بولی ''کیا بتاؤں بیٹا! پرسوں رات کو تین بجے میری آنکھ کھلی تو یہ آنگن میں ٹہل رہی تھی، صبح اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ یہ رات بھر جاگتی رہی ہے۔ کل تمام دن اس نے کچھ نہیں کھایا، کل رات کو ایک بجے میری آنکھ کھلی تو دیکھا یہ آنگن میں غسل کر رہی ہے۔ پاک صاف رہنے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ آدھی رات کو غسل کیا جائے۔ نہ جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔ میں پوچھتی رہی مگر اس نے جواب نہیں دیا۔ لباس بدل کر یہاں آ کر لیٹ گئی تب سے اٹھتی ہوں تو اٹھتی نہیں، بات کرتی ہوں تو جواب نہیں دیتی ہائے میری بچی کو کسی کی نظر لگ گئی ہے۔ دو راتیں گزر گئیں، دوسرا دن گزر رہا ہے اور یہ اب تک جاگ رہی ہے۔ ہائے ربا! ایسے جاگتی رہی تو مر جائے گی۔ لوگو! کچھ کرو یہ معصوم تمہارے کام آتی رہی ہے آج تم اس کے کام آؤ اسے کسی طرح بچاؤ.....''

ماں جی کی باتیں سن کر میرے دل پر کیا گزر رہی تھی میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ غلطی میں کروں گا اور پچھتاوے کے عذاب میں وہ مبتلا ہو جائے گی۔ وہ جسے بچپن سے سمجھا گیا تھا کہ وہ ایک پاک روح ہے اس دنیا کی کوئی غلاظت اسے چھو نہیں سکتی، وہی معصوم لڑکی آنکھیں کھولے سکتے کے عالم میں اس غلاظت کو دیکھ رہی تھی جو اس کے دامن پر لگ گئی تھی۔ اس نے آدھی رات کو غسل کیا تھا، صاف ستھرا لباس پہنا تھا، بستر پر سفید اجلی چادر بچھائی تھی پھر بھی احساس گناہ کا دھبہ اس کے دماغ سے نہیں مٹ رہا تھا۔ میں ندامت سے سر جھکا کر منجی کے قریب آیا اور اسے آواز دی۔

''زلیخا!''

وہ ایسے خاموش رہی جیسے اس کا کان اس دنیا کی کوئی آواز نہیں سن رہے ہوں۔

میں نے منجی کے سرے پر جھک کر اسے پھر ایک بار بڑی محبت سے مخاطب کیا۔

''زلیخا! میں ہوں بالے۔ میری طرف دیکھو.....''

اس کے پھیلے ہوئے دیدے ذرا..... ادھر سے ادھر ہوئے۔ وہ مجھے دیکھنے لگی۔ جب تک اس کی نظریں چھت پر مرکوز تھیں۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں زندگی کی ہلکی سی چمک پیدا ہوئی۔ دور کھڑے ہوئے افراد منجی کے قریب آ کر اسے غور سے دیکھنے لگے۔ انہوں نے صرف اتنا ہی دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں ذرا سی حرکت پیدا ہوئی ہے لیکن میں سمجھ رہا تھا کہ وہ کتنی محبت اور شکایت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

اس کی ماں نے قریب آ کر کہا ''ماں صدقے، میری بچی تجھے کیا ہو گیا ہے؟''

اس نے ایک گہری سانس لی۔ میرے لباس کو دیکھا جسے میں پچھلی رات سے پہنے ہوئے تھا۔ پھر وہ بڑی نقاہت سے بولی ''غسل کر لیجیے!''

میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس پاکیزگی کے سامنے میں نے خود کو دنیا کا سب سے غلیظ انسان محسوس کیا۔ میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر کہا۔

''اچھا میں ابھی غسل کر کے آتا ہوں۔ میں تمہیں سلاؤں گا تم سو جاؤ گی نا؟''

''ہاں! وہ پھر چھت کی جانب گھورنے لگی۔

میں فوراً ہی وہاں سے پلٹ کر اپنے مکان میں آیا۔ جلدی جلدی غسل کیا۔ دھلے ہوئے کپڑے پہنے۔ کچھ لوگ میرے آنگن میں آ کر کہہ رہے تھے کہ میں بڑا خوش نصیب ہوں۔ پاک روح مجھ پر مہربان ہے اور میری موجودگی میں سونا چاہتی ہے۔

میں نے دل میں کہا کہ اچھا ہی ہے تم لوگ اسی غلط فہمی میں مبتلا رہو۔ میں تو زلیخا کے دماغ سے گناہ کا احساس مٹانے جا رہا ہوں۔

جب میں وہاں پہنچا تو اس کی ماں تمام لوگوں کو کمرے سے باہر لا رہی تھی تا کہ کوئی آواز نہ ہو اور بیٹی سکون سے سو جائے۔ میں منجی کے

سرے پر بیٹھ گیا اور اس کے ہاتھ کو بڑی محبت سے تھام کر کہا۔

''زلیخا! تم گناہ کا احساس کر رہی ہو اور میں ندامت سے مرا جا رہا ہوں۔ جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ''۔

''کیسے بھول جاؤں۔ محبت کے نام پر میں کچھ دے رہی تھی، آپ نے کچھ دیا۔ میں روح کی پاکیزگی دے رہی تھی، آپ نے جسم کی غلاظت دی۔ میں آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے آپ کی خاطر اسے قبول کر لیا''۔

اب آپ اس پر بحث نہ کریں۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے اور مجھے بہت گہری نیند آ رہی ہے۔ ایسی نیند مجھ جیسی عورت کو ایک ہی ٹھوکر کے بعد سلا دیتی ہے۔ آپ میری باتیں غور سے سنیں۔ صمدو چاچا، موسیٰ بھائی اور احمد دین کے آئندہ کبھی کوئی میت ہو تو آپ وہاں نہ جائیں۔ آج کے بعد میں خسروں کی پابندیوں سے آزاد ہو جاؤں گی۔ وہ لوگ خسروں کا جنازہ اٹھاتے ہیں۔ آپ سب اس دنیا میں خسروں کا وجود دیکھتے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ وہ کب مرتے ہیں اور کہاں دفن ہوتے ہیں؟

یہ ایک لمبی داستان ہے۔ اختری نے مجھے بتایا ہے، وہی خسرا جو کل آپ کے پاس گیا تھا اسی نے میرے ابان جان سے کہا تھا کہ مجھے ان کے حوالے کیا جائے ورنہ میرے جوان ہونے پر وہ مجھ پر بدفعلی کا الزام لگائیں گے۔ مجھ جیسی ہستی جو نہ مرد ہے نہ عورت اس پر ایسا الزام لگایا جائے تو ایک باپ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔ خسروں کا ڈھیٹ پن مشہور ہے انہیں لات جوتے مار کر بھی ان کی زبانیں بند نہیں کی جا سکتیں۔ یہ خسرہ جس شہر میں رہتے ہیں بڑے اتحاد سے ایک جماعت بنا کر رہتے ہیں۔ اپنی کمائی کا کچھ حصہ ایک فنڈ کی صورت میں جمع کرتے ہیں۔ ہر شہر میں ان کے خاص ملازم ہوتے ہیں جو آدھی رات کے بعد مرنے والے خسروں کا جنازہ اٹھاتے ہیں اور انہیں اپنی کوئی عزیزہ بنا کر قبرستان لے جاتے ہیں۔

صمدو چاچا، موسیٰ بھائی اور احمد دین جیسے شوقین مزاج رئیس کسی جوان خسرے کو اپنی داشتہ بناتے ہیں تو اس بات کا وعدہ کرتے ہیں کہ ان کے کفن دفن کا انتظام وہ خود کریں گے۔ آدھی رات کے بعد صمدو چاچا اور موسیٰ بھائی کی داشتاؤں کی لاشیں انہی خسروں کے گھر سے نکلی تھیں۔ اسپتال یا کراچی سے ان کی بیویاں نہیں آئی تھیں۔ پھر یہ خسرے مجھ جیسی سدا سہاگنوں کی تلاش میں رہتے ہیں اور ہماری پیدائشی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ہمارے والدین کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ خسروں کے کفن دفن کا بندوبست کریں ورنہ وہ سدا سہاگن جوان ہو کر بدنامی کی زندگی گزاریں گی۔ میرے ابا جان راضی ہو گئے۔ جب تک وہ زندہ رہے مرنے والے خسروں کے کفن دفن کے لیے چندہ دیتے رہے۔ کئی بار چوری چھپے انہیں کاندھا دے کر بھی آئے۔

ہمارے پاس روپے پیسے کی کمی نہیں ہے۔ ابا جان نے مرنے سے پہلے نصیحت کی تھی کہ میں ان خسروں کی ضروریات پوری کرتی رہوں ورنہ میری نیک نامی پر حرف آئے گا۔ میں اس نصیحت پر آج تک عمل کرتی رہی۔ سدا سہاگن پاک ہستی سمجھی جاتی ہے۔ مجھے اپنے وجود کے آئینے کو صاف رکھنا تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ الزام تراشی ہو مگر آہ! آپ کی محبت نے مجھے زندگی بھی دی اور موت بھی۔ میں جھوٹی عزت و احترام کے سہارے نہیں جی سکتی۔ پاکیزگی کا جو آئینہ سب سے زیادہ عزیز تھا وہ ٹوٹ گیا ہے۔ میں نے خود کو بہت سمجھایا کہ میں نے اپنے محبوب کی خوشی پوری کی ہے مگر دل نہیں مانتا۔ جب میں پیدائشی طور پر مکمل عورت نہیں ہوں تو میں نے کیسی خوشی پوری کی؟ مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ نام نہاد سہاگن ہو کر سیج پر جاؤں؟ آج مجھ میں اور ایک خسرے میں کوئی فرق نہ رہا۔ یہ توہین کیسے برداشت کروں؟ میں قانون قدرت کے خلاف آپ کی سیج پر چلی گئی اور وہ خسرا

شریعت کے خلاف نماز جنازہ سے گزر کر دفن ہوتے ہیں۔ اس دنیا میں کیسے کیسے تماشے ہوتے ہیں۔ میرے مالک! میرے محبوب! مجھے نیند آ رہی ہے۔ میں نے غسل کر لیا۔ آپ نے غسل کر لیا۔ اب وہی پرانی آرزو ہے کہ آپ مجھے چاہیں۔ مجھ سے محبت کریں۔ ایسی محبت جس میں کوئی غرض نہیں ہوتی، کوئی لالچ نہیں ہوتا۔ کیا ایسی محبت اس دنیا میں ہے؟ میں اس پر جھک گیا اور اس آئینے کی طرح صاف اور شفاف چہرے کو اپنی دونوں ہتھیلیوں میں سجا کر بولا۔

''ہاں! ہر محبت کے پیچھے ایک غرض پوشیدہ ہوتی ہے لیکن اب مجھے نصیحت مل گئی ہے۔ میں تم سے بے لوث محبت کروں گا تم سے کچھ طلب نہیں کروں گا، تمہارے پاکیزہ پیار کی ہر طلب پوری کروں گا، میں وعدہ کرتا ہوں۔ میں قسم کھاتا ہوں''۔

اس کے لبوں پر پھیکی سی، بے جان سی مسکراہٹ آئی اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

وہ سو رہی تھی۔ باہر لوگ دھیمی سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے کہ کہیں اس کی نیند اچاٹ نہ ہو جائے۔ کمرہ بھی خاموش تھا، میں بھی خاموش کہ وہ سو رہی ہے۔ وہ سو رہی تھی اور میرا دل رو رہا تھا۔ میرا ایک ہاتھ اس کے سینے پر تھا اور دوسرا ہاتھ اس کی نبض پر۔ اسے گہری نیند آ گئی تھی۔ نیند خواہ کتنی ہی گہری ہو میرا ایمان ہے کہ وہ قیامت کے روز ضرور اٹھے گی۔

O☆O

میرے خواب ریزہ ریزہ

جو چلے تو جاں سے گزر گئے جیسے خوبصورت ناول کی مصنفہ ماہا ملک کی ایک اور خوبصورت تخلیق۔ میرے خواب ریزہ ریزہ کہانی ہے اپنے ''حال'' سے غیر مطمئن ہونے اور ''شکر'' کی نعمت سے محروم لوگوں کی۔ جو لوگ اس نعمت سے محروم ہوتے ہیں، وہ زمین سے آسمان تک پہنچ کر بھی غیر مطمئن اور محروم رہتے ہیں۔

اس ناول کا مرکزی کردار زینب بھی ہمارے معاشرے کی ہی ایک عام لڑکی ہے جو زمین پر رہ کر ستاروں کے درمیان جیتی ہے۔ زمین سے ستاروں تک کا یہ فاصلہ اس نے اپنے خوش رنگ خوابوں کی راہ گزر پر چل کر طے کیا تھا۔ بعض سفر منزل پر پہنچنے کے بعد شروع ہوتے ہیں اور انکشافات کا یہ سلسلہ اذیت ناک بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے رستوں کا تعین بہت پہلے کر لینا چاہیے۔

یہ ناول کتاب گھر پر دستیاب ہے، جسے رومانی معاشرتی ناول سیکشن میں پڑھا جا سکتا ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com

میٹھا زہر

کہانی وہ ہوتی ہے
جو ایک تہذیب کے اس مخصوص دور کو اپنے
اندر ہمیشہ زندہ رکھتی ہے۔
پنجاب کی تہذیب کی زندہ کہانی
اس کا اختتام نہایت چونکا دینے والا اور نا قابل فراموش ہے۔

عمارہ کو دیکھتے ہی گونگی مورت اور بولتی صورت کو دیکھنے کا فرق واضح ہو گیا۔ واجد نے اب سے پہلے محض اس کی تصویر دیکھی تھی اور اسے دیکھ کر سوچا تھا کہ لڑکی بے حد حسین ہے، اپنے معیار کی ہے۔ اس کے ساتھ تھوڑا سا قت گزارا جا سکتا ہے مگر عین نگاہوں کے سامنے اسے دیکھتے ہی خود تصویر کی صورت گم صم ہو گیا۔ وہ اوپر سے قاتل تھا اندر سے بسمل بن کر رہ گیا۔

عمارہ کی تصویر کو اس نے ایک ہی زاویے سے دیکھا تھا اور اس وقت وہی عمارہ رنگ برنگے لباس پہنے ہوئے عورتوں کی بھیڑ میں صد ہزار پہلوؤں سے جلوہ کناں تھی۔ چاروں طرف شادی کی رونق لگی ہوئی تھی۔ وہ مہمان عورتوں کی خاطر مدارت کے لیے ادھر سے ادھر بجلی کی طرح چھب دکھا کر چھپ رہی تھی۔ کبھی اس زاویے سے، کبھی اس زاویے سے نگاہوں کی پیاس بڑھا رہی تھی۔ وہاں اور بھی ڈھیر ساری لڑکیاں تھیں۔ ایک سے ایک طرح دار، کوئی سج دھج میں ہیر سیال، کوئی حسن میں زلیخا اور کوئی اداؤں میں شیریں تھی لیکن عمارہ کی بات کچھ اور تھی۔ وہ تول میں بھی بھاری تھی اور مول میں بھی۔ اس کے جلوے میں محض حسن و ادا کی فتنہ گری نہیں تھی۔ رعب حسن اس لیے بھی طاری ہو رہا تھا کہ وہ چک نمبر دو سو بتیس کے زمیندار کی اکلوتی بیٹی تھی۔

واجد چک نمبر دو سو تیرہ کے زمیندار جناب علی کا بیٹا تھا۔ وہ ایک زمیندار کی بیٹی سے مرعوب نہ ہو سکا۔ اس کے دل میں جو ہلچل سی مچ گئی تھی وہ محض اس لیے کہ وہ دشمن کی بیٹی تھی اور اس کے داؤ پیچ سے دور تھی۔ جو چیز دسترس سے باہر ہو اس کے لیے دل زیادہ مچلتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس الہڑ دیہاتی لڑکی کے لیے کچھ زیادہ ہی بے تاب ہو گیا تھا۔

وہ خود بھی اپنے پنڈ کا ایک گبرو جوان تھا۔ چیختے ہوئے رنگوں کی قمیص اور چھینٹ کی ریشمی لنگی پہنتا تھا۔ چھ مربعے کی زمینداری میں جہاں

جاتا تھا اپنی رعیت سے حاکموں جیسا سلوک کرتا تھا۔ اگر کوئی بغاوت پر اتر آتا تو زوردار بڑک لگا کر اسے للکارتا تھا۔ کبھی اپنی طاقت سے اور کبھی جاگیردارانہ حکمت سے اس باغی کو کڑی سزائیں دیتا تھا۔ تعلیم کا صدیوں سے رواج نہ تھا، زندگی کے اہم مسائل لاٹھیوں، رائفلوں سے یا دولت سے حل کیے جاتے تھے لیکن بقول شاعر

سرخ پوش بہ لب بام نظر آید

نہ بزور و نہ بزاری نہ بزری می آید

وہ جو حسینہ نظر آ رہی تھی وہ نہ تو طاقت سے، نہ آہ وزاری سے اور نہ ہی دولت سے حاصل ہو سکتی تھی لہذا پہلی بار اس نے دولت بھرے دماغ کی بجائے محبت بھرے دل سے سوچا کہ وہ دشمنی اور داؤ پیچ سے نہیں بلکہ پیار و محبت سے اپنائی جا سکتی ہے۔

اس وقت وہ گلبرگ کی ایک شاندار کوٹھی کے برآمدے میں کھڑا تھا۔ سامنے ڈرائنگ روم کے کھلے ہوئے دروازے سے عمارہ عورتوں کی بھیڑ میں کبھی نظر آتی تھی اور کبھی کوٹھی کے پچھلے حصے میں جا کر نظروں سے اوجھل ہو جاتی تھی۔ برآمدے کی دوسری طرف کوٹھی کے بڑے سے احاطے میں میز اور کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ دور دور کے پنڈوں سے آئے ہوئے زمیندار، پٹواری اور تحصیل دار اپنے اپنے حواریوں کے ساتھ بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ان میں واجد کا باپ چوہدری جناب علی بھی تھا اور اس کا دشمن یعنی عمارہ کا باپ چوہدری کرم دین بھی تھا۔ دونوں کے شانوں سے ریوالور اور گولیوں کی پیٹیاں لٹک رہی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے بہت دور تھے پھر بھی ایک دوسرے کو دیکھ کر اس طرح مونچھوں پر تاؤ دے رہے تھے جیسے وہ ریوالور کی بجائے مونچھوں سے فائر کرنے کا ارادہ کر رہے ہوں۔

وہ برآمدے سے اتر آیا اور لان میں ٹہلنے لگا۔ ٹہلنے کا صرف بہانہ تھا، وہ آہستہ آہستہ کوٹھی کے پچھلے حصے کی طرف جا رہا تھا۔ ایسے وقت جب دو بوڑھے مزید دشمنی کے لیے پر تول رہے تھے، وہ عمارہ کی طرف دوستی کا پہلا قدم اٹھا رہا تھا اور دل ہی دل میں حشمت چاچا کو دعائیں دے رہا تھا جن کی وجہ سے دو دشمنوں کا پورا خاندان اٹھ کر اس کوٹھی میں آ گیا تھا۔ اگر وہ بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ یہاں نہ آتا تو کبھی عمارہ کا دیدار نصیب نہ ہوتا اور زندگی میں پہلی بار کسی کو چاہنے اور کسی سے چاہے جانے کی تڑپ پیدا نہ ہوتی۔

کوٹھی کے پیچھے سرونٹ کوارٹرز کے قریب نازنین خالہ سے سامنا ہو گیا۔ توقع کے خلاف ایک دوسرے کو آمنے سامنے دیکھ کر وہ دونوں ٹھٹک گئے تھے۔ نازنین خالہ نے چاروں طرف محتاط نظروں سے دیکھا۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ آس پاس دوست یا دشمنوں میں سے کوئی انہیں دیکھنے والا نہیں ہے تو انہوں نے آگے بڑھ کر واجد کو گلے لگا لیا۔

''میرے بچے! تمہیں اپنے کلیجے سے لگانے کے لیے ایک مدت سے ترس رہی ہوں۔ یہاں کوئی آئے گا تو نہیں؟''

''نہیں۔ میں خوب سوچ سمجھ کر آیا ہوں۔ ابھی وہاں مجرا شروع ہونے والا ہے۔ اس طرف کوئی نہیں آئے گا۔ کیا آپ میرا انتظار کر رہی تھیں؟''

''ہاں میں سوچ رہی تھی کہ کسی طرح تم سے یا تمہارے ابا سے ملاقات ہو جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ تم ادھر آ گئے۔ میں چاہتی ہوں کہ جو کل

ہونا ہے، وہ آج ہی ہو جائے۔ وہ دیکھو سامنے مالی کا کمرہ ہے، تم وہاں جا کر بیٹھو۔ میں سب انتظام کر چکی ہوں، وہاں کوئی نہیں آئے گا۔ میں ابھی جا کر وہاں عمارہ کو بھیجتی ہوں.....''

عمارہ! واجد کا دل بے اختیار دھڑکنے لگا۔ جس کی تلاش میں وہ بھٹکتا ہوا یہاں تک آیا تھا، وہ آپ ہی آپ اس کے قریب پہنچنے والی تھی۔

نازنین خالہ نے پوچھا۔

''تم نے عمارہ کی تصویر دیکھی تھی؟''

''جی، جی ہاں۔ ابھی ابھی اسے دیکھا ہے وہ بہت اچھی ہے''۔

''بس تو ٹھیک ہے جو کل ہونا ہے وہ آج ہو جائے۔ تم آج ہی اسے لے جاؤ''۔

''جی!'' وہ چونک کر بڑی حیرانی سے اپنی خالہ کو دیکھنے لگا۔ خالہ نے پوچھا۔

''تم اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا انتقام نہیں لو گے؟ آج سے پچیس برس پہلے چوہدری مجھے اٹھا کر لے گیا تھا۔ کیا تم اپنی خالہ کا انتقام لینے کے لیے چوہدری کی بیٹی کو اس سے چھین کر نہیں لے جاؤ گے؟''

''آں..... ہاں..... لے جاؤں گا مم..... مگر یہاں تو چاروں طرف لوگوں کی بھیڑ ہے اگر عمارہ نے شور مچایا تو کیا ہوگا؟''

''تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں نے ایسی چال چلی ہے کہ وہ تمہارے قدموں میں لوٹے گی۔ تمہاری ہر بات پر آمنا وصدقنا کہے گی۔ میں نے اس کے دماغ میں کیسا زہر گھولا ہے، یہ بتانے کا وقت نہیں ہے۔ تم اب جاؤ اور مالی کے کمرے میں اس کا انتظار کرو''۔

یہ کہہ کر نازنین خالہ نے اس کی پیشانی کو چوم لیا پھر تنبیہہ کے انداز میں بولی۔

''دیکھو جتنی جلدی ہو سکے اسے یہاں سے لے کر چلے جانا ہے اگر تم ناکام ہوئے تو اپنے باپ کا غصہ بھی جانتے ہو وہ تمہاری ناکامی برداشت نہیں کریں گے''۔

یہ کہہ کر وہ جلدی جلدی قدم اٹھاتی ہوئی کوٹھی کی جانب چلی گئی۔ واجد تھوڑی دیر تک وہاں گم صم کھڑا رہا۔ اس وقت اس کی حالت عجیب سی تھی۔ وہ اپنی قسمت پر نازاں تھا کہ عمارہ اسے مل رہی ہے، وہ حیران تھا کہ پلک جھپکتے ہی نازنین خالہ نے اس کے لیے سارے راستے ہموار کر دیئے تھے، وہ پریشان تھا کہ اب آگ اور خون کے دریا سے عمارہ کے ساتھ کس طرح گزر سکے گا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا مالی کی کوٹھری میں آ گیا اور ایک چارپائی پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔ اس کے آگے عمارہ کی محبت تھی اور پیچھے برسوں پرانی دشمنی اور نفرتیں تھیں۔

اب وہ محبت اور دیانتداری سے عمارہ کو نہیں اپنا سکتا تھا۔ نازنین خالہ اور چوہدری جناب علی کی نفرتوں کا سہارا لے کر ایک باپ سے جبراً اس کی بیٹی کو چھین سکتا تھا۔

وہ پچیس برس پرانی نفرتوں کی طرف پلٹ گیا۔

پچیس برس پہلے انسان کسی حد تک آسودہ اور خوش حال تھا۔ کھانا، کپڑا اور ضروریات زندگی کی دوسری چیزیں قدرے سستی تھی مگر محبت اس وقت بھی مہنگی تھی۔

جہاں زن، زر اور زمین کا جھگڑا ہو وہاں سے محبت کا گزر نہیں ہوتا۔ جناب علی اور کرم دین کے خاندانوں میں پشت ہا پشت سے دشمنی چلی آ رہی تھی۔ دونوں کی زمینیں ایک حد پر آ کر ملتی تھیں اس لیے کبھی زمینوں کے لیے مقدمے بازیاں ہوتی تھیں کبھی نہری پانی کے لیے لاٹھیاں اور رائفلیں چلتی تھیں۔ جب ان جھگڑوں سے بھی قرار نہ آتا تو پھر کسی عورت کے لیے کوئی فساد کھڑا ہو جاتا تھا۔

دونوں زمینداروں کی حویلیوں میں عورتوں کا میلہ سا لگا رہتا تھا۔ کبھی شہنشاہوں کے ہاں گیلری ہوتی ہے جہاں ملک بھر کی حسینائیں ہابی کے طور پر جمع کی جاتی ہیں اور زمیندار کی حویلی ایک بیگار کیمپ ہوتی ہے جہاں کسانوں کی بہو بیٹیاں خدمت گزاری کے لیے بلائی جاتی ہیں پھر ان کا خون پسینہ نچوڑنے کے بعد انہیں واپس بھیج دیا جاتا ہے۔

جناب علی اور کرم دین کی حویلیوں میں جو خادمائیں آیا کرتیں تھیں ان کا شمار نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ ایک بیمار یا بوڑھی ہو کر جاتی تھی تو دوسری چار اس کی جگہ آ جاتی تھیں۔ جس طرح خاندانی منصوبہ بندی کے دفتر میں مرنے والوں کی تعداد کم اور پیدا ہونے والوں کی تعداد زیادہ ہے اسی طرح حویلیوں میں بڑھاپے کی طرف جانے والیاں کم اور بچپن سے جوانی کی طرف آنے والی زیادہ ہوتی تھیں۔ اتنی زیادہ کہ ان کے نام باقاعدہ یاد نہیں رہتے تھے۔ یہ بھی یاد نہیں رہتا تھا کہ کون باپ کی خدمت کے لیے مامور تھی اور کون بیٹے کی خدمت کے لیے مخصوص تھی۔ آقاؤں کی غلطیوں کی وجہ سے بیچاریاں ادھر سے ادھر ہو جاتی تھیں۔ انسان خطا کا پتلا ہے زمیندار بھی خطا کے پتلے تھے۔

اگر یہ بات اپنی اپنی زمینداری تک محدود ہوتی تو جھگڑے فساد کی نوبت نہیں آتی کیونکہ اپنے کھیتوں کی فصل سے بھوک مٹانے کا حق ہر زمیندار کو پہنچتا ہے۔ مگر وہاں اپنی آن اور شان کا سوال تھا کہ کس کے پاس سب سے زرخیز زمین ہے؟ کس کے پاس سب سے زیادہ دولت اور کس کے پہلو میں سب سے زیادہ حسین عورت ہے؟

یہ مقابلہ ہر سال لاہور کی ہیرا منڈی میں ہوا کرتا تھا۔ اس منڈی کی کسی بھی نئی دریافت کے لیے دونوں طرف سے بڑھ چڑھ کر بولیاں دی جاتی تھیں۔ کوئی کسی سے مات کھانا پسند نہیں کرتا تھا۔ بولیاں اس حد تک بڑھ جاتی تھیں کہ دس ہزار کی گڑیا پچاس ہزار میں پڑ جاتی تھی۔ جناب علی ایک ایک پیسہ دانتوں سے پکڑنے کا عادی تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ محض آن کی خاطر دولت ضائع ہو رہی ہے تو ایک بار اس نے مقابلے میں کرم دین کو چھوٹ دے دی۔

چوہدری کرم دین نے جیت کے نشے میں یہ نہیں سوچا کہ دشمن آسانی سے شکست کھا کر پیچھے کیوں ہٹ گیا ہے؟ وہ تو اسے اس وقت پتہ چلا جب وہ بازار حسن کی سب سے مہنگی طوائف کے ساتھ سیزن گزارنے کے لیے مری جا رہا تھا۔ راستے میں جناب علی کے مسلح آدمیوں نے اسے روک لیا۔ وہ پہلے سے محتاط نہیں تھا، اس کے پاس صرف ایک ریوالور اور ایک بوڑھا ملازم تھا۔ وہ چاروں طرف سے اٹھی ہوئی رائفلوں کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ جناب علی کے آدمیوں نے اس کے ریوالور کو ان لوڈ اور کار کے پہیوں کو پنکچر کیا، اس کی دولت سے خریدی ہوئی طوائف کو اٹھا کر جیپ میں ڈالا اور

راستے کی دھول اڑاتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

یہ توہین ناقابل برداشت تھی۔ اگر اس کے ساتھ بھی مسلح آدمی ہوتے تو وہ ایک طوائف کے لیے خون کی ندیاں بہا دیتا کیونکہ اس وقت وہ محض ایک طوائف نہیں تھی، اس کا غرور تھی، دشمن کے مقابلے میں جیتنے والا ایک تمغہ تھی۔ زمینداروں کی شان و شوکت اس کی زمینوں سے یا ان داشتاؤں کی تعداد سے پہچانی جاتی ہے اور جناب علی نے اس کی پہچان پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ اس وقت کرم دین مجبور تھا، کوئی قانونی کارروائی بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ ایک عورت کا خریدار تھا جو چور دروازے سے خریدی گئی تھی لہذا قانون کی نظروں میں وہ خود بھی ایک مجرم تھا اس لیے صبر کر کے رہ گیا۔

یہ خبر دور دور کے زمینداروں تک پہنچ گئی کہ چوہدری جناب علی سب سے خوبصورت ہیرے کو کرم دین کے پہلو سے اڑا کر لے گیا ہے۔ اس کے حواریوں نے مشورہ دیا کہ جناب علی سے انتقام لینے کے لیے اس کی حویلی سے کسی حسین لڑکی کو اغوا کیا جائے۔ لیکن وہ کوئی اونچا شکار کرنا چاہتا تھا۔ حویلیوں میں غریب کسانوں کی بہو بیٹیاں ہوتی ہیں خواہ وہ کتنی ہی خوبصورت ہوں ان کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ جو چیز مفت مل جائے وہ چرائی نہیں جاتی۔ وہ کوئی قیمتی نایاب ہیرا اٹھا کر لانا چاہتا تھا جو اس طوائف کی ٹکر کا یا اس سے بھی زیادہ مہنگا ہو۔

ایک سال تک وہ صبر کرتا رہا۔ اس دوران جناب علی کی بیوی کچھ عرصے تک بیمار رہ کر اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئی۔ ان دنوں واجد پانچ برس کا تھا۔ وہ مرنے کے بعد جناب علی کا نام لیوا اور جائیداد کا وارث چھوڑ گئی تھی۔ اگر وہ دوسری شادی نہ کرتا تو کوئی فرق نہ پڑتا کیونکہ عورتیں تو ہر وقت ہوس کے دسترخوان پر موجود رہتی تھیں لیکن اس کی چھوٹی سالی یعنی واجد کی خالہ نازنین بے حد حسین تھی۔ ایسی حسین عورت کسی دوسرے کی آغوش میں جائے یہ جناب علی کو منظور نہیں تھا۔ اس نے اپنے سسر کے پاس اپنی سالی کے لیے پیغام بھیجا۔ وہ ایک آزمودہ داماد تھا انکار کی گنجائش نہیں تھی اس لیے رشتہ منظور ہو گیا اور نکاح کی تاریخ مقرر ہو گئی۔

نکاح کے دن جناب علی بڑی شاندار بارات لے کر گیا۔ اس کی حویلی سے سسرالی پنڈ تک ڈھول تاشے بجتے رہے اور بارات میں شریک ہونے والے گبرو جوان لہک لہک کر گیت گاتے اور بھنگڑا ناچتے رہے۔ سسرال والوں نے بھی خوب رونق لگائی تھی۔ اپنے چھوٹے سے پنڈ کو دلہن کی طرف سجا دیا تھا۔ دلہن کی ڈیوڑھی سے پچاس گز کے فاصلے تک راستے کے اطراف رائفل بردار جوان کھڑے ہوئے تھے اور سلامی کے طور پر دنادن رائفلوں کی زبان سے دلہا کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔ راستے کا ایک موڑ کاٹ کر جب بارات دروازے پر پہنچی تو اچانک جناب علی کو خطرے کا احساس ہو گیا۔ اس کے سامنے کھلے دروازے پر چوہدری کرم دین دونوں ہاتھ کمر پر رکھے نہتا کھڑا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ڈھول تاشوں کی آواز مر گئی۔ شادی کی جگہ موت کی سی خاموشی چھا گئی۔

چوہدری کرم دین نے ایک بڑک لگا کر کہا۔

''اوئے جنابے! یہاں سے وہاں تک رائفلیں گن لے۔ یہ سب میرے بندے ہیں، میرے ایک اشارے پر تیرا قیمہ بنا دیں گے۔ میں ہمیشہ اونچا شکار کھیلنے کا عادی ہوں۔ تیری طرح ذلیل نہیں ہوں کہ ایک بازاری عورت پر ہاتھ ڈالوں۔ تو جس شریف زادی کو بیاہنے آیا ہے، میں اسے تیری نگاہوں کے سامنے لے جاؤں گا۔ بول اپنے جوانوں سے کہ وہ میرا رستہ روک لیں''۔

جناب علی نے اپنا سہرا نوچ کر پھینک دیا اور گھوڑی سے اتر کر بولا۔

''چوہدری! تو مجھے نہیں قانون کو للکار رہا ہے۔ یاد رکھ تو ایک بازاری عورت کی وجہ سے عدالت تک نہیں پہنچ سکا لیکن میں ایک شریف زادی کو اغوا کرنے اور اس کی بے عزت کرنے کے جرم میں تجھے کڑی سے کڑی سزا دلا سکتا ہوں''۔

چوہدری کرم دین نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ تھوڑی دیر تک اس کے قہقہوں سے سارا ماحول گونجتا رہا پھر اس نے کہا۔

''بے وقوف میں وہی کھاتا ہوں جسے میں آسانی سے ہضم کر لیتا ہوں۔ کل رات میں نے نازنین سے نکاح پڑھوا لیا ہے۔ وہ ذہنی، جسمانی اور قانونی طور پر میری ہو چکی ہے۔ جس طرح میں مری کے راستے سے خالی ہاتھ واپس آ گیا تھا اسی طرح تو اپنی اجڑی ہوئی بارات لے کر خالی ہاتھ یہاں سے واپس جائے گا''۔

نازنین کا باپ ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا جناب علی کے پاس آیا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔

''بیٹا! میں مجبور ہو گیا تھا۔ چوہدری کرم دین نے بندوق کے زور پر نکاح پڑھوایا ہے۔ جو کچھ بھی ہوا زبردستی میں ہوا۔ مگر اب نازو چوہدری سے راضی ہے۔ شریف زادیوں کو تقدیر جس کے ہاتھ سونپ دیتی ہے، وہ ساری زندگی اسی کا دم بھرتی ہیں اور کسی دوسرے کا خیال تک دل میں نہیں لاتیں۔ میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں یہاں جھگڑا فساد نہ کرو۔ تم بھی میرے داماد ہو میرے غریب خانے میں آؤ۔ میری خوشیوں میں شریک ہو جاؤ''۔

اس نے غصے سے جھلا کر کہا ''تمہاری خوشیاں تمہیں مبارک ہوں۔ میں یہاں سے برات واپس لے جا رہا ہوں۔ اس بے عزتی کے بعد میں کسی کے سامنے سر نہیں اٹھا سکوں گا۔ لیکن میری یہ ناکامی کرم دین کو بڑی مہنگی پڑے گی۔ میں بہت جلد اس کا یہ قرض چکا دوں گا''۔

یہ کہہ کر وہ گھوڑی پر سوار ہونے لگا۔ کرم دین گرج کر کہا۔

''جناب، رک جا۔ پہلے میری برات تیرے سامنے سے گزرے گی تا کہ تجھے بھی معلوم ہو کہ کسی کو بے بس کر کے اس کی عزیز ترین شے چھین کر لے جائی جائے تو دل پر کیا گزرتی ہے''۔

''جناب علی نے چاروں طرف اٹھی ہوئی رائفلوں کو دیکھا، موت کے دہانے پر کھڑے ہو کر کرم دین کے حکم سے انکار کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ وہ گھوڑی سے نیچے اتر آیا پھر ڈھول تاشے بجنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد کمہار نازو کی ڈولی اٹھا کر باہر آ گئے۔ کرم دین کے آدمی آگے آگے بھنگڑا ناچ رہے تھے اور پیچھے پیچھے نازو کی ڈولی جناب علی کے سامنے سے گزر رہی تھی۔

توہین کے احساس سے آدمی مر نہیں جاتا۔ مجبوراً صبر کرتا ہے اور انتقام لینے کے لیے اپنی باری کا انتظار کرتا ہے۔ جناب علی نے بھی قسم کھائی کہ وہ کرم دین سے ایسا عبرتناک انتقام لے گا کہ اس کی آئندہ نسلیں بھی جناب علی کا نام سر کر تھرائیں گی۔

پھر مناسب موقع کا انتظار ہونے لگا۔ چوہدری کرم دین بہت محتاط تھا وہ اپنی کسی کمزوری سے اسے فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔ تین سال بعد اس کی پہلی بیوی سے عمارہ پیدا ہوئی۔ عورت کی عزت کو کھلونا سمجھنے والے بیٹی کے وجود کو اپنے لیے گالی سمجھتے ہیں۔ کرم دین عمارہ کی پیدائش پر جھلا گیا۔ اس نے اپنی بیوی کو ایک ہزار گالیاں دے ڈالیں۔ ایک ماہ تک حویلی میں نہیں آیا۔ نازنین کو لے کر دوسرے مکان میں چلا گیا۔

جناب علی نے جب عمارہ کے متعلق سنا تو خوشی سے اچھل کر کہا۔

''آہا۔اب چوہدری منہ کی کھائے گا۔اب میری باری ہے وہ نازنین کو مجھ سے چھین لے کر گیا تھا اگر میں نے اس کی بیٹی کو بھری جوانی میں نہ اٹھایا تو میرا نام چوہدری جناب علی نہیں.....''

ابھی عمارہ کے جوان ہونے میں دیر تھی۔برسوں کا انتظار اور صبر و تحمل کی ضرورت تھی۔دشمن کو ذلت کی موت مارنے کے لیے مناسب وقت کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔صرف انتظار ہی نہیں بلکہ سوچ سمجھ کر رفتہ رفتہ اپنی سازش کو دشمن کی دہلیز تک پہنچانا پڑتا ہے اور دشمن کی دہلیز پر اس کا ایک مہرہ تھا،وہ نازنین تھی،جس سے سالی اور بہنوئی کا پرانا رشتہ تھا۔پرانے رشتوں کی محبت اور مروت نہیں جاتی۔

نازنین کی بہن مر گئی لیکن بہن کا بیٹا واجد زندہ سلامت تھا جسے گلے سے لگانے کو وہ ترستی تھی مگر دو زمینداروں کی دشمنی نے واجد تک پہنچنے کے تمام راستے بند کر دیئے تھے۔

شروع شروع میں نازنین نے جناب علی کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ چوہدری کرم دین کے پاس بہت خوش تھی۔ایک سال بعد عمارہ کی ماں چل بسی تھی اس لیے وہ تنہا چوہدرانی بن کر حویلی میں راج کر رہی تھی۔دولت اس کے قدموں میں تھی،چوہدری اس کا دیوانہ تھا۔اس کی رعیت میں جتنے بھی لوگ تھے ان کی تقدیریں چوہدرانی کے ایک اشارے پر بنتی اور بگڑتی رہتی تھیں۔پھر وہ کیوں جناب علی کی باتوں میں آ کر اپنے نصیب کی آپ دشمن بن جاتی؟اس لیے اس نے جناب علی کا ساتھ نہیں دیا۔

پھر رفتہ رفتہ اس کا مزاج بدلنے لگا۔عمارہ جب بھی کرم دین کے سامنے آتی تو وہ اسے جھڑکیاں دے کر بھگا دیتا تھا اور جھنجھلا کر نازنین سے کہتا تھا۔

''تم کب تک مجھے یونہی بہلاتی رہو گی۔مجھے ایک بیٹے کی ضرورت ہے،بیٹا پیدا کرو،نہیں تو میں دوسری لے آؤں گا۔نازنین واقعی اسے بہلا رہی تھی اور پیروں فقیروں کے ہاں جا کر تعویز گنڈے کر رہی تھی مگر گاؤں کی ایک تجربے کار دائی نے بتا دیا تھا کہ وہ بانجھ ہے اس سے اولاد نہیں ہو گی۔

یہ سنتے ہی کرم دین چار ماہ کے بعد ایک نئی لڑکی بیاہ کر لے آیا۔عورت اپنے مرد کی داشتاؤں کو تو برداشت کر لیتی ہے مگر نکاحی بیاہی سوکن کو کبھی برداشت نہیں کرتی۔بس یہیں سے نازنین کا دل کھٹا ہو گیا۔اسے اپنی وفاداری اور کرم دین کی بچھلی زیادتی یاد آنے لگی۔ایک تو اس نے جبراً بندوق کے زور پر نکاح قبول کروایا تھا اور جبکہ وہ جسم و جان سے اس کی ہو چکی تھی تو وہ محض ایک بیٹا پیدا نہ کرنے کے جرم میں اس کے اوپر سوکن لے آیا تھا۔

وہ غصے سے تلملاتی رہی،کبھی عمارہ پر غصہ اتارتی اور کبھی اپنی سوکن سے جھگڑتی رہتی۔جناب علی کو اپنے مخبر کے ذریعے وہاں کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔وہ مخبر کرم دین کی حویلی کا ایک ملازم بشیرا تھا۔جناب علی نے بشیرا کے ذریعے نازنین کو کہلا بھیجا کہ جھنجھلانے سے تمہاری بگڑی ہوئی تقدیر نہیں بنے گی۔کرم دین مطلب کا بندہ ہے،صرف تمہارے حسن و شباب کا رسیا ہے،شباب ڈھلتے ہی تمہیں حویلی کے ایک کونے میں بٹھا کر بھول جائے گا۔اگر تم اس کا دماغ درست کرنا چاہتی ہو تو عمارہ سے محبت کرو۔اتنی محبت کرو کہ وہ تمہارے اشاروں پر ناچنے لگے۔وہ ظالم باپ کی ستائی ہوئی ہے تمہاری محبت پا کر وہ تمہارے ہاتھوں سے زہر بھی پینے کے لیے تیار ہو جائے گی''۔

نازنین نے ایسا ہی کیا۔ وہ رفتہ رفتہ عمارہ کو اپنی محبت کا میٹھا زہر پلانے لگی۔ جیسے جیسے عمارہ بچپن سے جوانی کی طرف بڑھتی گئی، نازنین سے اس کی محبت اور عقیدت بھی بڑھتی گئی۔ باپ نے اسے مدرسے میں نہیں پڑھایا تھا اور نہ ہی حویلی میں بٹھا کر پڑھانے کے لئے کوئی ماسٹر رکھا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ لڑکیاں پڑھ لکھ کر چالاک ہو جاتی ہیں، انہیں ہزار پردوں میں رکھو پھر بھی چٹھیاں لکھ کر عشق بازی کرتی ہیں لہذا عمارہ کو جاہل رہنا چاہیے۔ وقت آنے پر وہ بیٹی کو جس کے پلے باندھے گا اسی کے ساتھ وہ بے زبان گائے کی طرح چلی جائے گی۔

لیکن نازنین اسے ایسا سبق پڑھا رہی تھی جو کتابیں نہیں پڑھا سکتی تھیں۔ جوانی میں خواب بھی بدل جاتے ہیں اور خیالات بھی۔ انہی کی مناسبت سے عمارہ کو عشق و محبت کی داستانیں سنایا کرتی تھی۔ ایسی داستانیں جن میں باپ ظالم ہوتا تھا اور بیٹی مظلوم۔ وہ اپنے محبوب سے ملنا چاہتی تھی لیکن باپ اس کے راستے کا پتھر بن جاتا تھا۔ کہانی سنانے کے دوران کسی خوبرو عاشق کا ذکر آتا تو نازنین چٹخارے لے کر کہتی "ہائے ہائے وہ ایسا خوبصورت تھا جیسے واجد ہے۔ تم واجد کو دیکھو گی تو بس دیکھتی ہی رہ جاؤ گی۔ میں کسی دن تمہارے ابا سے چوری اس کی تصویر منگواؤں گی۔ تم دیکھنا وہ ایک شہزادہ معلوم ہوتا ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ وہ لڑکی جس سے محبت کرتی تھی وہ نوجوان دشمن قبیلے کے سردار کا بیٹا تھا"۔

کہانی ایسے نفسیاتی انداز میں سنائی جاتی کہ عمارہ کی نگاہوں کے سامنے کہانی کا ہر کردار مجسم ہو جاتا تھا۔ ہر کہانی کا ولن اسے اپنے باپ کی صورت میں نظر آتا تھا اور ہیرو کا تصور کرتے وقت واجد کی خیالی تصویر سامنے آ جاتی تھی۔

کچھ دنوں کے بعد نازنین نے واجد کی تصویر منگوا کر چپکے سے اسے دے دی۔ تصویر دیکھتے ہی کہانیوں کے تمام شہزادے پھیکے پڑ گئے۔ جتنے رازدارانہ طریقے سے وہ تصویر آئی تھی اتنے ہی رازدارانہ انداز سے واجد اس کے دل میں آ کر بیٹھ گیا اور اس کے دماغ کی سادہ تختی پر محبت کی ایک نئی کہانی لکھنے لگا۔

اب وہ تھی اور واجد کی تصویر تھی۔ جب بھی اسے تنہائی نصیب ہوتی وہ اپنے صندوق سے اسے نکال کر دیکھنے لگتی۔ رات کو بستر پر جب تک جاگتی اسے دیکھتی رہتی۔ نیند آ جاتی تو اسے دھڑکتے ہوئے سینے سے لگا کر سو جاتی۔

ایک رات نازنین نے پوچھا "واجد سے ملو گی؟"

اس نے شرما کر منہ چھپا لیا۔

"دیکھو میں ہزار بار تمہیں سمجھا چکی ہوں کہ مجھے سوتیلی ماں نہ سمجھو۔ میں تمہاری سہیلی ہوں"۔

"آپ..... آپ بہت اچھی ہیں"۔

"اگر میں اچھی ہوں تو مجھ سے اپنے دل کی بات کیوں چھپاتی ہو؟ کیا مجھ پر بھروسہ نہیں ہے؟"

عمارہ نے بڑی عقیدت سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"آپ پر بھروسہ نہیں کروں گی تو کس پر کروں گی۔ اس دنیا میں میرا اور کون ہے؟"

"ہاں میرے سوا تمہارا کوئی نہیں ہے۔ باپ کتنا ظالم ہے، وہ تم دیکھ رہی ہو۔ یہ کتنی عجیب سی بات ہے کہ میں سوتیلی ہوں مگر سگوں سے

زیادہ چاہتی ہوں، وہ سگا ہے لیکن سوتیلوں کی طرح تم سے نفرت کرتا ہے۔ تم بہت بدنصیب ہو عمارہ!''

وہ اپنی بدنصیبی پر ہمیشہ روتی اور کڑھتی رہتی تھی۔ اس وقت بھی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ نازنین نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر کہا۔

''پگلی کہیں کی۔ روتی کیوں ہو؟ میں جو تمہارے ساتھ ہوں۔ میری بات مانو واجد سے شادی کرلو، تمہاری زندگی سنور جائے گی۔ وہ خوبصورت ہے، دولت مند ہے، تمہارے لیے زندگی کی ساری خوشیاں خرید سکتا ہے۔ بولو اس سے ملو گی؟''

وہ ہولے سے بولی ''مم..... مجھے ڈر لگتا ہے۔ ابا کو معلوم ہو گیا تو وہ جان سے مار ڈالیں گے''۔

''جب تمہارے ساتھ تمہاری زندگی کا محافظ ہو گا تو تمہارے دل سے سارا ڈر نکل جائے گا۔ واجد تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گا اور تم سے نکاح پڑھائے گا۔ اس کے بعد تمہارے ابا تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگا سکیں گے۔ تم حشمت بیگ کو جانتی ہو، وہ جو اپنے کپڑوں کی مل کے لیے یہاں کپاس کا سودا کرنے آتے ہیں وہ چوہدری جناب علی سے بھی کپاس کی فصل کا سودا کرتے ہیں۔ دونوں زمینداروں سے ان کے کاروباری تعلقات ہیں۔ انہوں نے اگلے ہفتے اپنی بیٹی کی شادی میں ہمیں لاہور بلایا ہے۔ ادھر سے جناب علی اور واجد بھی آئیں گے۔ میں موقع دیکھ کر تمہیں واجد سے ملاؤں گی یا جناب علی سے کہوں گی کہ وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جا کر واجد کے ساتھ تمہارا نکاح پڑھا دے''۔

''مجھے ڈر لگتا ہے''۔

''پھر وہی ڈر، کیا تم سمجھتی ہو کہ میں تمہیں تباہی کی طرف لے جاؤں گی؟''

''نہیں۔ آپ میری بہت اچھی امی ہیں۔ ابا مجھ سے دشمنی کرتے ہیں لیکن آپ کبھی مجھ سے دشمنی نہیں کر سکتیں۔ میں یہ سوچ کر ڈرتی ہوں کہ نہ جانے وہ لوگ مجھ سے کیسا سلوک کریں گے''۔

''اتنا اچھا سلوک کریں گے کہ تم وہاں سے واپس آنا بھول جاؤ گی۔ تمہارے ابا خواہ مخواہ جناب علی کے دشمن بن گئے ہیں مگر جناب علی تمہیں بیٹی سمجھ کر محبت کرتا ہے۔ وہ تمہیں آنکھوں میں بٹھائے گا، دل میں جگہ دے گا اور واجد تو ہمیشہ تمہیں اپنے سینے سے لگا کر رکھے گا اور اس طرح پیار کرے گا.....''

نازنین نے اسے سینے سے لگا کر چوم لیا۔ وہ پلنگ پر لیٹے ہی لیٹے شرم سے دوہری ہو گئی۔

سازش کتنی دھیمی، کتنی میٹھی اور کتنی محبت میں ڈوبی ہوتی ہے۔ یہ ایک ان پڑھ، نادان اور معصوم دیہاتی لڑکی نہیں جانتی تھی۔ خوابوں سے کون نہیں بہلتا؟ وہ بھی بہل رہی تھی۔

عشقیہ کہانیوں کے چکنے راستے پر کون نہیں پھسلتا؟ وہ بھی پھسل رہی تھی۔ انجام سے بے خبر۔

O☆O

مالی کے کمرے میں روشنی نہیں تھی کوٹھی کے جلتے بجھتے قمقموں کی چھلتی ہوئی روشنی وہاں تک پہنچتے پہنچتے دم توڑ رہی تھی۔ اس نیم تاریکی میں واجد سر جھکائے چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔

دور کوٹھی کے اگلے حصے سے ہارمونیم اور طبلے کی آوازیں آ رہی تھی۔ گھنگھروؤں کی جھنکار اور نغمے کی ڈوبتی ابھرتی لے میں کوئی بائی جی مجرا پیش کر رہی تھی۔ واجد ایسی محفلوں کا شوقین تھا۔ ناچ رنگ اور شراب و شباب کے نشے میں ڈوبے رہنے کی عادتیں اسے ورثے میں ملی تھیں۔ اس کے خاندان میں بھی تعلیم حاصل کرنے کا دستور نہیں تھا۔ ان کے ہاں کتابیں پڑھا کر عمر ضائع کرنے کی بجائے زراعت کی عملی تعلیم دی جاتی تھی۔ زرخیز اور بانجھ زمینوں کی شناخت، فصلوں کی بوائی کٹائی کے طریقے، ایک کسان کے پسینے سے کتنے کنال زمین کی سینچائی ہو سکتی ہے، کھیت مزدوروں کو آدھا پیٹ کھلا کر کس طرح زندہ رکھا جاتا ہے اور کس طرح ان کی بہو بیٹیوں کو مسل کر رکھا جاتا ہے تاکہ وہ اپنی عزت دار بہو بیٹیوں سے آنکھیں ملا کر باتیں نہ کر سکیں۔ جب تک انسان دوسروں کو نیچا نہ رکھے خود کو اونچا نہیں کر سکتا۔ غرضیکہ اس ماحول میں ایسی تعلیم دی جاتی تھی جو کتابوں اور درسگاہوں سے کبھی نہیں ملتی۔

لیکن واجد کے دل میں ایک ذرا سی شرافت کہیں سے بھولے بھٹکے آ گئی تھی۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کبھی مولوی کے گھر میں شیطان پیدا ہوتا ہے اور کبھی شیطان کے گھر میں مولوی۔ اس کی نیک نیتی دور دور تک مشہور تھی کہ وہ پرائی بہو بیٹیوں کے سامنے سے نظریں جھکا کر گزر جاتا ہے۔ نہ کسی کو چھیڑتا ہے، نہ کسی سے بات کرتا ہے۔ اتنی بڑی حویلی میں جہاں رنگا رنگ لڑکیوں کا میلہ سا لگا رہتا تھا وہاں کوئی کھب جانے والی ہو گی مگر وہ کسی کی آرزو نہیں کرتا تھا۔

چوہدری جناب علی نے جب بیٹے کو لڑکیوں سے کتراتے دیکھا تو تشویش پیدا ہوئی۔ نرچہ جوانی میں پہچانا جاتا ہے، کہیں بیٹے کے روپ میں وہ بیٹی کی خصلتیں لے کر تو نہیں آیا ہے؟

کسی نے کہا ایسی بات نہیں ہے دراصل واجد نے لنگوٹ باندھ رکھی ہے، صبح و شام اکھاڑے میں جاتا ہے اب کے سال دنگل میں حصہ لینے کے لیے لاہور جائے گا۔ جناب علی نے جھلا کر کہا۔

''اتار دو اس کی لنگوٹ۔ زمیندار کا بیٹا ہو کر پہلوان بن رہا ہے الو کا پٹھا.....''

حکم حاکم مرگ مفاجات کے مصداق الو کے پٹھے کی لنگوٹ اتار دی گئی۔ اسے رنگیلے اور زندہ دل لوگوں کی صحبت میں بٹھایا گیا۔ جب ان کی رنگین اور سنگین باتیں سن کر اس کی طبیعت میں ترنگ آنے لگی تو اسے کچھ دنوں کے لیے تجربہ کار دوستوں کے ساتھ لاہور کی رنگین گلیوں میں بھیج دیا گیا۔ زمینیں کس طرح خریدی جاتی ہیں وہ بچپن میں ہی سیکھ چکا تھا، عورت کس طرح خریدی جاتی ہے وہ جوانی میں سیکھنے لگا۔

جناب علی کا مقصد یہ نہیں تھا کہ اس کی دولت کوٹھے پر ضائع ہو بلکہ وہ صرف اتنا چاہتا تھا کہ شیر کے منہ کو خون کا چسکا لگ جائے اس کے بعد کوٹھے کا راستہ بند کر دیا جائے گا۔ ان کی اپنی کوٹھی میں عورتوں کی کمی نہیں تھی۔ بعض کوٹھی اور کوٹھے میں بس اتنا ہی فرق ہوتا ہے کہ کوٹھے سے تعلیم حاصل کی جاتی ہے اور کوٹھی میں اس تعلیم سے ساری زندگی استفادہ کیا جاتا ہے۔

لیکن واجد اپنے باپ کی امیدوں کے مخالف جا رہا تھا۔ کوٹھے کی رنگینیوں میں ڈوبنے کے باوجود پنڈ کی شریف بہو بیٹیوں سے بدکتا تھا۔ اس کی پرہیزگاری جناب علی کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اس نے غصے سے کہا۔

''اس گدھے سے جا کر کہو اگر مولوی بن کر رہے گا تو چوہدری کرم دین سے انتقام کیسے لے گا۔ اس کی بیٹی جوان ہوگئی ہے۔ وہ کسی کے ساتھ چلی گئی تو میں، اس مردود کو بیٹا ماننے سے انکار کروں گا''۔

باپ کا پیغام بیٹے تک پہنچا دیا گیا بلکہ عمارہ کی ایک تصویر بھی اسے دے دی گئی کہ وہ اپنے شکار کو اچھی طرح پہچان لے۔ یہ تصویر بس یونہی سی تھی کسی میلے میں اناڑی فوٹو گرافر کی اتاری ہوئی تھی۔ روشنی اور سائے کے امتزاج سے تصویر کے حسن کو جس طرح نکھارا جاتا ہے وہ بات اس میں نہ تھی پھر بھی چہرے کے تیکھے نقوش خمار آلود آنکھوں کی کشش اور جسم کی شادابیاں واضح تھیں۔ اگر یہ سب کچھ نہ بھی ہوتا تو تب بھی واجد اپنی توبہ توڑ دیتا کیونکہ وہ دشمن کی بیٹی تھی۔ خاندانی روایات کے مطابق انتقام لینا اس کا سب سے پہلا فرض تھا اور فرض کی ادائیگی میں بعض اوقات نیکی اور بدی کی تمیز نہیں کی جاتی۔

تصویر کو دیکھ کر اس نے سوچا کہ لڑکی حسین ہے، اپنے معیار کی ہے، اس کے ساتھ تھوڑا سا وقت بھی گزارا جا سکتا ہے اور اسے بھولنے کا وقت آئے تو جس طرح رائفلوں کو بھلا دیا جاتا ہے اسے بھی بھلایا جا سکتا ہے لیکن عین نگاہوں کے سامنے آتے ہی گونگی مورت اور بولتی صورت کو دیکھنے کا فرض واضح ہوگیا۔

وہ چارپائی سے ہڑبڑا کر کھڑا ہوگیا۔ وہ عین نگاہوں کے سامنے آگئی تھی۔ دروازے پر پہلے ایک تاریک سا ہیولا نظر آیا۔ پھر کوٹھی کے سرخ قمقمے روشن ہوئے۔ عمارہ کا چہرہ انار دانے کی طرح کھل گیا۔ وہ چھینٹ کی چادر میں لپٹی سر جھکائے کھڑی تھی۔ سرخ قمقمے بجھ گئے، سبز روشن ہوئے، اس کا چہرہ ناگن کی چکنی جلد کی طرح سبزی مائل ہوگیا۔ وہ جھجکتی ہوئی ایک قدم آگے بڑھی اور کمرے کے اندر یوں آگئی جیسے کوئی ناگن خاموشی سے ڈسنے کے لیے رگ جاں تک پہنچ گئی ہو۔

سبز قمقمے بجھ گئے، زرد روشن ہوگئے۔ شگفتہ چہرے پر یاسیت کا رنگ چھا گیا۔ اداس کلی، زندگی کے تیز جھکڑوں سے سہمی ہوئی چڑیا۔ بچپن کے خول سے نکل کر جوانی کے طلسم ہوشربا میں بھٹکنے والی نادان لڑکی۔ کتنے ہی رنگ اس کے چہرے پر آ رہے تھے اور اس کے حالات زندگی کی عکاسی کر رہے تھے۔

فوٹو گرافر نے خاک تصویر اتاری تھی۔ وہ ساری زندگی کوشش کرتا تب بھی جلے بجھتے رنگوں کی دھوپ چھاؤں میں ایسی حسین لڑکی پیش نہیں کر سکتا تھا۔ واجد دم بخود تھا اور پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھے جا رہا تھا۔ یہ خاموشی چند لمحوں کی تھی پھر اچانک ہی عمارہ آگے بڑھ کر فرش پر بیٹھ گئی اور اس کے قدموں سے لپٹ کر فریاد کرنے لگی۔

''مجھے بچا لیجئے۔ خدا کے لیے میرے باپ کے ظلم و ستم سے مجھے بچا لیجئے۔ میں بدنصیب ہوں۔ میں نے زندگی میں کوئی خوشی نہیں دیکھی۔ میں اپنی خوشیوں کی تلاش میں آپ کے قدموں میں آ گئی ہوں۔ میں ساری زندگی آپ کی کنیز بن کر رہوں گی اور.....اور.....اور.....''

جیسے ریکارڈ کی سوئی پھنس گئی ہو، وہ اور اور کی تکرار میں الجھ گئی۔ واجد نے جھک کر اس کے گداز بازوؤں کو تھام لیا اور پوچھا۔

''اور کیا۔ آگے کہو، تم رک کیوں گئیں؟''

وہ اپنی ہتھیلیوں سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی

''آپ..... آپ ذرا ٹھہریئے میں امی سے پوچھ کر آتی ہوں''۔

واجد نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا پوچھ کر آؤ گی؟''

''وہ انہوں نے سب کچھ سمجھا دیا تھا کہ آپ کے قدموں سے لپٹ کر مجھے کیا کہنا چاہیے۔ میں ابھی پوچھ کر آتی ہوں۔

''میں بتاتا ہوں۔ انہوں نے کہا ہوگا کہ تمہاری فریاد سن کر میں تمہیں قدموں سے اٹھاؤں گا اور دل میں بٹھالوں گا۔ دیکھ لو، تم میرے دھڑکتے ہوئے دل کے قریب آ گئی ہو''۔

جیسے کوئی پنچھی پہلی بار جال میں پھنس کر کانپتا ہے اسی طرح وہ ہولے ہولے اس کی آغوش میں لرز رہی تھی۔

''تم بہت اچھی ہو عمارہ۔ بہت اچھی اور خوبصورت ہو۔ تمہارے بھولپن نے مجھے خرید لیا ہے۔ میں اپنے بزرگوں کی دشمنی اور ان کی آپس کی نفرتوں کو بھول کر تمہیں محبت سے اپنا رہا ہوں تم میرے ساتھ چلو گی؟''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تم میرے لیے اپنے باپ کو اپنے رشتہ داروں اور اپنے گاؤں کو چھوڑ دو گی؟''

''ہاں۔ آپ مجھے چھوڑ تو نہیں دیں گے؟''

''نہیں۔ میں آخری سانس تک تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا جب میں مر جاؤں گا تو.....''

عمارہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا ''تو میں بھی مر جاؤں گی''۔ واجد نے اپنے منہ پر رکھی ہوئی گلابی ہتھیلی کو چوم لیا۔ تھوڑی دیر تک وہ ایک دوسرے کی محبت و قربت سے سرشار ہوتے رہے پھر کمرے کے باہر کسی کی آہٹ سن کر چونک گئے۔ نازنین نے دروازے پر آ کر کہا ''کیا تم لوگوں کو خطرے کا احساس نہیں ہے۔ چلو نکلو یہاں سے پچھلے گیٹ پر بشیرا انتظار کر رہا ہے وہ تمہیں جہاں لے جائے چلے جانا.....''

واجد نے کہا ''لیکن میں تو عمارہ کو اپنے ایک دوست کے ہاں لے جانا چاہتا ہوں''۔

''نہیں!'' نازنین نے سخت لہجے میں کہا ''تمہارے ابا نے کہلا بھیجا ہے کہ تم دونوں بشیرے کے ساتھ جاؤ گے۔ رائل پارک میں تمہارے کہیں رہنے کا انتظام ہو چکا ہے۔ وہ صبح آ کر تم سے ملیں گے، تم دونوں کی حفاظت کرنا ان کا فرض ہے۔ وہ جیسا کہتے ہیں ویسا ہی کرو۔ چلو جلدی یہاں سے نکل جاؤ.....''

واجد نے عمارہ کا ہاتھ تھام لیا۔ کہیں بھی وہ رات گزارنی تھی اور دوسری صبح اپنی زمینوں پر چلے جانا تھا لہٰذا اس نے نازنین خالہ سے بحث

نہیں کی چپ چاپ عمارہ کو لے کر وہاں سے نکل گیا۔

رات گیارہ بجے تھے۔ لکشمی چوک اور رائل پارک میں اچھی خاصی چہل پہل تھی۔ تماش بین سینما گھروں کا طواف کر رہے تھے۔ کچی عمر کے چھوکرے جو گھروں سے بھاگ کر فلموں میں ہیرو بننے آتے تھے، وہ ہوٹلوں میں برتن دھو رہے تھے۔ ان میں کچھ ایسے تھے جو ہوٹلوں کے باہر بیٹھے ہوئے فلاپ فلموں کے پروڈیوسروں اور ڈائریکٹروں کی چمپی کر رہے تھے اور کچھ لڑکے رائل پارک کے دفتروں میں سوڈے کی بوتلیں پہنچا رہے تھے۔ رائل پارک کے دفتروں میں گھروں سے بھاگ کر آنے والی لڑکیاں بھی تھیں، اشتہاری فلموں میں چانس لینے والی ماڈل گرلز بھی اور ادھیڑ عمر کی ایسی عورتیں جو ہیرا منڈی میں غیر قانونی طور پر دلالہ کہلاتی تھیں لیکن فلمی دنیا میں قانونی طور سے انہیں ایکسٹرا سپلائر کہا جاتا تھا۔

ان دفتروں میں عورتوں کی کھنکتی ہوئی ہنسی اور مردوں کے گونجتے، گرجتے ہوئے قہقہے گڈمڈ ہو رہے تھے۔ سوڈے کی بوتلیں کھل رہی تھیں۔ کھلی ہوئی کھڑکیوں سے شراب کے بھپکے اور پان کی پیکیں آ رہی تھیں۔ وہیں ایک گلی کے کے آخری دفتر میں عمارہ اور واجد اپنی محبت کی پہلی رات گزار رہے تھے۔

کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے میں کبھی کبھی ان کی میٹھی سرگوشیاں ابھرتی تھیں اور پارک کے کسی نازک موڑ پر پہنچ کر گم ہو جاتی تھیں۔ بند دروازے کے باہر بشیرا اپنے بھائی فضلے کے ساتھ بیٹھا ہوا باتیں کر رہا تھا۔

فضلا پانچ برس پہلے نوکری کی تلاش میں پنڈ چھوڑ کر یہاں آیا تھا اور تب سے فلم کے اس دفتر میں چپراسی کا کام کر رہا تھا۔ اس کی رہائش اسی دفتر میں تھی۔ ان دنوں اس کا صاحب آؤٹ ڈور شوٹنگ میں گیا ہوا تھا، اس لیے میدان خالی دیکھ کر اس نے بشیرے کو اجازت دے دی تھی کہ وہ کسی بھی چھوکری کو یہاں لا سکتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد فضلے نے حقے کا کش لگا کر پوچھا ''تو نے کہا تھا کہ وہ بڑی (عورت) تیری ہے پھر وہ زمیندار کا بیٹا وہاں کیا کر رہا ہے؟''

بشیرے نے جواب دیا ''وہ بڑی میری ہے۔ جب پولیس یہاں آئے گی تو مجھے یہی بیان دینا ہوگا'' فضلے نے لاپروائی سے کہا ''یہاں پولیس کبھی نہیں آئے گی۔ یہاں جتنے دفتر والے ہیں سب تھانے والوں کو کھلاتے پلاتے رہتے ہیں اس لیے یہاں کبھی پولیس کا چھاپہ نہیں پڑتا''۔

''وہ اور بات ہے''۔ بشیرے نے کہا ''اپنا چوہدری جناب علی دور تک پہنچا ہوا ہے، یہاں کے تھانے دار سے سب باتیں کر لی ہیں۔ ابھی یہاں پولیس آئے گی۔ تجھے تو کسی بات کی فکر نہیں ہونا چاہیے۔ اس کام کے لیے تجھے دو سو روپے دیئے ہیں۔ اگر تجھ پر کوئی مصیبت آئے گی تو چوہدری تجھے اور پیسے دے گا۔ تیری ہر طرح سے مدد کرے گا''۔

فضلے نے حقے کی نے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''تجھے اپنی فکر ہے یا نہیں؟..... وہ زمیندار کا چھوکرا وہاں عیش کر رہا ہے اور تو مفت میں اس لڑکی کے ساتھ بدنام ہو کر جیل جائے گا''۔

''مفت میں نہیں۔ چوہدری مجھے تگڑی رقم دیتا رہتا ہے، آگے بھی دیتا رہے گا اور میں کون سا نیک نام ہوں۔ اتنے بڑے زمیندار کی بیٹی کے ساتھ بدنام ہونا بھی بڑے نصیب کی بات ہے۔ ذرا ٹائم دیکھ، بہت دیر ہو گئی ہے۔ وہ لوگ ہوٹل میں میرا انتظار کر رہے ہوں گے''۔

''یہاں دفتر میں گھڑی نہیں ہے۔ میرے خیال میں ایک بج رہا ہے''۔ بشیرا حقہ چھوڑ کر اٹھ گیا اور دروازے پر دستک دینے لگا۔ اندر سے واجد کی آواز آئی۔

''کون ہے؟''

''میں ہوں بشیرا!''

''بھاگ جاؤ یہاں سے چپ چاپ سو جا''۔

''مالک بہت ضروری کام ہے چوہدری صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں''۔ واجد نے اس بار کوئی جواب نہ دیا ذرا دیر کی خاموشی کے بعد کمرے کے اندر روشنی ہوگئی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کمرے سے نکلنے کے لیے تیار ہو رہا ہے۔ بشیرا معنی خیز نظروں سے فضلے کو دیکھنے لگا۔ واجد نے دروازے کھول کر ادھر ادھر دیکھنے کے بعد پوچھا۔

''کہاں ہیں ابا جان؟''

''وہ ادھر ایک ہوٹل میں بیٹھے ہیں، آپ کو بلا رہے ہیں''۔ واجد تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر اس نے پلٹ کر کہا ''عمارہ دروازہ بند کر لو، میں ابھی آتا ہوں''۔ وہ کمرے سے باہر آ گیا۔ دروازہ اندر سے بند ہو گیا۔ اس نے بڑی محبت اور حسرت سے بند دروازے کو دیکھا۔ اس کا دل نہیں چاہتا تھا کہ عمارہ کو چھوڑ کر جائے لیکن جو باپ اس کا ساتھ دے رہا ہے اس کے حکم سے انکار کرنا بھی مناسب نہیں تھا۔ وہ بڑی بے دلی سے ہوٹل کی طرف جانے لگا۔ ہوٹل کے ایک کیبن کے باہر دو سپاہی ایک میز پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ کیبن کے اندر جناب علی ایک تھانے دار کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔ تھانے دار نے کہا۔

''بہت دیر ہو گئی، آپ کا لڑکا ابھی تک نہیں آیا ہے''۔

''بس آتا ہی ہوگا اگر پانچ منٹ تک نہیں آیا تو میں خود جا کر اسے لے آؤں گا۔ آپ بس اتنا خیال رکھیں کہ لڑکی حوالات ضرور پہنچ جائے اور اخباروں میں اس کا نام جلی حرفوں میں شائع ہو جائے'' جناب علی نے کہا۔

''سب ہو جائے گا، فکر نہ کریں''۔ تھانیدار نے کہا۔

''ایک بات کی فکر ہے، چوہدری کرم دین بیٹی کو یہاں سے لے جانے اور خود کو بدنامی سے بچانے کے لیے آپ کو بڑی سے بڑی رقم دے گا۔ میں دو ہزار آپ کو دے چکا ہوں، اس کے بعد کرم دین آپ کو جتنی بھی رقم دے گا، میں بھی اتنی رقم نقد ادا کروں گا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ اپنی ساری دولت اور ساری زندگی داؤ پر لگانے کے بعد بھی بدنامی سے نہ بچ سکے''۔

''ٹھیک ہے ایسا ہی ہوگا، آپ اطمینان رکھیں'' تھانیدار نے کہا۔

اسی وقت واجد بشیرے کے ساتھ وہاں آ گیا۔ جناب علی نے تھانیدار سے کہا۔

''یہ میرا لڑکا ہے، میں اسے لے جاتا ہوں۔ اب آپ اپنا فرض ادا کیجئے''۔

تھانے دار کو گہری نظروں سے واجد کو دیکھا پھر کیبن سے باہر آ کر اپنے سپاہیوں کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔ واجد نے حیرانی سے پوچھا ''ابا جان کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں، تم میرے ساتھ آؤ'' وہ تیزی سے چلتا ہوا ہوٹل سے باہر جانے لگا۔ واجد نے اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے پوچھا۔

''آخر کچھ تو بتایئے یہ انسپکٹر کہاں گیا ہے؟ آپ مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟ عمارہ بالکل اکیلی ہے، میں اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔ جناب علی اپنے پرانے ماڈل کی کار کے پاس آ کر رک گیا اور دروازے کھول کر بولا ''چلو بیٹھو۔ وہ بعد میں آ جائے گی''۔

واجد نے ایک دم پیچھے ہٹ کر کہا ''نہیں وہ میری خاطر اپنے باپ کا گھر چھوڑ کر آئی ہے۔ میں اسے چھوڑ کر یہاں سے نہیں جا سکتا''۔ جناب علی نے غرا کر کہا ''تم میرے حکم سے انکار کر رہے ہو۔ جانتے ہو وہاں تھانے دار گیا ہے، اس کے ساتھ تمہیں بھی حوالات میں بند کر دیا جائے گا''۔

واجد کے چہرے پر سختی آ گئی ''اس کا مطلب ہے کہ آپ نے چوہدری سے بدلہ لینے کے لیے یہ چال چلی ہے''۔

''ہاں۔ اس نے سینکڑوں باراتیوں کے سامنے میری بے عزتی کی تھی۔ تمہاری خالہ سے زبردستی نکاح پڑھا کر میری غیرت کو للکارا تھا۔ میں نے قسم کھائی تھی کہ اس سے بھی اونچا شکار کھیلوں گا۔ آج میری قسم پوری ہو رہی ہے''۔

''آپ چوہدری سے انتقام لینے کے لیے ایک معصوم لڑکی کو بدنام کر رہے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟ عمارہ نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟''

''نازنین نے بھی کسی کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ وہ بھی کسی کی بیٹی تھی۔ کرم دین نے اس سے زبردستی کیوں کی تھی؟ تم مجھ سے بحث نہ کرو، چلو میرے ساتھ.....''

واجد نے بے بسی سے کہا ''اچھی بات ہے میں آپ سے بحث نہیں کروں گا، آپ انتقام لیجئے لیکن میں عمارہ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا'' یہ کہہ وہ تیزی سے پلٹ گیا اور رائل پارک کی طرف جانے لگا۔ جناب علی نے کار کے دروازے کو ایک جھٹکے سے بند کرتے ہوئے کہا۔

''الو کا پٹھا''۔

O☆O

رشتوں کے ریشم

رفعت سراج کے بہترین اور خوبصورت افسانوں کا مجموعہ.....رشتوں کے ریشم.....جس کی سطر سطر محبت خلوص یگانگت، اور بھائی چارہ کا درس دیتی ہے۔ انسانی زندگی میں سب رشتے خوبصورت ہیں، ہر رشتہ ریشم سے زیادہ خوبصورت اور مضبوط ہے۔ افسانوں کا یہ مجموعہ کتاب گھر پر دستیاب ہے، جسے **افسانے** سیکشن میں پڑھا جا سکتا ہے۔

کمرے میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ایک کرسی پر تھانے دار بیٹھا ہوا تھا۔ دوسری کرسی پر جناب علی تھا اس کے پیچھے بشیرا اور فضلا ہاتھ باندھے کھڑے تھے اور تھانے دار کے قریب کھڑا ہوا واجد سر جھکائے عمارہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ ایک کونے میں چھینٹ کی چادر اوڑھے بیٹھی تھی اور گھٹنوں پر سر رکھے منہ چھپائے سسکیاں لے رہی تھی۔ وہ اپنی زندہ لاش پر آنسو بہا رہی تھی۔

وہ ایسی لڑکی تھی جس نے اپنی زندگی میں کسی سے نفرت نہیں کی تھی بلکہ اپنے ہی باپ کی نفرتوں کا نشانہ بنتی رہی تھی۔ وہ ایسی بے نیاز تھی کہ اس نے کبھی کسی سے کچھ نہیں لیا۔ اور جب اپنے محبوب سے ایک اعتماد کا رشتہ لے کر محبت کی انمول سوغات اسے دی تو اسے بدنامی کے کانٹوں پر لا کر بٹھا دیا گیا۔

کچھ ہی دیر میں اس کا باپ آنے والا تھا۔ تھانے دار نے کریم دین کو بلانے کے لیے ایک سپاہی بھیج دیا تھا عمارہ کو اس بات کا خوف نہیں تھا کہ اس کا باپ اسے مار ڈالے گا۔ موت اب اسے آسان نظر آ رہی تھی لیکن ذلت اور رسوائی کی جو موت وہ مر رہی تھی وہ اتنی شرمناک تھی کہ شرم سے نظریں اوپر نہیں اٹھا سکتی تھی۔ یہ عجیب سی بات ہے کہ عورت جو گناہ کی محرک کہلاتی ہے وہ پہلے شرماتی ہے۔ مرد کو صدیاں گزر جاتی ہیں لیکن وہ نہیں شرماتا۔

تھانے دار نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے جناب علی سے کہا ''چوہدری صاحب آپ کا لڑکا خود ہی اقرار کر رہا ہے کہ اس لڑکی کو بھگا کر لایا ہے۔ میں کیا کروں بتایئے۔ اب تو لڑکی کے ساتھ لڑکے کو بھی تھانے لے جانے ہوگا'' جناب علی غصے سے واجد کو دیکھنے لگا۔ واجد نے کہا۔

''انسپکٹر صاحب! ابا جان سے مت پوچھئے۔ میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے عمارہ کے ساتھ حوالات میں بند کر دیجئے۔ میں اسے چاہتا ہوں، میں اس سے شادی کروں گا۔ میرا دل صاف ہے اس لیے مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے''۔

جناب علی نے غصے سے کہا ''تم ایک چھوکری کی خاطر چوہدری کے سامنے سر جھکانا چاہتے ہو۔ لیکن میں ہار ماننے والا نہیں ہوں۔ مجھے یہ منظور ہے کہ تم جیل چلے جاؤ لیکن یہ منظور نہیں ہے کہ چوہدری اتنی بڑی بدنامی سے بچ کر نکل جائے''۔

واجد نے پوچھا ''میں جیل جاؤں گا تو کیا آپ کی بدنامی نہیں ہوگی؟''

''ہوگی مگر وہ ایک مرد کی بدنامی ہوگی۔ ہزار گناہ کے بعد بھی مرد کی نیک نامی کو ٹھیس نہیں پہنچتی۔ لیکن عورت ایک بار بدنام ہو جائے تو اس کے دروازے پر رشتہ مانگنے تو کیا کوئی تھوکنے بھی نہیں جاتا۔ اب اس سے بہتر انتقام اور کیا ہو سکتا ہے کہ چوہدری ساری زندگی ایک بیٹی کا بوجھ اٹھائے پھرے گا اور اپنے برابر کے لوگوں سے نظریں ملا کر بات نہیں کر سکے گا''۔

تھانے دار نے ہاتھ اٹھا کر جناب علی سے کہا ''چوہدری صاحب! آپ میرے سامنے کسی دشمن سے انتقام لینے کی باتیں نہ کریں۔ یہ قانون کے خلاف ہے مجھے جو کچھ کرنا ہے قانون کے مطابق سوچ سمجھ کر کروں گا۔ آپ چپ چاپ تماشے دیکھئے.....''

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی سپاہی کی آواز سنائی دی۔

''جناب! چوہدری کرم دین حاضر ہے''۔

عمارہ ذرا اور سمٹ کر کونے میں چلی گئی۔ جناب علی اپنی کرسی پر فخریہ انداز میں اکڑ گیا۔ واجد پریشان نظروں سے دروازے کی جانب

دیکھنے لگا۔ تھانے دار اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کی جانب جا رہا تھا۔ جناب علی نے کہا۔

''چوہدری کے پاس ریوالور ہے، وہ یہاں آتے ہی مجھ پر حملہ کرے گا۔ آپ اس سے ریوالور لے لیجئے''۔

تھانے دار ٹھٹک کر دروازے پر رک گیا۔ اس نے اپنے سپاہی کو آواز دی ''دین محمد! چوہدری سے ریوالور لے لو''۔ تھوڑی دیر بعد آواز آئی ''جی حضور! ریوالور میرے پاس ہے۔ تھانے دار نے دروازہ کھول دیا۔ باہر ایک سپاہی کے پیچھے چوہدری کرم دین اور حشمت بیگ کھڑے ہوئے تھے۔ کرم دین کے چہرے پر مردنی چائی ہوئی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی اس نے اندر آنا چاہا، تھانے دار نے اس کا بازو پکڑ کر کہا۔

''ٹھہریے! آپ ادھر دیوار کے پاس کھڑے ہو جایئے۔ اگر آپ نے کوئی ہنگامہ کیا تو میں بڑی سختی سے پیش آؤں گا''۔

حشمت بیگ نے کہا ''آپ اطمینان رکھیے ہم خود نہیں چاہتے کہ کوئی ہنگامہ ہو اور یہ بات اس کمرے سے باہر جائے''۔ وہ دونوں اندر آ گئے۔ کرم دین کی نظریں سب سے پہلے اپنے دشمن پر گئیں۔ وہ طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے اپنی مونچھوں پر بل دے رہا تھا۔ پھر اس نے کونے میں دبکی ہوئی عمارہ کو دیکھا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اچانک اپنی عمر سے زیادہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ اس کے گھٹنے کانپنے لگے، وہ ذرا سا لڑکھڑایا پھر حشمت بیگ کا سہارا لے کر سنبھل گیا۔ اس نے دل میں کہا۔

آہ! اسی دن کے لیے میں بیٹی کی پیدائش پر جھنجلایا تھا۔ میں تیر سے مر سکا نہ تلوار سے، نہ ہی دشمن کی چال سے لیکن ایک بیٹی کی لغزش نے مجھے بے موت مار دیا ہے۔ میں جناب علی کے سامنے نظریں نہیں اٹھا سکتا۔ میں یہ توہین کیسے برداشت کروں؟ میں غیرت کے جوش میں آ کر بیٹی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں تب بھی یہ بدنامی ہو کر رہے گی۔ اگر اس کی غلطی کو معاف کر دوں پھر بھی وہ زندہ لاش کی طرح میرے گھر پر پڑے رہے گی، کوئی غیرت مند اسے قبول کرنے نہیں آئے گا۔

مجھے نہتا کر دیا گیا ہے میں نہ تو دشمن کو مار سکتا ہوں اور نہ ہی خودکشی کر سکتا ہوں کیونکہ میں بزدلوں کی طرح مرنا نہیں چاہتا آخری دم تک جناب علی سے انتقام لینے کی کوشش کرتا رہوں گا۔

ایسے وقت بھی وہ انتقام لینے کے متعلق سوچ رہا تھا حالانکہ اسے اپنی پچھلی غلطیوں کے متعلق سوچنا چاہیے تھا۔ وہ بھی کسی کی بیٹی کو اور کسی کی ہونے والی دلہن کو جبراً بیاہ کر لایا تھا۔ لیکن ایسے وقت انسان کو اپنی غلطیاں یاد نہیں آتیں۔ وہ جو انتقام کی آگ ہوتی ہے وہی غیرت کی بھٹی میں سلگتی رہتی ہے۔

حشمت بیگ نے جناب علی سے شکایت کی ''چوہدری صاحب آپ نے عمارہ کو میرے گھر سے لا کر اچھا نہیں کیا۔ آپ کو کم از میری عزت کا خیال کرنا چاہیے تھا''۔

جناب علی نے کہا ''میں کسی کو لے کر نہیں آیا ہوں عمارہ ہی واجد کے ساتھ آئی ہے۔ اب یہ دونوں حوالات میں جائیں گے اور ان کے دماغ درست ہو جائیں گے''۔

حشمت بیگ نے حیرانی سے کہا ''تعجب ہے آپ ابھی معاملے کو یہاں ختم کرنے کی بجائے اپنے بیٹے کو بھی حوالات میں بھیجنا چاہتے ہیں؟''

جناب علی نے غصہ سے کہا ''یہ نالائق میرا بیٹا نہیں ہے۔ جب تک یہ میری مخالفت کرتا رہے گا اس وقت تک میں اسے اپنا بیٹا تسلیم نہیں

کروں گا''۔

''یہ کیا بات ہوئی؟''حشمت بیگ نے پوچھا''کیا واجد آپ کی مرضی کے خلاف عمارہ کو یہاں لایا ہے؟''

واجد نے حشمت بیگ سے کہا''چاچا جی، ابا جان یہ چاہتے تھے کہ میں عمارہ کو یہاں لا کر بدنام ہونے کے لیے چھوڑ دوں اور خود ان کے ساتھ پنڈ واپس چلا جاؤں۔لیکن مجھے نہ تو چوہدری صاحب سے دشمنی ہے اور نہ ہی میں عمارہ کو کسی مصیبت میں تنہا چھوڑنا چاہتا ہوں۔یہ مجھے حوالات کی دھمکی دے رہے ہیں حالانکہ یہ حوالات تو کیا، میں عمارہ کے ساتھ پھانسی کے تختے پر بھی چڑھنے کو تیار ہوں''۔چوہدری کرم دین نے چونک کر اسے دیکھا، وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ واجد ایک دشمن کی بیٹی کے لیے اپنے باپ کی مخالفت کرے گا۔اچانک کرم دین کے دماغ میں یہ بات آئی کہ وہ اپنے دشمن سے اس کے بیٹے کو چھین سکتا ہے۔

ہاں چھین سکتا ہے۔بدنامی کے بعد بھی عمارہ کو کسی نہ کسی کے پلے باندھنا ہی ہوگا پھر واجد سے کیوں نہ اسے منسوب کیا جائے جبکہ وہ دونوں ایک دوسرے کو جی جان سے چاہتے ہیں۔ہاں اس سے بہتر انتقام اور کیا ہوگا کہ ایک بیٹے کو اس کے باپ سے چھین لیا جائے۔بیٹا تو خاندان کا چراغ ہوتا ہے، بڑھاپے کا سہارا ہوتا ہے۔جناب علی کی کمر ایک دم سے جھک جائے گی۔بعض اوقات دشمن تیر سے نہیں مرتا، تلوار سے نہیں مرتا، گھر میں ایک بیٹی ہو تو پیار کے رشتے سے مر جاتا ہے۔بیٹی خدا کی دین ہے، دنیا کا سب سے قیمتی تحفہ ہے جو عورت اپنے خاوند کو دیتی ہے میں خواہ مخواہ بیٹی کی پیدائش پر جھنجھلا گیا تھا۔

اس نے واجد سے کہا۔

''بیٹے تم سمجھدار ہو۔مجھے بھی تم سے کوئی عداوت نہیں ہے۔اگر تمہارا باپ تمہیں عاق کرتا ہے تو کرنے دو۔آج سے تم میرے بیٹے ہو''۔

حشمت بیگ نے خوش ہو کر تھانیدار سے کہا''جناب لڑکی راضی ہے، لڑکی کا باپ بھی راضی ہے اور لڑکا بھی راضی ہے۔میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اب اس معاملے کو آگے نہ بڑھائیں''۔

''نہیں جناب!''جناب علی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا''میں راضی نہیں ہوں۔میں اس معاملے کو عدالت تک لے جاؤں گا''۔

تھانیدار نے کہا''میں کسی کا مشورہ نہیں سننا چاہتا۔میں قانونی کارروائی کروں گا۔لڑکے اور لڑکی کو فحاشی کے الزام میں گرفتار کر کے لے جاؤں گا''۔فحاشی؟ کرم دین، حشمت بیگ اور واجد پریشان ہو کر تھانیدار کا منہ تکنے لگے اس نے کہا۔

''بشیرے اور فضلے کے بیان کے مطابق واجد اور عمارہ تین گھنٹے تک اس کمرے میں بند رہے۔اس کمرے کی تاریکی میں وہ کیا کرتے رہے؟ یہ میڈیکل رپورٹ سے معلوم ہو جائے گا۔میں اس لڑکی کو طبی معائنے کے لیے ابھی اسپتال بھیجتا ہوں''۔

چوہدری کرم دین چکرا کر رہ گیا۔بات بنتے بنتے بگڑ رہی تھی۔یہ تو ذلت اور رسوائی کی انتہا ہے کہ اس کی بیٹی طبی معائنے کے لیے اسپتال جائے گی۔اس معائنے کی رپورٹ تھانے میں پہنچے گی پھر وہ تھانے سے نکل کر اخباروں میں شائع ہوگی اور جناب علی کی زبانی ایک ایک پنڈ اور ایک ایک زمیندار کے گھر تک پہنچے گی۔وہ چکرا کر کرسی پر دھپ سے بیٹھ گیا۔حشمت بیگ نے تھانے دار سے التجا کی۔

''جناب! یہ ایک شریف لڑکی کی عزت کا سوال ہے۔ آپ چاہیں تو بات یہیں ختم ہو سکتی ہے''۔

تھانے دار نے جواب دیا ''اگر یہ شریف لڑکی ہے تو پھر گھبرانے کی کیا بات ہے، میڈیکل رپورٹ بھی اسے شریف کہے گی۔ اگر یہ بدچلن ثابت ہوئی تو قانون اسے کبھی معاف نہیں کرے گا''۔

چوہدری کرم دین نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکال کر آگے بڑھا دی۔

تھانے دار نے انکار کر دیا۔

رشوت کی رقم بڑھتی گئی۔ تھانے دار جناب علی کی طرف دیکھتا گیا اور انکار کرتا گیا۔ جناب علی کی خاموش نظریں کہہ رہی تھیں کہ میں اس سے زیادہ رقم دے سکتا ہوں لیکن ٹھوس ثبوت کے لیے میڈیکل رپورٹ ضرور حاصل کرنی ہوگی۔

کونے میں سمٹی ہوئی عمارہ کی سسکیاں تیز ہو گئیں۔ اس کے بہت سے حامی اور ہمدرد تھے پھر بھی وہ تنہا تنہا سی تھی۔ بعض اوقات اپنوں کی ہمدردیاں کام نہیں آتیں، صرف دعا کا ایک کچا سہارا رہ جاتا ہے کہ شاید قبول ہو جائے۔ اس نے سسکتے ہوئے دعا مانگی۔ ایک کراہتی ہوئی بہت ہی دھیمی سی آواز اس کی دل کی گہرائی سے نکلی۔

''ربا! مینوں..... بچالے..... ربا.....!''

O☆O

تاش کے پتے

جُرم کی بساط پر کھیلی جانے والی خونی بازی..... ایک جنونی قاتل کا قصہ جو دُنیا کے عظیم ترین قاتلوں کے درمیان اپنا نام سرفہرست رکھنا چاہتا تھا۔ تاش کے باون پتے اُس کے مرکز نظر تھے۔ فی قتل ایک پتے کے حساب سے شروع ہونے والا یہ سلسلہ آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ قانون کے محافظ معمولی سے سراغ کو بھی فراموش نہ کرتے ہوئے قاتل تک پہنچنا چاہتے تھے۔ مگر قاتل کی احتیاط پسندی اور فنکاری محافظوں کی راہ میں حائل تھی۔

سطر سطر سنسنی اور سسپنس پھیلانے والے اس ناول کی دلچسپ ترین بات یہ ہے کہ قاتل آپ کے سامنے ہونے کے باوجود بھی ساتھ پردوں میں پوشیدہ ہے۔

تاش کے پتے ایک سنسنی خیز اور دلچسپ ترین ایڈونچر سے بھرپور ناول ہے جسے کتاب گھر کے **ایکشن ایڈونچر جاسوسی ناول سیکشن** میں پڑھا جا سکتا ہے۔

وہ سب اسپتال کے برآمدے میں یوں بیٹھے تھے جیسے عدالت کے دروازے پر عمارہ کی تقدیر کا فیصلہ سننے بیٹھے ہوں۔ یہ تو سب ہی جانتے تھے کہ فیصلہ کیا ہوگا لیکن اس فیصلے کو چھپایا جا سکتا تھا۔ غلطی کس سے نہیں ہوتی؟ اور اس غلطی کی سزا کسے نہیں ملتی؟ سزا ضرور ملنی چاہیے لیکن اسے ایک اشتہار بنا کر ایک لڑکی کی زندگی برباد نہیں کرنا چاہیے، اس کے سارے خاندان کو بدنام نہیں کرنا چاہیے۔ بس وہ یہی چاہتے تھے جہاں تک بدنامی ہو چکی ہے وہاں سے آگے نہ بڑھے۔

چوہدری کرم دین نے کراہتے ہوئے کہا ''خدا مددگار ہے وہ ہماری عزت رکھے گا''۔

حشمت بیگ نے تائید کی ''ہاں جب تمام سہارے چھوٹ جاتے ہیں تو ایک اسی عالم الغیب کا سہارا رہ جاتا ہے''۔ واجدان سے ذرا دور سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس نے دل میں کہا ''خدا میں پرانا پاپی ہوں مگر عمارہ ایسی نہیں ہے، زندگی میں پہلی بار اس سے ایک غلطی ہوگئی ہے، وہ بھی میرے بہکانے پر۔ تو اس کی سزا مجھے دے، اس مظلوم کو بچا لے، اس کے کورے دامن پر جو دھبہ لگا ہے، اسے مٹا دے۔ تو قادر مطلق ہے، تیرے لیے ناممکن کو ممکن بنا دینا بڑی بات نہیں ہے''۔

آہ..... کم بخت انسان کو کس وقت خدا یاد آتا ہے۔ جب کہیں سے بچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو وہ ایک معجزے کی تمنا کرتا ہے لیکن خدا اب کیا کر سکتا تھا؟ کیا طبی معائنے کی رپورٹ کو روک دیتا یا میڈیکل رپورٹ کو بدل دیتا؟ عقیدے کے مطابق یہی سوچا جا سکتا ہے کہ اچانک زلزلہ آئے گا اور معائنہ ملتوی ہو جائے گا یا بے چاروں کی دعا قبول ہوئی تو پیتھولوجیکل ٹیسٹ کے دوران خوردبین کا لینس تڑخ جائے گا۔

آج کے دور میں یہ سب باتیں مضحکہ خیز ہیں۔ طبی سائنس ایک اٹل حقیقت ہے۔ روحانی نظریات سائنسی حقیقت کی مضبوط چٹان کو نہیں توڑ سکتے۔ لیکن وہ دیہاتی لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھ رہے تھے اس لیے دعائیں مانگ کر اپنے دل کو تسلیاں دے رہے تھے۔ اسپتال کے ایک کمرے میں پارٹیشن کے پیچھے عمارہ ایک بیڈ پر لاش کی طرح پڑی ہوئی تھی۔ اوپر چھت سے لٹکا ہوا الیکٹرک فین تیزی سے گردش کر رہا تھا اور وہ دیدے پھیلائے پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھے جا رہی تھی۔ وہ خاموش تھی مگر اس کا دل رو رہا تھا۔

''میں گناہ گار ہوں۔ کیا میں گناہ گار ہوں؟''

عام طور سے یہی کہا جاتا ہے کہ جس لڑکی نے شادی سے پہلے اپنا کنوارپن کھو دیا، وہ گناہ گار ہوگئی۔ اگر یہ سچ ہے تو مجھے سزا ملنی چاہیے لیکن سزا دینے سے پہلے یہ ضرور سمجھنا چاہیے کہ میں اس مقام تک کیسے پہنچی؟ جب میں پیدا ہوئی تو جناب علی میرا جوانی کے انتظار میں گھات لگا کر بیٹھ گیا۔ میری سوتیلی ماں سستے عشق کا زہر قطرہ قطرہ میرے دماغ میں ٹپکاتی رہی۔

میں جس ماحول میں تھی وہاں عورتیں مرد کے ایک اشارے پر بک جاتی تھیں۔ وہ حویلی نہیں تھی، میرے باپ کا سجایا ہوا ایک چکلہ تھا۔ یہ چکلہ ہر شہر میں ہے، ہر گاؤں میں ہے اور ہر عیاش مرد کی مٹھی میں ہے۔ تم اس چکلے میں اپنی بیٹی کو پالتے ہو اس کے سامنے رنگ رلیاں مناتے ہو اور دعا مانگتے ہو کہ بیٹی کسی مقام پر طبی معائنے تک نہ پہنچے۔ تم کتنے ذلیل قسم کے احمق ہو! ہوس کے غلام! بیٹی کے دلال! تمہاری تہذیب اپنے ہی خنجر سے آپ خودکشی کر رہی ہے۔

''میں تم سے کچھ نہیں مانگتی۔ رحم کی بھیک بھی نہیں مانگتی۔ جہاں انصاف نہ ہو وہاں سے انصاف کیا مانگنا؟ میں خدا سے کہتی ہوں اگر میں مظلوم ہوں، اگر میرے دل میں نیکی اور شرافت ہے، اگر میں گناہ گار نہیں بنی بلکہ بنائی گئی ہوں تو مجھے تیری رحمانیت کا واسطہ ہے مجھے بچالے۔

ربا! میں سائنس کی ٹھوس سچائی کو نہیں جانتی صرف ایک سچائی کو جانتی ہوں اور وہ تو ہے۔ مجھے بچالے.....''

اس کی پلکیں جھپک گئیں۔ اسی وقت ایک لیڈی ڈاکٹر پارٹیشن میں آ گئی اس نے ایک نظر عمارہ پر ڈالی اور ٹرالی پر سے ربر کا دستانہ اٹھا کر بائیں ہاتھ میں پہننے لگی۔ باہر انتظار کرنے والے بے چینی سے برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ تھانے دار نے جھلا کر کہا ''لعنت ہے، میری تمام رات ضائع ہوگئی۔ مجھے نیند آ رہی ہے''۔

وارڈ بوائے نے کہا ''ڈاکٹرنی صاحبہ ابھی اندر گئی ہیں، کم سے کم ایک گھنٹہ اور انتظار کرنا ہوگا''۔

تھانے دار پاؤں پٹختا ہوا ڈاکٹر باری کے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی لیڈی ڈاکٹر باہر آئی، اس نے کاغذ کا ایک پرزہ وارڈ بوائے کو دیتے ہوئے کہا ''یہ ڈاکٹر باری کو دے دو۔ لڑکی کا معائنہ نہیں ہوسکتا۔ سننے والوں کے ذہن میں ایک دھماکہ سا ہوا۔ مسرتوں کی کتنی ہی آتش بازیاں نگاہوں کے سامنے جھلملا گئیں۔ چوہدری کرم دین مارے خوشی کے حشمت بیگ سے لپٹ گیا۔ اس وقت کسی نے نہیں سوچا کہ ایک ناممکن سی بات ممکن کیسے ہوگئی۔

پھر واجد ذرا ہوش میں آتے ہی دوڑتا ہوا ڈاکٹر باری کے کمرے میں آیا۔ ڈاکٹر تھانے دار سے کہہ رہا تھا۔

''لڑکی خوش نصیب ہے اس کی میڈیکل رپورٹ آپ کو نہیں ملے گی''۔

تھانے دار نے کہا ''کیوں نہیں ملے گی۔ میں قانوناً آپ سے مطالبہ کرسکتا ہوں''۔

''آپ ضرور مطالبہ کرسکتے ہیں لیکن دنیا کا کوئی ڈاکٹر اس لڑکی کی میڈیکل رپورٹ نہیں دے سکے گا اور وہ اس لیے کہ اس کا مہینہ شروع ہو چکا ہے۔ طبی سائنس مجبور ہے.....''

O☆O

اپالو

اپالو کہانی ہے حسن و عشق کے دیوتا اور تباہی و بربادی کی علامت اپالو کی.....ایک عالم اس کے خون کا پیاسا ہو گیا تھا.....قدم قدم پہ موت اس کی راہ میں جال بچھائے بیٹھی تھی.....اپالو..... جسے خود اپنی تلاش تھی اور خود آگہی کی جدوجہد میں وہ ساری دُنیا گھوم گیا.....پراسرار حالات میں غیر معمولی صلاحیتوں اور قوتوں کا مالک **اپالو** کیا اپنی تلاش میں کامیاب ہوا؟

اپالو کتاب گھر کے **ناول** سیکشن میں دیکھا جاسکتا ہے۔

کتاب گھر کی پیشکش
http://kitaabghar.com

آئینہ خانہ

ہم اس دنیا کے ایسے آئینہ خانے میں جی
رہے ہیں جہاں ہمیں اپنے گھناؤنے کردار
کا ہر پہلو نظر آتا ہے بشرطیکہ ہماری
آنکھیں دیکھنا جانتی ہوں.....

میں اس دنیا کے ہر ملک، ہر شہر اور ہر بازار میں پایا جاتا ہوں۔ میرے دم سے انسانوں کی خوبصورتی قائم ہے۔ بے شک خداوند کریم نے اچھی صورت دے کر پیدا کیا ہے مگر میں ان صورتوں پر جھاڑو پھیرتا ہوں، انہیں بناتا سنوارتا ہوں، ان کی مرمت کرتا ہوں اور ان کی اچھی طرح حجامت کرنے کے بعد ان کو سنوارتا اور نکھارتا ہوں۔ اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں کون ہوں؟

میں ایک حجام ہوں۔ اگر آپ کہانیاں پڑھ کر انسانوں کے مسائل کو سمجھنا چاہتے ہیں تو میرا نام سن کر ناک بھوں نہ چڑھائیں۔ میں آپ ہی کی دنیا کا آدمی ہوں۔ آپ ہی کی طرح انسان ہوں۔ فیشن ایبل عورتوں کی تراشیدہ زلفیں، کمان جیسی بھنویں، تھریڈنگ کیے ہوئے چکنے چہرے اور مردوں کے سولجر کٹ، کالج کٹ اور ہپی کٹ جیسے تراشیدہ گیسو یا کلین شیوڈ چہرے، یہ سب کچھ میرے ہی ہاتھوں کی صفائی کا نتیجہ ہیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے مجھے آپ کی دنیا میں پیدا کیا اور جانوروں کو مجھ جیسی اہم ہستی سے محروم رکھا۔

جب انسان غار کے زمانے سے نکل کر تہذیبی دور میں داخل ہوا تو اسے بکروں، بندروں اور ریچھوں سے الگ نظر آنے اور خوبصورت بننے کے لیے سب سے پہلے میری ضرورت اور اہمیت کا احساس ہوا۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا جب مجھے بڑی محبت اور احترام سے خلیفہ کہہ کر مخاطب کیا جاتا تھا اور اپنے پاس بٹھایا جاتا تھا۔ گھریلو مسائل اور پنچوں کی محفل میں شریک کیا جاتا تھا۔ غریب گھرانہ ہو یا امیر گھرانہ، شادی بیاہ کے موقعوں پر میری موجودگی لازمی ہوتی تھی۔ جب رشتوں کی بات چلتی تو اگوا کے طور پر میں ہی کام آتا تھا۔ لڑکے اور لڑکی کے متعلق چھان پھٹک کرنے اور صحیح معلومات حاصل کرنے کے لیے میری خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ پھر اس سلسلے میں لڑکے اور لڑکیوں کے متعلق جو بات میری زبان سے نکل جاتی وہ پتھر کی لکیر بن جاتی تھی مگر افسوس صد افسوس کے نئی نسل کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اب خود ہی اسکولوں، کالجوں، تفریح گاہوں اور بس کے اڈوں پر اپنے معاملات طے کر لیتے ہیں۔ اگر ماں باپ سیدھی طرح مان گئے تو ان کی بزرگی کا بھرم رہ جاتا ہے..... ورنہ وہ عدالت میں پہنچ کر اپنے بالغ ہونے کا سرٹیفکیٹ

پیش کر کے کورٹ میرج، سول میرج، لو میرج یا خانہ خراب میرج کر لیتے ہیں۔

میری دعا ہے کہ نئی نسل کے نوجوانوں کو کہیں سے لُو لگ جائے مگر کسی سے لونہ لگے، یہ بچے اسی طرح لو میرج تک پہنچ جاتے ہیں۔ دو برس پہلے ہماری برادری کا ایک بندہ لندن سے تربیت حاصل کر کے یہاں آیا تھا۔ جب وہ ہمارے ملک خداد میں تھا تو محض ایک حجام تھا، لندن سے واپس آتے ہی باربر ماسٹر بن گیا۔ وہ اپنے ساتھ حجامت بنانے کی جدید مشینیں اور ایک عدد گوری میم لے کر آیا۔ میں نے پوچھا۔

''اس میم کا کیا مصرف ہے؟''

اس نے جواب دیا ''میں مشینوں سے حجامت بناؤں گا۔ وہ اپنے خوبصورت ملائم ہاتھوں سے مساج کرے گی اور تبسم کی بجلیاں گراتی ہوئی چمپی کیا کرے گی۔ تم مردوں کی پرابلم کو نہیں سمجھتے۔ پرابلم کے معنی جانتے ہو؟ اونہہ، تم کیسے جانو گے۔ تم تو کبھی لندن نہیں گئے۔ بس یہ سمجھ لو کہ حجام سے باربر ماسٹر بننے کے لیے بیچ بیچ میں انگریزی کا ایک آدھ لفظ بولنا ضروری ہے۔ ہمارے ملک کی پان کھانے والی کتنی ہی اماں جانیں اور حقہ پینے والے ابا جان اسی طرح ممی اور ڈیڈی کے خطابات پر پہنچ چکے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو تم بھی ایک دن باربر بن جاؤ گے''۔

''تم پرابلم کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے؟''

''ہاں، پرابلم کا مطلب ہے مسئلہ۔ مردوں کا مسئلہ یہ ہے کہ اپنی حجامت بنواتے وقت بھی وہ کسی حسین عورت کی قربت چاہتے ہیں۔ اگر عورت پانچ روپے کے بجائے پچیس روپے کی حجامت بنا دے تو وہ خوش ہو کر مستقل گاہک بن جاتے ہیں۔ نوجوانوں کے مسائل یہ ہیں کہ انہیں کہیں آرام سے بیٹھ کر عشق کرنے کا موقع نہیں ملتا ہے۔ میں ان مجبور عاشقوں کے لیے یہاں ایک بڑی سی دکان کھولوں گا، اس دکان کے دو حصے ہوں گے۔ ایک حصے میں لڑکیاں اپنی زلفوں کی کرلنگ، شیکی اور بیل اپ بنوائیں گی۔ دوسرے حصے میں نوجوان اپنا حلیہ درست کرانے آئیں گے۔ لڑکے اور لڑکیوں کے لیے ایک مشترکہ ویٹنگ روم ہوگا۔ وہ آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھ کر اپنی اپنی باری کا انتظار کریں گے۔ اب آمنے سامنے بیٹھنے سے کوئی خوشگوار حادثہ پیش آجائے تو اس کی ذمے داری ہم پر نہیں ہوگی۔ اگر ہو گی بھی تو کیا فرق پڑتا ہے؟ پہلے بھی تو ہمارے باپ دادا گوا بن کر لڑکے اور لڑکیوں کو شادی کے مرحلے تک پہنچاتے تھے''۔

میں نے قائل ہو کر سر ہلاتے ہوئے کہا ''واقعی، ناک ادھر سے پکڑو یا ادھر سے آخر ناک ہی پکڑی جائے گی۔ ہمارے باپ دادا کا انداز پرانا تھا۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ تم لندن سے بہت کچھ سیکھ کر آئے ہو۔ نئے دور کے تقاضوں کے مطابق ہم ہیئر ڈریسنگ اور بیوٹی پارلر کے خوب صورت اڈے بنا کر اگوا کے فرائض انجام دے سکتے ہیں۔ میں نے تمہیں استاد مان لیا۔ تم مجھے اپنا شاگرد بنا لو''۔

''اونہہ۔ یہ استاد کیا ہوتا ہے؟ میں نے کہا نا کہ تمہیں انگریزی کا ایک آدھ لفظ سیکھنا چاہیے تم مجھے ماسٹر کہہ سکتے ہو''۔

''اچھا استاد! ماسٹر کہا کروں گا''۔

''اوں ہونہہ۔ اس طرح ماسٹر نہ کہو۔ ماسٹر کے ما کو ذرا ٹیڑھا کر کے مے کہو مے سٹر.....''

میں نے ذرا منہ ٹیڑھا کر کے مے سٹر کہا۔ وہ خوش ہو کر سمجھانے لگا۔

''دیکھو۔ میں تمہیں انسان کے ٹیڑھے پن کا راز بتاتا ہوں۔ انسان نے ازل سے کبھی کسی چیز کو سیدھا رکھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ الفاظ بہت ملائم اور نازک ہوتے ہیں، یہ انسان تو فولادی تہذیب کو بھی جگہ جگہ سے ٹیڑھا کر دیتا ہے۔ ہمارے باپ دادا نے صدیوں سے ان کی حجامت کرتے کرتے انہیں آدمی کی شکل دی تھی۔ یہ پھر ادھر سے ادھر ٹیڑھے ہو کر ہپی بن گئے۔ عورت کو پردہ سکھایا تو اس نے سیدھے سادے برقعے کو اپنے بدن کے شبابی حصوں کے مطابق تراش کر اسے میکسی برقعہ بنا دیا۔ اس طرح ہر چیز کو ٹیڑھا کرنے سے بعض اوقات ایک نیا حسن پیدا ہو جاتا ہے اور اکثر اوقات اچھا خاصہ حسن مضحکہ خیز بن جاتا ہے مگر مے سٹر کہنے میں بڑا حسن ہے، ہے نا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ یہ شکایت نہیں کی کہ اسے مے سٹر کہتے کہتے میرا منہ ٹیڑھا ہو کر رہ جائے گا۔ مجھے اس سے بہت کچھ سیکھنا تھا۔ ویسے میں حجامت کرنے کے فن میں پہلے ہی سے استاد کامل تھا مگر وقت کے نئے تقاضوں کو سمجھنا اور ان سے نمٹنے کے جدید طریقے سیکھنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لئے میں اس کا شاگرد بن گیا۔ لندن جانے سے پہلے اس کا نام رمضو نائی تھا۔ لندن پہنچتے ہی وہ اپنے نام کو توڑ مروڑ کر بار بر ماسٹر رمزی بن گیا تھا اور اب یہاں آ کر رمزی ہیئر ڈریسنگ اور بیوٹی پارلر کے نام سے ایک بڑی دکان کھول لی تھی۔ دکان تھی آئینہ خانہ تھا۔ چاروں طرف بیلجیم کے صاف و شفاف آئینے لگے ہوئے تھے۔ وہاں آنے والے گاہک کہیں بھی کھڑے ہو کر خود کو ہر زاویے سے دیکھ سکتے تھے۔ میں نے وہاں پہلی بار کھڑے ہو کر یہ گیان حاصل کیا کہ ایسی جگہ انسان کو اپنا ہر پہلو نظر آئے تب بھی وہ خود کو نظر انداز کر کے دوسروں کو ہر زاویے سے دیکھتا ہے۔ میں نے وہاں سوئٹی کو پہلی بار ہر طرف سے دیکھا کہ وہ کس طرح ایک ایک زاویے سے مقناطیس بن کر اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔

سوئٹی اس انگریزی حسینہ کا نام تھا جو مے سٹر رمزی کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ وہ دراز قد کی بھاری بھرکم عورت تھی۔ بدن میں گوشت اور چربی کی اتنی بہتات تھی کہ اسے سوئٹی کی بجائے فیٹی (تگڑی) کہنا زیادہ مناسب ہوتا۔ اس کی جگہ کوئی دیسی عورت ہوتی تو دنبے کی طرح بھدی نظر آتی مگر وہ لباس کے اندر کورسیٹ بیلٹ باندھ کر پیٹ کے لٹکے ہوئے گوشت کو سمیٹ کر پچکا لیتی تھی۔ کمر کو پتلی بنا کر اس میں خم پیدا کر لیتی تھی۔ اس طرح کولہے خود بخود ابھر آتے تھے۔ سینے کے ابھار کو ان کی بھولی ہوئی بلندیوں پر قائم رکھنے کے لیے فوم کے بریزر پیڈ استعمال کرتی تھی۔ جتنی ہوشیاری سے بدیسی مال کی پیکنگ ہوتی ہے اور اسے اوپر سے خوبصورت بنایا جاتا ہے، اتنی ہی ہوشیاری سے وہ پیک ہو کر ہمارے ملک میں آئی تھی۔

ہمارے ہاں ایک سے بڑھ کر ایک مثالی حسن ہے۔ ایسی ایسی طرح دار حسینائیں ہیں کہ انہیں دیکھنے اور سمجھنے کے لیے حسن نظر چاہیے مگر ہماری نظریں لوٹ پوٹ کر بدیسی پیکنگ پر ہی ٹھہرتی ہیں۔ مے سٹر رمزی نے ہماری اسی کمزوری کو سمجھ کر سوسائٹی کو یہاں سے امپورٹ کیا تھا۔ میں خود اس کے قریب رہنے کے باوجود اسے آئینے کے ایک ایک زاویے سے دیکھتا رہتا تھا۔ دیکھنے کے لیے یوں تو اور بھی بہت کچھ تھا۔ ہماری دکان کے خوبصورت ویٹنگ روم میں جوان لڑکے لڑکیاں آنے لگے تھے۔ وہاں ایک طرف کے صوفے پر لڑکے اپنی حجامت بنوانے کی باری کے انتظار میں بیٹھے ہوئے سامنے صوفے پر بیٹھی ہوئی لڑکیوں کو تکتے رہتے تھے۔ لڑکیاں سامنے میز پر رکھے ہوئے میگزین اٹھا کر ان کی ورق گردانی کرنے کے بہانے شرماتی، لجاتی اور نظریں چراتی رہتی تھیں۔ بڑا ہی رومان پرور ماحول تھا۔ پہلے پہل کنواری نظریں یونہی جھکتی ہیں۔ اس کے بعد دیکھنے والوں کو جھکاتی چلی جاتی ہیں۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ جھکنے والے ہر دوسرے تیسرے روز ہمارے سیلون میں پہنچ جاتے تھے۔ وہ روزانہ اپنی حجامت

نہیں بنوا سکتے تھے اس لیے کبھی چمپی کروانے اور کبھی ہیئر ڈائنگ کے بہانے آتے رہتے تھے۔

آئینہ خانہ میں روزانہ کتنے ہی چہرے نظر آتے تھے۔ ہر چہرہ اپنی ایک کہانی سناتا تھا۔ وہاں جمیلہ نام ایک لڑکی اکثر آتی تھی، اسے اپنے نام کی مناسبت سے حسین و جمیل ہونا چاہیے تھا مگر وہ خوبصورت نہیں تھی، بدصورت بھی نہیں تھی۔ اگر کوئی اسے محبت سے نہ دیکھتا تو نفرت سے بھی نہ دیکھتا۔ جس طرح گوشت کا ناغہ ہو تو سبزی سے گزارہ ہو جاتا ہے اس طرح وہ بھی گزارے کے قابل تھی، بالکل ہی گئی گزری نہیں تھی۔ بنانے والے نے اس کے ساتھ بالکل ناانصافی نہیں کی تھی۔ اس کی زلفوں کو بے حد خوبصورت بنایا تھا۔ ایسے گھنے اور لانبے بال تھے کہ پیچھے گھٹنوں تک آتے تھے۔ ریشم کی ملائمت کیا ہوگی، اس کی زلفیں تو نازک سے جذبوں کی طرح ملائم تھیں، جوانی کے ہر خطرناک موڑ کی طرح خم کھائی ہوئی تھیں اور ایسی گہری سیاہ تھیں کہ اس تاریک صحرا میں کوئی بھی مسافر راستہ بھول سکتا تھا۔

میں نے بار بار ڈائر سے بال خشک کرنے کے دوران انہیں بار بار چھو کر دیکھا تھا۔ وہ سیدھی مانگ نکالتی تھی اور بڑی خوبصورتی سے چوٹی گوندھتی تھی۔ یعنی ہماری دکان میں بالوں کے اسٹائل بدلنے نہیں آتی تھی۔ وہ صرف تھریڈنگ کی محتاج تھی۔ میں یہ بتا دوں کہ تھریڈنگ کیا ہوتی یہ اکثر عورتوں کے چہروں پر مہین ملائم روئیں ہوتے ہیں جو بظاہر نظر نہیں آتے مگر ان کی موجودگی سے چہرے کی صباحت اور چکناہٹ ماند پڑ جاتی ہے۔ ہم بٹے ہوئے دھاگے سے ایک خاص تکنیک کے ذریعے یہ روئیں صاف کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد چہرے کی قدرتی چکناہٹ اور اجلا پن نمایاں ہو جاتا ہے اور اس کے بعد واقعی جمیلہ کا چہرہ نکھر جاتا تھا۔ کام کے دوران ہمیں اپنے گاہکوں سے باتیں کرتے رہنے کی عادت سی ہوگئی ہے۔ ایک روز میں نے اس سے پوچھا۔

''باجی! آپ کے والد صاحب تو بڑے بزنس مین ہوں گے؟''

ہم اپنے گاہکوں کو بھائی جان اور باجی کہتے ہیں خواہ وہ عمر میں ہم سے کتنے ہی چھوٹے ہوں۔ اس نے جواب دیا۔

''میرے والدین مر چکے ہیں، میں اکیلی ہوں''۔

''آپ کیا کرتی ہیں؟''

''میں ایک انگلش سکول میں ٹیچر ہوں۔ اس کے علاوہ دو رئیس زادوں کو ٹیوشن پڑھاتی ہوں۔ ہر ماہ بارہ سو روپے مل جاتے ہیں۔

رفتہ رفتہ گاہکوں سے بے تکلفی بڑھتی ہے۔ کچھ عرصے بعد اس نے بتایا کہ وہ واجد نامی ایک خوبرو نوجوان سے محبت کرتی ہے، جب وہ ٹیکنیکل کالج سے پاس ہو کر کہیں ملازمت کر لے گا تو ان کی شادی ہو جائے گی۔ ایک بار واجد نے اس کے قریب بیٹھ کر پوچھا تھا کہ وہ اسنو کریم وغیرہ کیوں استعمال نہیں کرتی ہے؟ ان کے بغیر چہرہ کچھ روکھا پھیکا سا نظر آتا ہے۔

جمیلہ اپنے چہرے کا رنگ نکھارنے کے لیے کتنے ہی جتن کرتی تھی۔ اس کی کسی سہیلی نے سمجھایا، اسے تھریڈنگ کرانا چاہیے تب سے وہ ہماری دکان کی مستقل گاہک بن گئی تھی۔ مردوں کی حسن پرستی عورتوں کو بیوٹی پارلر کا راستہ دکھاتی ہے۔ اگر واجد جمیلہ پر تنقید نہ کرتا تو وہ کبھی اس طرف نہ آتی۔ جمیلہ نے ایک دن بتایا کہ جب سے وہ تھریڈنگ کے بعد واجد سے ملنے لگی ہے تو وہ محبوبانہ انداز میں اس کے چہرے کی صباحت اور گیسوئے

دراز کی تعریفیں کرتا رہتا ہے۔ بار بر ماسٹر رمزی نے جمیلہ سے کئی بار کہا۔

''آپ کے بال واقعی خوبصورت ہیں۔ اگر آپ کبھی بال ترشوانا چاہیں تو سیدھی ہمارے پاس آیئے گا، ہم بالکل مفت آپ کے بالوں کو تراش کر سیٹ کر دیں گے اور آپ کو دو سو روپے بھی دیں گے۔ ہم ضرورت مند عورتوں کو سو روپے سے زیادہ نہیں دیتے مگر آپ کے بال ایکسٹرا آرڈنری ہیں۔ ایکسٹرا آرڈنری سمجھتی ہیں؟ ہاں یاد آیا، آپ تو انگلش کی ٹیچر ہیں۔ ضرور سمجھتی ہوں گی۔''

جمیلہ نے مسکرا کر جواب دیا ''میں ایک ہی بات سمجھتی ہوں کہ میرے بال واجد کو بے حد پسند ہیں وہ اتنے لانبے بالوں کی وجہ سے مجھے ہزاروں کے مجمع میں پہچان جاتا ہے''۔

یہ کہتے کہتے اس نے شرما کر گردن جھکا لی۔ میں اس کے پیچھے دوسرے آئینے کے مقابل دوسری عورت کے بال سیٹ کر رہا تھا لیکن اس آئینے میں بھی جمیلہ نظر آ رہی تھی اس کی شرمیلی سوچ بتا رہی تھی کہ اس کا دلہا کنواری زلفوں کی خوشبو میں، گھنی زلفوں کی چھاؤں میں، لانبی زلفوں کی سیج پر اور کالی زلفوں کی رات میں کیسے صبح کرے گا۔

اس شرمیلی کو سوچنے دیجئے۔ جب وہ زندگی کے کسی نئے موڑ پر پہنچے گی تو میں آپکو وہاں بھی پہنچا دوں گا۔ اب آپ دوسرا آئینہ دیکھیں۔ اس آئینے کے روبرو میڈم فیروز ہر دوسرے تیسرے دن آ کر بیٹھتی ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق ان کی عمر چالیس برس ہو گی لیکن عورت کو عورت ہی پہچانتی ہے۔ سوئٹی نے مجھ سے شرط لگائی کہ میڈم پچاس برس سے نیچے کی نہیں ہیں کچھ اوپر ہی ہوں گی۔ چونکہ وہ دولت مند ہیں اچھا کھاتی ہیں اور پہنتی ہیں، کسی بھی فکر میں دبلی نہیں ہوتیں اور ڈائٹنگ کی وجہ سے موٹی نہیں ہوتیں اسی لیے ان کی صحیح عمر کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

اتنا تو میں سمجھ گیا تھا وہ اپنی دولت سے جوانی خریدنے کے لیے بیوٹی پارلر میں آتی تھیں۔ کبھی بالوں کی سفیدی کو چھپانے کے لیے بلیک یا براؤن کلر کی ڈائنگ کراتی تھیں کبھی خوبصورت بالوں کی وگ سیٹ کراتی تھیں۔ ایسے وقت انہیں اکثر جمیلہ یاد آ جاتی۔ ایک دن مجھ سے بولیں۔

''وہ لڑکی یاد ہے نا، وہ جو پرسوں آئینے کے سامنے تھریڈنگ کروا رہی تھی؟''

انہوں نے جمیلہ کا حلیہ بتایا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

''جی ہاں۔ اس باجی کا نام جمیلہ ہے۔ وہ ایک انگلش اسکول میں ٹیچر ہیں''۔

''وہ کچھ بھی ہو'' میڈم نے پہلے ناگواری سے کہا۔ پھر حسرت سے بولیں ''اس کے بال کتنے خوبصورت ہیں۔ ایسی قدرتی ملائمت اور چمک میں نے کسی کے بالوں میں نہیں دیکھی ہے''۔

یہ کہہ انہوں نے ایک انگلی کے اشارے سے مجھے اپنے قریب جھکنے کے لیے کہا۔ جب میں ذرا قریب جھک گیا تو وہ بڑی آہستگی سے بولی۔

''تمہارا باربر ماسٹر رمزی مجھے اصلی بالوں کی وگ پندرہ سو روپے میں دیتا ہے۔ اس سے کہو کہ اگر وہ میرے لیے جمیلہ کے بالوں کی وگ تیار کر دے تو میں دوگنی قیمت دوں گی۔ پورے تین ہزار روپے''۔

مجھے میڈم کی یہ خریدنے والی ذہنیت بہت بری لگی۔ یوں تو جمیلہ کے بال ہم بھی خریدنا چاہتے تھے مگر ہمارے خریدنے کے انداز میں تکبر نہیں تھا۔ ہم نے اس سے کہا تھا کہ اگر وہ کبھی اپنے بال کٹوانا چاہے تب ہم اسے دوسو روپے دیں گے لیکن میڈم ہمارے آگے تین ہزار کا چارہ ڈال کر ایک طرح للچا رہی تھی اور بھڑکا رہی تھی کہ ہم کسی طرح جمیلہ کو بال کٹوانے پر راضی کرلیں۔

سچ پوچھئے تو مجھے جمیلہ سے دلی لگاؤ تھا۔ آپ اسے عشق نہ سمجھیں۔ سچے عشق یا سستی محبت سے قطع نظر ہمارے دلوں میں کبھی کبھی کسی کے لیے اچھائی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ وہی جذبہ مجھ میں تھا۔ اس بے چاری جمیلہ کے پاس کیا تھا؟ وہ حسین نہیں تھی، دل نشین نہیں تھی۔ نہ جانے کتنے انتظار کے بعد اسے دل نشین بننے کیلئے ایک واجد کا دل ملا تھا۔ اب وہ واجد کی نظروں میں حسین بن کر رہنے کے لئے ہمارے ہاں آکر اپنے چہرے کو جھاڑتی پونچھتی رہتی تھی۔ اس طرح وہ بہت زیادہ خوبصورت تو نہیں بن جاتی تھی مگر آئینہ دیکھ کر مطمئن ہوجاتی تھی۔ میں آپ کو ایک پتے کی بات بتاتا ہوں کہ جس عورت کو ایک محبوب کا پیار مل جائے وہ آئینے کے سامنے اپنی آنکھیں کھودیتی ہے اور محبوب کی آنکھوں سے اپنا جلوہ دیکھتی ہے۔ پس آئینہ وہ ہوتی تھی، پیش آئینہ واجد ہوتا تھا اور چپکے چپکے اس کے دل میں کہتا تھا ''بس مجھے اتنا ہی حسن چاہیے جو صرف میری نگاہوں میں سما کر رہے۔ میں ایسی محدود دولت چاہتا ہوں جسے کوئی چرانے کی کوشش نہ کرے۔ جب مجھے بہت زیادہ حسن کی تمنا ہوگی تو میں تمہارے دل میں جھانک کر یہ گیان حاصل کرلوں گا کہ ایک خوبصورت چہرہ بڑھاپے میں مرجاتا ہے مگر ایک خوبصورت دل کبھی نہیں مرتا۔ لیلیٰ کالی تھی، تمہاری طرح معمولی صورت کی تھی، مگر اس کے دل کی خوبصورتی آج بھی تمام داستانوں میں دھڑکتی ہے''۔

اُردو ٹائپنگ سروس

اگر آپ اپنی کہانی، مضمون، مقالہ یا کالم وغیرہ کسی رسالے یا ویب سائٹ پر شائع کروانا چاہتے ہیں لیکن اُردو ٹائپنگ میں دشواری آپ کی راہ میں حائل ہے تو ہماری خدمات حاصل کیجئے۔

☆ ہاتھ سے لکھی ہوئی تحریر سکین کیجئے اور ہمیں بھیج دیجئے یا

☆ اپنی تحریر رومن اردو میں ٹائپ کر کے ہمیں بھیج دیجئے یا

☆ اپنا مواد اپنی آواز میں ریکارڈ کر کے ہمیں ارسال کردیجئے یا

☆ مواد زیادہ ہونے کی صورت میں بذریعہ ڈاک بھی بھیجا جاسکتا ہے

اردو میں ٹائپ شدہ مواد آپ کو ای میل کردیا جائے گا۔ آپ دنیا میں کہیں بھی ہوں، ہماری اس سروس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ادائیگی کے طریقہ کار اور مزید تفصیلات کے لئے رابطہ کریں۔

فون نمبر 0092-331-4262015, 0300-4054540

ای میل: harfcomposers@yahoo.com

میں میڈم کی بات کر رہا تھا جو بڑھاپے میں جوانی کا پیوند لگانے کے لیے جمیلہ کے بالوں کی وگ پہننا چاہتی تھی۔ یعنی جمیلہ کے پاس جو ایک حسن تھا اسے بھی چھین لینا چاہتی تھی۔ مشرقی طرز کے لانبے بالوں کو مغربی اسٹائل سے تراش دیا جاتا تو بیچاری مشرقی رہتی نہ مغربی۔ یہ انسان یوں تو دوسرے انسان کی جیب سے اس کا آخری پیسہ، اس کے منہ سے آخری نوالے اور اس کے ہونٹ سے مسکراہٹ چھینتا ہی ہے لیکن دوسرے سے چھیننے کے عمل میں دیوانگی ایسی ہے کہ وہ کسی معمولی سی صورت والی کے حسن کی آخری دلکشی بھی چھین لیتا ہے۔ کیا میڈم اس کے بالوں کو اپنے سر پر سجا کر از سر نو جوان بن سکتی تھی؟ نہیں مگر دوسروں سے کچھ چھین لینے کی ازلی خواہش کی تکمیل ہو جاتی تھی۔

ہیئر کٹنگ کے سیلون اور بیوٹی پارلر کے مردانہ حصے میں ایک خوبرو نوجوان کو دیکھئے۔ جب سوئی کو میرے تعاون کی ضرورت نہیں ہوتی تو میں مردانہ حصے میں چلا آتا ہوں۔ میں نے اس خوبرو جوان کو اکثر اپنے سیلون میں ایسے وقت دیکھا تھا جب میڈم فیروز وہاں پہنچتی تھی، وہ دونوں ویٹنگ روم میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کر اپنی اپنی باری کا انتظار کرتے تھے۔ انتظار کے دوران وہ نوجوان اپنے صوفے پر بیٹھا ہوا میڈم کی طرف دیکھتا رہتا تھا۔ میڈم تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کبھی کسی انگریزی رسالے کی ورق گردانی کرتی تھی، کبھی صوفے پر یہ پہلو سے وہ پہلو بدل کر اپنی خزاں رسیدہ عمر کو کہیں کہیں سے چھپانے کی کوشش کرتی تھی۔

میں اس نوجوان کو آئینہ خانہ میں بھی دیکھتا تھا اور ذاتی طور پر بھی جانتا تھا۔ اس کا نام پھکرو (فخرو) تھا۔ اکثر ناموں سے بھی ان نام والوں کے کردار اور ان کی زندگی کی کسی حد تک عکاسی ہو جاتی ہے۔ فخرو خود اپنے نام کو صحیح طور پر زبان تک نہیں لا سکتا تھا اور نہ ہی اپنی موجودہ زندگی پر فخر کر سکتا تھا۔ کیونکہ وہ ایک ہوٹل کا بیرا تھا۔ اسے تنخواہ کے علاوہ روزانہ اوسطاً پچیس روپے ٹپ کے طور پر مل جاتے تھے۔ یہ بات میڈم کو معلوم نہیں تھی۔ اس لیے کہ فخرو صرف خوش شکل ہی نہیں، خوش پوش بھی تھا۔ اس کے ظاہری حلیے کو دیکھ کر کوئی اسے ہوٹل کا بیرا نہیں کہہ سکتا تھا۔ یہ آمدنی کی بات نہیں ہے، نمائشی جذبوں کی باتیں ہیں۔ ہوٹل کا بیرا تو کیا، مہتر اور چمار بھی کھچڑی سماج کے نمائشی آئینے میں پہچانے نہیں جاتے۔

میں اس بات پر حیران تھا کہ میڈم پچاس سے اوپر تھیں اور فخرو پچیس سے نیچے تھا۔ میڈم کے دل میں ممتا ہونا چاہیے تھی اور فخرو کی آنکھوں میں کسی حسین کم سن دوشیزہ کے خواب کی چمک ہونا چاہیے تھی مگر وہ اندھی خواہشات کے بازار میں خرید و فروخت کے لیے نکلے تھے اس لیے بوڑھے رشتوں کا تقدس اور جوان خوابوں کا حسن فنا ہو چکا تھا۔

آئینے! تو ابھی بہت کچھ دکھائے گا۔ ذرا دم لے۔ مجھے دوسرے آئینوں میں بھی جھانکنے دے۔ اس آئینہ خانے میں ایک عزت مآب رئیس احمد فدوی بھی نظر آیا کرتے تھے۔ ایک شاندار امپالا میں ان کی چودہ برس کی صاحب زادی مہ جبیں برقعہ پہن کر آتی تھیں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ پردہ کرنے والیاں بیوٹی پارلر میں کیوں آتی ہیں؟ کیونکہ نمائش اور پردہ داری دو بالکل ہی متضاد عمل ہیں۔ وہ ہمارے ہاں سے بن سنور کر برقعہ کی چار دیواری میں کس طرح نمائشی جذبے کی تسکین کرتی ہیں؟ گھر کی چار دیواری میں جو تقریبات ہوتی ہیں ان میں صرف عورت کو عورت دیکھتی ہے۔ ٹھیک ہے کہ وہاں بھی مقابلہ حسن و سجاوٹ میں عورتیں ایک دوسرے سے برتر ہونے کی پوری کوشش کرتی ہیں لیکن فطرتاً مرد کبھی مرد کو اور عورت کبھی عورت کو اپنا آپ دکھا کر مطمئن نہیں ہوتی کیونکہ خالق کائنات نے عورت کو شعر کے حسن اور اس کی نزاکت میں ڈھال کر مرد کی زبان کو شاعری کا

تکلم عطا کیا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو عورتیں اشعار کی نوک پلک درست کرنے کے لیے بیوٹی پارلر کا رخ نہ کرتیں۔

مہ جبیں کو ابھی مکمل عورت نہیں کہا جا سکتا تھا کیونکہ وہ چودہ برس کی بچی تھی اور عورت کے خانے میں قدم رکھنے کے لیے آئینہ خانے میں آئی تھی، اس کے پاس ساٹھ برس کے بوڑھے رئیس احمد فدوی کی بے انتہا دولت تھی اور قدرت کا دیا ہوا بے مثال حسن تھا۔ بناؤ سنگھار کے بعد وہ فتنہ قیامت بن جاتی تھی۔ اس کے باوجود دل اور زیادہ حسین بننے کے لیے مچلتا ہے۔ اس لیے وہ بھی جمیلہ کے بالوں کو دیکھ کر ترستی تھی۔ رئیس احمد فدوی اپنی لاڈلی کی ہر ضد پوری کرتا تھا۔ وہ بار بر ماسٹر رمزی سے کئی بار کہہ چکا تھا کہ مہ جبین کے لیے جمیلہ کے بالوں کی وگ تیار کی جائے گی تو وہ اس کی بڑی سے بڑی قیمت ادا کرے گا۔

جمیلہ کسی کی دشمن نہیں تھی مگر اس کے بال اس کے دشمن تھے۔ وہاں آنے والی سب ہی حسین اور دولت مند عورتیں اس کے بالوں کو حسرت سے مگر کینہ پرور نگاہوں سے دیکھتی تھیں، چپکے چپکے کہتی تھیں ''جھگی کے فرش پر قالین، ٹاٹ میں مخمل کا پیوند اور سانولے چہرے پر ریشمی زلفیں نہیں سجتیں۔ مانا کہ پھول کسی بالوں میں نہیں کھلتے مگر انہیں شاخ سے توڑ کر بالوں میں سجایا جا سکتا ہے۔ پھر اس جمیلہ کے بال اس کے وجود سے ٹوٹ کر ہمارے حسن کی جلوہ سامانی میں اضافہ کیوں نہیں کر سکتے؟ ضرور کر سکتے ہیں'' چونکہ اپنے حسن میں اضافہ کرنے کی ضد ضرور تھی اس لیے ہر طرف سے بولیاں بڑھ رہی تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ دولت مند میڈم فیروزہ اور رئیس احمد فدوی تھے۔ میڈم نے بازار کا بھاؤ دیکھ کر چار ہزار کی بولی دی۔ رئیس احمد فدوی نے چھ ہزار تک چھلانگ لگائی۔ میڈم کو پتہ چلا تو وہ ایک قدم آگے بڑھ کر سات ہزار تک پہنچ گئی۔

چلئے بولیاں بڑھنے دیجئے۔ اس آئینہ خانے میں اب ہمیں بھی دیکھیے ''آخر ہم بھی تو ان آئینوں میں ہر پہلو سے نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں، ماسٹر رمزی انگلینڈ جانے سے پہلے رمضو نائی تھا اور ایک سڑک کے کنارے کسی فٹ پاتھ پر بیٹھ کر چونی والی حجامت بناتا تھا۔ یہ اس دور کی بات ہے جب مہنگائی لوگوں کی حجامت نہیں بناتی تھی۔ البتہ محبت اس وقت بھی مہنگی تھی۔ رمضو کو اٹھائیس برس کی عمر میں ایک رئیس زادی سے عشق ہو گیا تھا۔ کہاں ایک رئیس زادی اور کہاں ایک نائی، کہاں آسمان اور کہاں زمین۔ ایک خدا، ایک رسول کو ماننے اور مسلمان ہونے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ کسی کو بے مقصد فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھا دیا جائے۔ ایسا اس لیے نہیں ہوتا کہ سماجی حیثیت، تعلیم، تہذیب اور زندگی گزارنے کا معیار دیکھا جاتا ہے۔ کوئی بھی صاحب عقل اپنی لاڈ پیار سے پالی ہوئی بیٹی کو فٹ پاتھ پر بیٹھنے والے نائی کے پلے باندھنا گوارا نہیں کر سکتا۔ رمضو کے بوڑھے باپ نے اسے سمجھایا۔

''بیٹا! اپنی حیثیت کو دیکھو۔ سر اٹھا کر آسمان کو دیکھو گے تو گردن دکھنے لگے گی''۔

''نہیں بابا! اگر میں آسمان تک پہنچ جاؤں گا تو پھر گردن نہیں دکھے گی۔ میں یہ حجامت کا پیشہ چھوڑ دوں گا کوئی دوسرا دھندہ کر لوں گا۔ اپنی حیثیت بدل دوں گا''۔

''پیشہ بدلنے سے کیا حیثیت بدل جائے گی؟ جب تمہارے باپ دادا کا ذکر آئے گا تم نائی ہی کہلاؤ گے۔ کیا تم اپنے باپ دادا کو بھی بدل دو گے؟''

رمضو نے جواب نہیں دیا۔ وہ بچپن سے ضدی تھا۔ عشق میں ناکامی ہوئی تو اور ضدی بن گیا۔ اس کے باپ نے کہا۔

''یہ دنیا اپنی ابتدا سے ایسی ہی ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کے زمانے سے دیکھتے آرہے ہیں جب ایک انسان محنت، ہنر اور صلاحیت سے بالکل ہی خالی ہوتا ہے تو وہ اعلیٰ خاندان کا لیبل لگا کر دوسروں سے اونچا ہو جاتا ہے۔ خود ہماری برادری میں جو نائی سیلون میں حجامت بناتے ہیں وہ خود کو فٹ پاتھ پر بیٹھنے والے نائیوں سے افضل اور برتر سمجھتے ہیں۔ ایسا ہر مذہب، ہر فرقے اور ہر برادری میں ہوتا ہے۔ انسان کو برابر رہنے کی بجائے بڑا بننے کی ایسی لت پڑ گئی ہے کہ اس نے (نعوذ باللہ) خدا سے بھی برتر ہونے کی کوشش کر ڈالی۔ فرعون اور شداد اسی ذلیل کوشش میں اپنی بلندی سے قبر کی پستی میں چلے گئے۔

بیٹے! میں یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ جب تم اپنی حیثیت بدل کر اور بڑے بن کر جہاں رشتہ مانگنے جاؤ گے وہاں وہ تم سے کچھ اور اونچے بن جائیں گے۔ وہ صرف حجامت بنوانے کے دوران تمہارے سامنے سر جھکاتے ہیں لہذا اپنی تسلی کے لیے ان کی حجامت بناتے رہو اور ان کے سر جھکاتے رہو۔ جب یہاں انگریز کی حکومت تھی تو انگریز ہم سے برتر تھے ہمارے آقا تھے اور اس ملک کے تمام لوگوں کو حقارت سے کالا آدمی کہتے تھے۔ کسی کو ان کے برابر بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہمارے علاقے میں انگریز بہادر تھے ان کے پاس سواری کے لئے ایک بہت تیز رفتار کالی گھوڑی تھی۔ ایک بار انہیں ہمارے علاقے کی گوری پسند آ گئی۔ انہوں نے اسے اپنی ریزیڈنسی میں بلوالیا۔ دو دن اور دو راتوں تک گوری کا پتہ نہ چلا۔ تیسرے دن جنگل میں اس کی لاش ملی۔ اسے گولی ماردی گئی تھی۔ پتہ نہیں کیوں؟ وہ تو بے چاری حکم کی بندی تھی۔ آقا کے کسی حکم سے انکار نہیں کیا ہوگا۔ اس ظلم کے خلاف کسی نے آواز نہیں اٹھائی۔ کس کی مجال تھی کہ انگریز بہادر کے خلاف چوں بھی کرتا۔ جب وہ صاحب یہاں سے جانے لگے تو ریاست کے ایک راجکمار نے ان سے درخواست کی کہ ان کی کالی گھوڑی اسے نشانی کے طور پر دے دی جائے۔

''تو نوجس پر ہم سواری کرتا، اس پر کالا آدمی سواری نئی کرنے سکتا''۔

یہ کہہ کر انگریز بہادر نے کالی گھوڑی کو اسی وقت گولی ماردی۔ پھر اسے بھی جنگل میں پھینکوا دیا۔ یہ انسان کے برتر بننے کی داستان! تم مغرور انسانوں کی دنیا میں جس مقام پر ہو وہاں سے اونچا اڑنے کی کوشش نہ کرو''۔

باربر ماسٹر رمزی کے بوڑھے باپ نے اسے اپنے طور پر بہت سمجھایا لیکن وہ اونچا اڑنے کے لیے لندن چلا گیا۔ ہمارے سیلون اور بیوٹی پارلر میں جب رات کے آٹھ نو بجے سناٹا ہو جاتا ہے، اس وقت مے سٹر رمزی لندن اور انگریزوں کے بارے میں بہت کچھ بتاتا رہتا تھا۔ ایک رات جب سوئٹی موجود نہیں تھی تو میں نے اس سے پوچھا۔

''مے سٹر! یہ سوئٹی تمہارے ہاتھ کیسے لگ گئی؟''

اس نے ایک قہقہہ لگانے کے بعد جواب دیا ''سوئٹی جیسی لڑکیاں لندن کے گلی کوچوں میں مل جاتی ہیں۔ جس سیلون میں، میں کام کرتا تھا وہاں سوئٹی بھی کام کرنے آتی تھی۔ وہ خود ہی میری طرف مائل ہونے لگی تب مجھے اپنے باپ کی بہت سی باتیں یاد آئیں۔ میں نے سوچا یہ سوئٹی اسی انگریز کی بیٹی، پوتی یا نواسی ہوگی جس نے ہمارے گاؤں کی گوری کو اور کالی گھوڑی کو برتری کے غرور میں گولی ماردی تھی۔ تاریخ کے اس موڑ پر اب مجھے برتر ہونے کا موقع ملا تھا اس لیے میں انگریز بہادر کی نگری سے سوئٹی کو یہاں لے آیا''۔

یہ کہہ کر وہ فاتحانہ انداز میں مسکرانے لگا۔ اس کی مسکراہٹ بتا رہی تھی کہ سوئٹی کو اس نے محبت یا کسی مہربان جذبے کے تحت نہیں اپنایا تھا بلکہ بہت پرانا انتقام لیا تھا۔ پتہ نہیں کیوں انتقام لینے کیلئے اکثر عورت ہی نشانہ بنتی ہے، انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو تاریخ کے اس موڑ پر گوری مظلوم تھی اور تاریخ کے اس موڑ پر سوئٹی مظلوم بن گئی تھی۔

آیئے اب آئینہ خانے میں ذرا سوئٹی کو دیکھیے۔

مجھے سوئٹی سے اکثر تنہائی میں باتیں کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ بڑے بڑے گھرانوں کی عورتیں کبھی مجھے اور کبھی ماسٹر رمزی کو وگ لگانے اور پلکیں لگانے کے لیے اپنے گھر بلایا کرتی تھیں۔ جب ماسٹر رمزی ان خدمات کے لیے دکان سے باہر جاتا تو سوئٹی مجھے اکثر اپنے بارے میں بہت کچھ بتایا کرتی تھی۔ یہ تو بعد میں پتہ چلتا ہے کہ عورت بہت کچھ بتانے کے باوجود اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتی۔

ابتدا میں اس نے یہی کہا تھا کہ وہ ایک اعلیٰ خاندان کی لڑکی ہے۔ زلفوں کو تراشنے اور سنوارنے کا کام محض اس نے مشغلے کے طور پر سیکھا تھا۔ پھر حالات سے مجبور ہو کر ملازمت کر لی۔ اس وقت تک وہ معصوم اور اچھوتی دوشیزہ تھی۔ ماسٹر رمزی اس کی زندگی کا پہلا مرد تھا۔ یہ دعویٰ ہر عورت کرتی ہے لیکن سوئٹی جیسی بھاری بھرکم عورت یہ دعویٰ کرے تو مشکل ہی سے یقین آتا ہے۔ ویسے میں کسی عورت کا دل نہیں توڑتا۔ ایک احمق کی طرح سوئٹی کی ہر بات کو سچ سمجھ لیتا تھا اس لیے وہ مجھ سے بہت خوش تھی۔ مجھے اپنا دوست اور ہمدرد سمجھ کر میرے سامنے رمزی کی شکایت کرتی تھی کہ وہ اس سے لڑتا جھگڑتا رہتا ہے اور اسے چھوڑ دینے کی دھمکی دیتا ہے۔

ایسا کہتے وقت وہ مجھے یوں دیکھتی تھی جیسے رمزی سے چھوٹنے کے بعد سہارا تلاش کر رہی ہو لیکن میرے لیے اتنی بڑی میم کو پالنا ہاتھی پالنے کے برابر تھا اس لیے میں اسے دور ہی سے دیکھ کر خوش رہتا تھا۔ ایک صبح میں کام کے اوقات کے مطابق دکان پر آیا تو دکان بند تھی۔ اس کی چابیاں رمزی کے پاس رہتی تھی۔ وہی سوئٹی کے ساتھ صبح آ کر دکان کھولتا تھا۔ جب دیر ہو گئی تو میں خیریت معلوم کرنے کے لیے اس کی کوٹھی کی طرف چلا گیا۔ ادھر میں گیا ادھر ماسٹر رمزی نے آ کر دکان کھول لی۔ لیکن کوٹھی میں سوئٹی سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے اسے بڑی اجڑی ہوئی حالت میں دیکھا۔ وہ پلنگ کے پاس فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا شب خوابی کا لباس تار تار تھا اور ایسی بے لباسی تھی کہ بدن کا تار تار نظر آ رہا تھا۔ اس وقت پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ آئینے خانے میں ہر پہلو سے صحت منداور جوان نظر آنے والی اندر سے کتنی کھوکھلی اور خزاں رسیدہ ہے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ایک دم سے سمٹ کر خود کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے چیخ کر بولی۔

''یونان سنس! گٹ آؤ.....''

میں جلدی سے آؤٹ ہو گیا۔ دوسرے کمرے میں آ کر حیرانی سے سوچنے لگا کہ میں نے آئینہ خانے میں نظر آنے والی سوئٹی کو دیکھا تھا یا سوئٹی کی بوڑھی ماں کو؟ نہیں سچائی زہر سے بھی زیادہ زہریلی ہوتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ایسی فیشن زدہ جوان عورتیں اپنے بیڈ روم کی تنہائی میں خود اپنی اماں جان نظر آتی ہیں لیکن مجھے ایسی باتیں نہیں کرنا چاہیں۔ ایسی ہی عورتوں کے دم قدم سے ہمارے بیوٹی پارلر کا کام چلتا ہے۔ میں تھوڑی دیر تک سوئٹی کا انتظار کرتا رہا پھر سمجھ میں آ گیا کہ میں نے ایک عورت کے اندر جھانک کر اس کے غرور کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ وہ ابھی سامنے نہیں آئے گی۔ مجھے

بھی اس کا سامنا نہیں کرنا چاہیے لہذا میں دکان پر واپس چلا آیا۔ وہاں ماسٹر رمزی کا موڈ بگڑا ہوا تھا۔ اس وقت کوئی گاہک نہیں آیا تھا ورنہ وہ جبراً مسکراتا رہتا۔ اس نے ناگواری سے پوچھا ''آج تم اتنی دیر سے کیوں آئے ہو؟''

''ماسٹر! میں وقت پر آیا تھا پھر تم سے چابیاں لینے کے لیے تمہاری کوٹھی کی طرف جانا پڑا۔ ابھی وہیں سے آرہا ہوں''۔

اس نے چونک کر پوچھا ''کیا سوئٹی تمہارے سامنے آئی تھی؟''

''ہاں نن نہیں.....'' میں بوکھلا گیا کہ جواب کیا دوں؟ پھر میں نے سچ کہہ دیا ''وہ میرے سامنے نہیں آئی تھی، میں اس کے سامنے پہنچ گیا تھا''۔

اس نے غصے سے میرا گریبان پکڑ کر مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا ''تم بے وقوف کے بچے! تم بغیر دستک دیئے کوٹھی کے اندر کیوں گئے تھے۔ یہ آؤٹ آف ایٹی کیٹ ہے۔ ایٹی کیٹ کا مطلب جانتے ہو؟ نہیں تم حجام ہو، تم کیسے جانو گے''۔

میں نے کہا ''میرا گریبان چھوڑ دو، ورنہ سوئٹی کے لباس کی طرح تار تار ہو جائے گا''۔

وہ ایک دم سے ڈھیلا پڑ گیا۔ میرا گریبان چھوڑ کر پیچھے رکھی ہوئی ریوالونگ چیئر پر گر پڑا۔ پھر دیدے پھاڑ کر مجھے یوں دیکھنے لگا جیسے معلوم کرنا چاہتا ہو کہ میری ان آنکھوں نے کیا دیکھا ہے کہاں تک دیکھا ہے؟ میں نے کہا۔

''مجھے آج معلوم ہو گیا کہ تم لندن کے کباڑ خانے سے سوئٹی کو کتنی خوبصورتی کے ساتھ پیک کر کے لائے ہو۔ تم نے ایسا کیوں کیا؟ ہماری برادری میں نوجوان اور خوبصورت لڑکیوں کی کمی ہے؟''

''تم میرے ذاتی معاملات میں بولنے والے کون ہوتے ہو؟ جو میں نے بہتر سمجھا وہی کیا''۔

''اگر بہتر سمجھ کر کیا ہے تو پھر تم نے سوئٹی کو مارا کیوں؟ اس کے کپڑے کیوں پھاڑ ڈالے؟ نہیں، جو حماقت تم کر بیٹھے ہو، اسے اپنی ذات تک محدود رکھ کر دنیا والوں سے چھپا رہے ہو''۔

وہ ریوالونگ چیئر پر دوسری طرف گھوم گیا۔ میری طرف پشت کر لی۔ مجھ سے اپنا منہ چھپا لیا۔ اس کے بعد کہنے لگا ''کیا میں نے لندن جانے سے پہلے اپنے ہی ملک کی، اپنے ہی مذہب کی ایک لڑکی کا رشتہ نہیں مانگا تھا؟ مجھے وہاں سے رشتہ نہیں حقارت ملی''۔

''تم اپنی حیثیت سے زیادہ مانگ رہے تھے'' میں نے کہا۔

''دیکھو حیثیت کی بات نہ کرو۔ شریفوں کے ہاں جب کوئی لڑکی کا رشتہ مانگنے جاتا ہے تو انکار کی صورت میں کئی طرح کی باتیں بنائی جاتی ہیں مثلاً یہ کہ لڑکی ابھی پڑھ رہی ہے یا لڑکی کا رشتہ پہلے ہی سے کہیں طے ہو چکا ہے۔ اس طرح شریفانہ انداز میں باتیں بنا کر ٹالنا بہتر ہے یا رشتہ مانگنے والے کی حیثیت پر تنقید کرنا بہتر ہے؟ تمہیں کیا معلوم کہ انہوں نے مجھے دو ٹکے کا نائی کہہ کر ذلیل کیا تھا''۔

مجھے اس کا چہرہ نظر نہیں آرہا تھا۔ ہاتھ نظر آرہے تھے۔ وہ غصے سے مٹھیاں بھینچ رہا تھا ''ہاں میں نائی ہوں مگر انسان بھی تو ہوں۔ دوسرے انسانوں کی طرح میرا دل بھی تو آرزوؤں کا گھر ہے۔ اگر میں اونچی کوالٹی کی آرزو کرتا ہوں تو مجھے بتایا جائے کہ اس کوالٹی کو چھونے کے لیے کتنی آزمائشوں سے گزرنا ہوگا؟ فرہاد کی طرح تیشہ لے کر چٹانوں کے سینے سے دودھ کی نہر نکالنی ہوگی یا قارون کا خزانہ لانا ہوگا؟ یہ لوگ انسان ہو کر

انسانوں کو نہیں سمجھتے کہ وہ کیسا ضدی ہوتا ہے اسے آزمائش میں مبتلا کیا جائے تو وہ ذرے سے آفتاب بن جاتا ہے۔ میں نے بھی اپنی حیثیت بدل دی۔ اب کون ہے جو مجھے فٹ پاتھ کا نائی کہہ سکتا ہے۔ میرے پاس ایک شاندار کوٹھی ہے، کار ہے، انکم ٹیکس والے میری صحیح آمدنی تک نہیں پہنچ سکتے''۔ وہ ریوالونگ چیئر پر یک بیک گھوم کر میرے روبرو ہو گیا ''اگر حیثیت دولت سے بنتی ہے تو میں دولت مند ہوں۔ اگر شرافت سے بنتی ہے تو میں نے اپنی ذات سے آج تک کسی کا دل نہیں دکھایا۔ کوئی غیر شریفانہ حرکت نہیں کی اور اگر حیثیت مذہب سے بنتی ہے تو الحمدللہ میں مسلمان ہوں اور آخری نبی ﷺ کی امت سے ہوں۔ اس کے باوجود اپنے اعلیٰ خاندان پر فخر کرنے والے مجھے یا تو مسلمان نہیں سمجھتے یا انسان نہیں سمجھتے صرف نائی کہتے ہیں''۔

''تمہاری ان تھک کوششوں کو دیکھنے کے بعد اب میں کہہ سکتا ہوں کہ انسان اپنی جدوجہد سے اپنی حیثیت بدل سکتا ہے۔ دیکھو باٹا کمپنی کے ارب پتی مالک کو کوئی موچی نہیں کہتا۔ اس لیے کہ دنیا کے ایک بڑے حصے میں اس کے نام کا ڈنکا بجتا ہے۔ ہمارے ملک میں جو دولت مند آٹو میٹک ڈرائی کلیننگ کی بڑی بڑی دکانیں چلاتے ہیں کوئی انہیں دھوبی نہیں کہتا۔ اونچی سوسائٹی میں انہیں گلے لگایا جاتا ہے۔ اس طرح تمہیں بھی کوئی نائی نہیں کہے گا۔ ایک بار قسمت آزماؤ تم شریف آدمی ہو، کسی شریف گھرانے کی لڑکی کا رشتہ مانگو۔ لیکن نہیں، میں تمہیں غلط مشورہ دے رہا ہوں کیونکہ تم ایک گوری میم کو بیاہ کر لے آئے ہو''۔

وہ اچانک ہی قہقہے لگانے لگا ''شادی.....اور سوئٹی سے ہاہاہاہا''۔

''آخر اس میں قہقہے لگانے کی کیا بات ہے؟'' میں ٹٹولتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

جب قہقہوں کا طوفان گزر گیا تو اس نے کہا ''میں نے تم سے اور اپنی برادری کے دوسرے لوگوں سے جھوٹ کہا تھا کہ میں سوئٹی کو لندن سے بیاہ کر لایا ہوں''۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم نے اسے داشتہ بنا کر رکھا ہے؟''

''نہیں، مجھے غلط نہ سمجھو۔ خدا گواہ ہے کہ میں گناہ گار نہیں ہوں۔ میں نے آج تک کبھی ایک رات بھی سوئٹی کے ساتھ نہیں گزاری۔ ہم دونوں کے بیڈ روم الگ ہیں۔ میں اسے یہاں کیوں لایا یہ بھی سن لو۔ سوئٹی ایک غریب والدین کی بیٹی ہے۔ سلطنت برطانیہ میں جہاں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا، اب وہاں غریبی، بھوک، افلاس اور گناہ کی تاریکی چھائی رہتی ہے۔ سوئٹی نے شریفانہ زندگی گزارنے کے لیے ہیئر ڈریسنگ کا کام سیکھا تھا لیکن تکلیف دہ رشتوں کی وہی پرانی کہانی ہے یعنی ماں اندھی، باپ بیمار اور لاغر اور بھائی آوارہ اور بدمعاش لہٰذا سارا بوجھ اور ساری ذمے داریاں ایک لڑکی کے کاندھے پر آجاتی ہیں۔ سوئٹی کو کال گرل بننا پڑا۔ وہ میرے ساتھ جس سیلون میں کام کرتی تھی وہاں آنے والے کسی گاہک سے معاملہ طے ہو جاتا تو وہ ڈیوٹی کے بعد اس کے ساتھ چلی جاتی''۔

''تمہارے ساتھ کبھی نہیں گئی؟''

''نہیں۔ میں اپنی پارسائی جتاؤں گا تو تم یقین نہیں کرو گے۔ میں اپنے دل کا حال جانتا ہوں۔ میرے دل و دماغ پر بیس برس کی عمر سے صرف ایک ہی حسینہ نقش ہو کر رہ گئی ہے۔ تم سمجھے؟ نہیں سمجھے۔ میں بتاتا ہوں۔ وہی حسینہ جس کا نام ثمینہ ہے اور جس سے میں نے اس وقت محبت کی

جب فٹ پاتھ پر بیٹھ کر دو ٹکے کا نائی کہلاتا تھا۔ میں ثمینہ کا ذکر بعد میں کروں گا پہلے سوئٹی کی بات پوری ہونے دو۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ وہ کال گرل بن گئی اس نے کئی بار میرے ساتھ بھی دوست کی حد سے آگے بڑھنا چاہا لیکن میں نے صاف طور پر کہہ دیا۔

''سوئٹی میں تمہارے لندن میں دولت کمانے آیا ہوں۔ میں ضرورت کے مطابق کھاتا ہوں اور ضرورت کے مطابق پہنتا ہوں۔ کوئی تیسرا شوق نہیں کرتا۔ ایک ایک پینی بچاتا ہوں۔ اگر میں اپنی موجودہ حیثیت سے بہت بلند ہو کر اپنے ملک میں نہیں جاؤں گا تو اپنی ثمینہ کو کبھی نہ پا سکوں گا''۔

پہلے پہل سوئٹی کو اپنی توہین کا احساس ہوا کیونکہ وہ میرے روبرو تھی اور میں اسے نظر انداز کر رہا تھا۔ ثمینہ خوابوں سے زیادہ دور تھی پھر بھی میں اسے ترجیح دے رہا تھا۔ اس بات پر وہ مجھ سے کئی ماہ تک ناراض رہی، مجھ سے بات تک کرنا گوارا نہیں کی۔ مجھے کب اس کی پروا تھی۔ میں تو اپنا بینک بیلنس بڑھا رہا تھا اور اسے آئے دن گناہوں کی دلدل میں دھنستے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

رفتہ رفتہ وہ کال گرل، ماڈل گرل اور بزنس گرل کی حیثیت سے اتنی عام ہوگئی کہ ہوٹل اور کلبوں کے بیرے اور ٹیکسی ڈرائیور معقول کمیشن پر اسے بزنس پہنچانے لگے۔ تقریباً سات برس تک میں یہ تماشہ دیکھتا رہا۔ اس دوران نے میں نے خزاں کو بہت آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھتے دیکھا جیسے جیسے جوانی کی چمک ماند پڑتی جاتی تھی ویسے ہی ویسے اس کے میک اپ کے سامان میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ پہلے وہ ہلکا سا سوسائٹی میک اپ کرتی تھی پھر وقت سے پہلے آنے والے بڑھاپے کو چھپانے کے لیے گہرا چیختا ہوا میک اپ کرنے لگی۔

جوانی اور بڑھاپے کے درمیان سفر کرنے والے اس سچائی کو نہیں سمجھتے کہ عمر کبھی اوپر سے حملہ نہیں کرتی، اندر سے کھوکھلا کرتی ہے۔ جب بڑھاپے کی گرد اندر سے اڑنے لگی تو سوئٹی کو کھانسی آگئی پھر کھانسی کے ساتھ بخار بھی آنے لگا۔ اب وہ پھر میری دوست بن گئی تھی کیونکہ دکھ بیماری میں اسے مجھ جیسے ہمدرد کی ضرورت تھی۔ دن بدن گاہک ٹوٹ رہے تھے، آمدنی گرتی جا رہی تھی، میک اپ اور دواؤں کے اخراجات بڑھتے جا رہے تھے۔ میں نے اس سے سیدھی اور کھری بات کہہ دی۔

''دیکھو سوئٹی! میں ثمینہ کا عاشق بن کر آیا تھا۔ اب بزنس مین بن گیا ہوں۔ میں تمہیں دوبارہ جوان اور صحت مند بنانے کے لیے اپنی محنت کی کمائی کا ایک پونڈ بھی خرچ نہیں کروں گا۔ ہاں اگر گناہوں کے راستے سے واپس آجاؤ تو میں دوسری طرح تمہاری مدد کر سکتا ہوں یعنی تمہیں بہترین وگ بنانے کا فن سکھاؤں گا، اس سے تمہاری آمدنی بڑھ جائے گی''۔

وہ مجھ سے یہ فن سیکھنے لگی۔ میری لاعلمی میں گناہ کے راستے پر چلتی رہی۔ اس عرصے میں اس کے ماں باپ مر چکے تھے بھائی جیل چلا گیا تھا اس کے باوجود اس کے اخراجات بڑھ گئے تھے۔ مزید ایک سال بعد وہ وی ڈی ٹریٹمنٹ کے لیے اسپتال پہنچا دی گئی۔ وی ڈی ٹریٹمنٹ سمجھتے ہو؟ تم تو کبھی لندن نہیں گئے تم کیسے سمجھو گے میں سمجھاتا ہوں''۔

وہ مجھے سمجھانے لگا کہ لندن میں جو بازاری عورتیں بیماریوں کا گھر بن جاتی ہیں، انہیں ممنوعہ قرار دے کر ان کا باقاعدہ علاج کیا جاتا ہے۔ جب سوئٹی اسپتال سے باہر آئی تو اس کے پرس میں ایک سرخ کارڈ تھا۔ وہ کارڈ ظاہر کرتا تھا کہ سوئٹی زیر علاج ہے لہٰذا مرد اس سے دور رہیں۔ ایسی عورتوں کو اسپتال سے ملنے والے سبز، سرخ، نیلے یا کسی رنگ کے بھی کارڈ اپنے پرس میں رکھنے پڑتے ہیں تاکہ ان کے قریب آنے والے پرس کھول

کر دیکھیں اور خطرے سے آگاہ ہو جائیں۔ جس عورت کے پرس میں ایسا کارڈ نہ ہوا سے جیل بھی جانا پڑتا ہے اور بھاری جرمانہ بھی ادا کرنا پڑتا ہے۔

سوئٹی وہ سرخ کارڈ لے کر میرے پاس آئی اور جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ وہ کارڈ کیا تھا، ایک عورت کا اعمالنامہ تھا۔ حالانکہ اس کارڈ پر صرف چند الفاظ درج تھے لیکن ان کی سرخی بتا رہی تھی کہ وہ آٹھ برس تک کس طرح اپنے لہو کا قطرہ قطرہ ہوس کے درندوں کو پلاتی رہی ہے۔ وہ کارڈ خطرے کا سرخ سگنل تھا۔ وہ کارڈ بے حیائی کے حمام کا تولیہ تھا جسے طبی دھلائی کے دوران سوئٹی کے ہاتھ میں پکڑا دیا گیا تھا۔ وہ ایک آئینہ تھا۔ آنے والے اس میں اپنا مکروہ چہرہ دیکھ کر واپس چلے جاتے تھے۔ ذرا بالغ نظری سے دیکھا جائے تو وہ صرف سوئٹی کا نہیں بلکہ پورے گھناؤنے معاشرے کا شناختی کارڈ تھا۔

وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ اس کی آمدنی کے ذرائع ختم ہو گئے تھے۔ اب ایک ذریعہ تھا کہ سیلون میں محنت کرے اور حلال کی کمائی کھائے۔ وہ کام چور نہیں تھی، محنت کرتی تھی لیکن اخراجات بہت بڑھ گئے تھے کیونکہ وہ بیمار ہونے اور بے کار ہونے کے باوجود اپنے چہرے کو میک اپ کے لوازمات سے اور بھدے جسم کو رسٹ بیلٹ، فوم کے بریزر اور دوسری پیڈنگ کے ذریعے خوبصورت اور پرکشش بنا کر رکھتی تھی۔ عمر کتنی ہی ہو، حالات کیسے ہی ہوں، اکثر عورتیں اپنا آپ دکھائے بغیر اور دیکھنے والوں کی خاموش نگاہوں سے داد وصول کیے بغیر زندہ نہیں رہتیں۔

اس کے ظاہری حسن و شباب سے متاثر ہو کر لوگ اس کے پاس آتے تھے پھر سرخ کارڈ دیکھ کر واپس چلے جاتے تھے۔ وہ آنے والوں کو دھوکہ اس لیے نہیں دے سکتی تھی کہ دوسری لڑکیوں کی طرح اس کے پرس میں صحت یابی کا سرٹیفکیٹ نہیں تھا۔ وہ سرخ کارڈ اس کے دماغ کا پھوڑا بن گیا تھا۔ ایک عورت کو چیلنج کر رہا تھا کہ اب وہ کچھ بھی نہیں رہی اور ایسا توہین آمیز چیلنج کوئی عورت برداشت نہیں کرتی۔ وہ جھنجھلا کر کہنے لگی اب مر جائے گی۔ میں نے پھر اسے سمجھایا۔

''سوئٹی! تم سمجھتی ہو کہ تمہیں کوئی خریدنے آئے تب ہی تمہاری قیمت اور اہمیت واضح ہوگی۔ یہ غلط ہے۔ اپنی قیمت لگانا چھوڑ دو۔ جب کوئی خریدنے آئے اور تم بکنے سے انکار کر دو تو اس کے بعد ہی تمہیں اپنی اہمیت کا اندازہ ہوگا کہ لوگ کس طرح دیوانہ وار تمہاری آرزو کرتے ہیں اور حسرت سے تمہیں دیکھتے رہ جائیں گے کہ تم بکنے والی عورت نہیں ہو''۔

میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے وعدہ کیا کہ اب وہ بکنے کا خیال دل میں نہیں لائے گی۔ میں نے کہا۔

''اب میں پاکستان جانے والا ہوں۔ اگر تم گناہوں سے توبہ کر لو تو میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ وہاں کسی کو یہ معلوم نہ ہوگا کہ تم کال گرل بن کر زندگی گزار چکی ہو۔ وہاں تمہیں عزت ملے گی۔ میں تمہاری رہائش کا بندوبست کروں گا اور تم میرے سیلون میں جتنا کام کرو گی، اس کا معقول معاوضہ دوں گا''۔

وہ دو دن تک سوچتی رہی، کبھی کبھی پرس کھول کر سرخ کارڈ کو دیکھتی رہی۔ آخر اس نے فیصلہ سنا دیا کہ میرے ساتھ پاکستان جائے گی۔ اس وقت تک میرے دل میں یہی بات تھی کہ میں سوئٹی کو گمراہی سے بچا رہا ہوں۔ جو عزت وہ اپنے وطن میں کھو چکی تھی اسے میں اپنے وطن میں بحال کرنے جا رہا ہوں اور اس کے لیے ایک معقول روزی کا ذریعہ پیدا کر رہا ہوں لیکن اپنے وطن کی زمین پر پہنچتے ہی ان نیک مقاصد میں میری ذرا سی خود غرضی شامل ہو گئی یعنی وہی دوسروں سے برتر ہونے والا جذبہ میرے دل میں مچلنے لگا۔

میری برادری والے جانتے تھے کہ ثمینہ کا رشتہ نہ ملنے کے باعث میں ضد میں آ کر اپنی حیثیت بلند کرنے گیا ہوں۔ اب لوگ پوچھتے کہ اپنی حیثیت سے اونچے مقام پر میں نے کیا پایا ہے؟ ان کی تسلی کے لیے اور اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے میں نے کہہ دیا ''سوئٹی جیسی خوبصورت میم بیاہ کر لایا ہوں۔ ثمینہ جیسی اب ہزاروں لڑکیاں مجھے مل سکتی ہیں مگر بھائیو! میں نے سوچا اس قوم کی لڑکی بیاہ کر لاؤں جو ہم پر سو سال تک حکومت کر چکی ہے۔ اب میں اس میم پر حکومت کرتا رہوں گا''۔

جھوٹی شان اور اپنا بڑا پن کون نہیں دکھاتا؟ سب ہی اس لعنت میں مبتلا ہیں۔ میں نے ایسی برتری دکھائی ہے جس سے سوئٹی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا ہے اور نہ ہی اس کے قومی غرور کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ اگر پہنچتی تو وہ سرخ کارڈ کے مرحلے تک نہ پہنچتی۔ میں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ ہم ایک کوٹھی میں رہیں گے لیکن ہمارے بیڈ روم الگ ہوں گے''۔

بار بر ماسٹر رمزی یہ کہہ کر ذرا چپ ہوا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔

''تم سمجھ رہے تھے کہ میں اتنی خوبصورت میم کے ساتھ راتیں گزارتا ہوں، نہیں۔ اب تمہیں یقین آ جانا چاہیے اگر شیطان بہکائے تب بھی بہک کر اس کے پاس نہیں جا سکتا کیونکہ وہ ایک کارڈ یافتہ عورت ہے''۔

میں نے پوچھا ''پھر تم نے اسے اس قدر کیوں مارا کہ کپڑے تک پھاڑ ڈالے؟''

بار بر ماسٹر رمزی نے ایک گہری سانس لی۔ پھر دکھے ہوئے دل سے بولا ''سوئٹی نے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ کل رات مجھے اس بات کا پتہ چل گیا کہ وہ میرے ساتھ کیوں آئی ہے۔ اس لیے کہ یہاں کسی کال گرل کے پاس شناختی کارڈ نہیں ہوتا، کسی کی اندرونی بیماری کا اشتہار اس کے پرس میں نہیں ہوتا اس لیے وہ بھی یہاں آ کر کارڈ کے بوجھ سے آزاد ہو گئی ہے۔ اس نے لندن چھوڑنے سے پہلے ہی اپنے اس لعنتی کارڈ کے پرزے پرزے کر دیئے تھے اور وہ جو خود وہاں اندر سے پرزے پرزے ہو گئی تھی یہاں آ کر فارن پارٹس کی طرح اسمبل ہو گئی ہے''۔

وہ غصے میں مٹھیاں بھینچ کر بولا ''میں یہ فریب برداشت نہیں کر سکتا۔ کل وہ تمام رات کوٹھی سے غائب رہی۔ صبح واپس آئی تو میں نے اس کی خوب پٹائی کی۔ تب اس نے مجھے بتایا کہ وہ یہاں دکان میں آنے والے گاہکوں کو پھانستی ہے۔ اب سوسائٹی کے ایک بیوٹی پارلر کے مالک نے اسے پھانس لیا ہے، اسے اپنے ہاں کام کرنے کا بہت بڑا آفر دیا ہے لہٰذا وہ مجھے چھوڑ کر جا رہی ہے''۔

بار بر ماسٹر رمزی کے چہرے پر غصہ کم اور دکھ کی پرچھائیاں زیادہ تھیں۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ ایک گمراہ عورت کو راہ راست پر لا رہا تھا مگر وہ پھر گمراہی کی طرف جا رہی تھی اس کا صدمہ اسے ہونا چاہیے تھا۔ دراصل ہماری اجتماعی زندگی گزارنے کے طور طریقے ہی غلط ہیں۔ ہم غلط ہیں کہ آرائشی حسن کے لیے بیوٹی پارلر سجا کر بیٹھتے ہیں، تم غلط ہو کہ تم عورت کو اسی وقت پوجتے ہو جب وہ اپنے حسن و شباب کی ایک ایک نوک پلک درست کر کے بیوٹی پارلر سے باہر آتی ہے۔ جب تک حسن پرستی رہے گی عورت خود نمائی کے طوفان میں اڑتی، بھٹکتی اور گناہوں کی دلدل میں دھنستی رہے گی۔

سوئٹی ماسٹر رمزی کو چھوڑ کر جا رہی تھی۔ وہ اپنی مرضی کی مالک تھی، اسے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ میں نے اسے نظر انداز کر کے ثمینہ کے متعلق پوچھنا چاہا کیونکہ رمزی نے اس کی بات ادھوری چھوڑ دی تھی لیکن ثمینہ کے بارے میں کچھ پوچھنے سے پہلے ہی بیوٹی پارلر کا دروازہ کھلا اور جمیلہ

اندر آ گئی۔ ہم دونوں اپنی جگہ سے اٹھ گئے، میں نے آگے بڑھ کر کہا۔

''آیئے باجی! آپ پورے تین ماہ کے بعد آئی ہیں''۔

وہ رومال سے اپنے چہرے کا پسینہ پونچھتی ہوئی آئینے کے سامنے ایک ریوالونگ چیئر پر بیٹھ گئی۔ تب آئینہ مجھے بتانے لگا کہ وہ بہت زیادہ پریشان ہے۔ میں نے تھریڈنگ کے دوران پوچھا ''باجی! کیا بات ہے آپ پریشان نظر آ رہی ہیں؟''

''آں، ہاں'' وہ تھکی ہوئی آواز میں بولی ''میں بہت پریشان ہوں۔ میرے دن رات کا سکون برباد ہو گیا ہے۔ یہ لوگ میرے بالوں کے پیچھے پڑ گئے ہیں''۔

پہلے تو میڈم فیروزہ میری سہیلی بن گئیں۔ حالانکہ وہ عمر کے لحاظ سے میری ماں بن سکتی ہیں لیکن میں انہیں بوڑھی کہہ کر دکھ نہیں پہنچانا چاہتی تھی۔ انہوں نے سہیلی بننے کے بعد مجھے اپنے گھر آنے اور رات کا کھانا اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دی۔ پہلے میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مجھ پر اتنی مہربان کیوں میں ہیں۔ میں میڈم کی کوٹھی پر پہنچی تو ڈائننگ ٹیبل پر پر تکلف کھانے چنے ہوئے تھے۔ مجھ جیسی تنہا لڑکی کے لیے یہ اہتمام کیا گیا تھا۔ کھانے کے دوران انہوں نے پوچھا ''تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتاؤ؟''

میں نے کہا ''آپ نے کھانے کا ایسا انتظام کیا ہے کہ کسی چیز کی ضرورت ہو ہی نہیں سکتی''۔

''میں کھانے کی نہیں، تمہاری دوسری ضرورتوں کی بات کر رہی ہوں۔ مثلاً تمہیں دو، چار، دس ہزار روپے کی ضرورت ہو تو مجھ سے ابھی لے سکتی ہو''۔

میڈم کی بات سن کر میرا ہاتھ کا لقمہ ہاتھ ہی میں رہ گیا۔ میں دو ماہ سے پورے تین ہزار کے لیے بھاگ دوڑ میں لگی ہوئی تھی کیونکہ واجد ٹیکنیکل کالج سے ڈپلومہ حاصل کر چکے ہیں۔ سعودی عرب میں انہیں پانچ ہزار روپے کی ملازمت مل رہی ہے لیکن جو پارٹی انہیں سعودی عرب لے جا رہی ہے جو چھ ہزار روپے کا مطالبہ کر رہی ہے۔ میرے پاس بینک میں دو ہزار روپے ہیں۔ ایک ہزار میں نے اسکول کی ہیڈ مسٹریس سے قرض لیے ہیں۔ باقی تین ہزار کا بندوبست نہ ہو سکا، میڈم نے فراخ دلی دکھائی تو میں نے کہا۔

''آپ واقعی سہیلی بننے کا حق ادا کر رہی ہیں۔ مجھے تین ہزار روپے کی سخت ضرورت ہے، میں دو ماہ کے اندر یہ رقم واپس کر دوں گی''۔

میڈم نے کہا ''واپس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم تین ہزار کیا چار ہزار لے جاؤ مگر جمیلہ پلیز اپنے یہ بال تھوڑے سے کاٹ کر دے دو''۔

میں ایک دم سے پریشان ہو کر اس کا منہ تکنے لگی وہ میرے شانے پر بڑی محبت سے ہاتھ رکھ کر بولیں ''ہم آپس میں سہیلیاں ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کے کام آنا چاہیے۔ تمہیں روپے کی ضرورت ہے اور مجھے ان ریشمی زلفوں کی، ہم اسی طرح ایک دوسرے کی ضرورت پوری کر سکتی ہیں''۔

''مگر میں یہ بال نہیں کاٹ سکتی۔ یہ واجد کو بے حد پسند ہیں''۔

''کیا وہ پسند کرنے والا تمہاری تین ہزار روپے کی ضرورت پوری کر سکتا ہے؟''

''میں اپنے واجد کے لیے ہی روپے مانگ رہی ہوں۔ اس رقم سے ان کا مستقبل بن جائے گا''۔

''اچھا تو یوں کہو'' میڈم نے مسکرا کر کہا۔

''تم اپنے محبوب کے لیے دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلا رہی ہو۔ دیکھو جمیلہ! جب عورت کسی سے محبت کرتی ہے تو اس پر اپنا سب کچھ قربان کر دیتی ہے۔ کیا تم اپنے واجد کا مستقبل سنوارنے کے لیے اپنے بالوں کی قربانی نہیں دے سکتیں؟''

''میں تو اپنی جان بھی دے سکتی ہوں لیکن واجد مجھے کبھی بال کاٹنے کی اجازت نہیں دیں گے''۔

''صاف کیوں نہیں کہتیں کہ تمہارے پاس ایک یہی بالوں کی خوبصورتی ہے۔ یہ خوبصورتی تمہارے سر سے جھڑ جائے گی تو اپنے محبوب کو دکھانے کے لیے تمہارے پاس کچھ نہیں رہے گا''۔

میڈم نے یہ سب کچھ غصے میں کہا تھا مگر سچ کہا تھا۔ میں خوبصورت نہیں ہوں۔ یہ تو میں بچپن سے جانتی ہوں اور بچپن سے یہ بھی جانتی ہوں کہ میرے بال بہت خوبصورت ہیں۔ اتنے خوبصورت کہ حسین ترین عورتیں بھی یہ زلفیں دیکھ کر احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ جب سے واجد کی نگاہوں نے مجھے پسند کیا ہے تب سے کئی بار میں نے چشم تصور میں اپنے بال کاٹ کر خود کو دیکھا تو پتہ چلا کہ اس طرح واجد کو دکھانے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں رہے گا۔ اس لیے میں اپنے بال کبھی نہیں کٹواؤں گی۔ آخر میں بھی ایک عورت ہوں۔ میرے پاس بہت نہ سہی، بال برابر تو خوبصورتی ہو جسے میں اپنے مرد کے سامنے پیش کر سکوں مگر یہ دنیا والے پیار کی خوبصورتی کو نہیں سمجھتے۔ محبت کا سر مونڈنے بیٹھ جاتے ہیں''۔

جمیلہ کی باتیں سن کر میں نے کہا ''ہاں باجی! ہماری اس دنیا میں سب ہی حجام ہیں۔ اپنے مفاد کی خاطر ایک دوسرے کی حجامت بناتے رہتے ہیں۔ اچھا تو پھر آپ نے میڈم کو کیا جواب دیا''۔

میں نے انکار کر دیا۔ وہاں سے اٹھ کر آنے لگی تو میڈم فیروزہ نے غصے سے کہا ''تم اپنے بالوں پر نہ اتراؤ، کسی دن کوئی زبردستی کاٹ کر لے جائے گا تو بھتنی نظر آؤ گی۔ اس وقت میں میڈم کی باتوں کا مطلب نہ سمجھ سکی مگر ایک دن جب میں اسکول سے بچوں کو پڑھا کر واپس آ رہی تھی تو دو بدمعاش میرا پیچھا کرنے لگے۔ میں نے ایک کے ہاتھ میں بڑی سی قینچی دیکھی وہ بار بار اس قینچی چلا رہا تھا جیسے خیال ہی خیال میں میرے بال کاٹ رہا ہو''۔

''اوہ باجی!'' میں نے حیرانی سے کہا ''کہیں ایسا تو نہیں کہ میڈم نے ان بدمعاشوں کو آپ کے پیچھے لگایا ہو؟''

''میں بھی یہی سمجھنے پر مجبور ہوں لیکن میں میڈم کے منہ پر کچھ نہیں کہہ سکتی۔ وہ صاف مکر جائیں گی۔ بہرحال میں نادان بچی نہیں ہوں کہ ان بدمعاشوں سے سہم کر اپنے بال کٹوا دیتی۔ میں نے چلتے چلتے راستہ بدل دیا۔ گھر جانے کی بجائے اس راستے پر چل پڑی جہاں آگے ایک پولیس اسٹیشن تھا۔ ان بدمعاشوں کے قدم سست پڑ گئے۔ جب میں نے پولیس اسٹیشن کے احاطے میں قدم رکھتے ہوئے ان کی طرف دیکھا تو وہ تیزی سے پلٹ کر بھاگتے چلے جا رہے تھے''۔

''یہ آپ نے بڑی عقلمندی کا کام کیا باجی! لڑکیوں کو اس طرح سمجھدار ہونا چاہیے''۔

جمیلہ نے کہا ''اس دن کے بعد وہ بدمعاش دوبارہ نظر نہیں آئے لیکن اس واقعے سے مجھے بڑا دکھ پہنچا ہے۔ میں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا پھر لوگ میری ذرا سی خوبصورتی کو کاٹ کر پھینکنا چاہتے ہیں۔ کسی کی ناک کاٹ کر، کسی کے منہ پر تیزاب پھینک کر اور کسی کے سر سے بال نوچ کر کیوں بدصورت بنایا جاتا ہے؟ اور دوسروں کو بدصورت بنا کر یہ انسان کیسی غیر انسانی مسرتیں حاصل کرتا ہے۔ ابھی صبح کے وقت میں یہاں آ رہی تھی کہ رئیس احمد فدوی نے میرے قریب اپنی کار روک دی۔ کار کی اگلی سیٹ پر ان کے ساتھ مہ جبیں برقعہ پہنے نقاب الٹائے بیٹھی تھی۔ وہ کھڑکی سے سر نکال کر بولی۔

''جمیلہ باجی! آپ کہاں جا رہی ہیں؟ کار میں آ جایئے ہم آپ کو پہنچا دیں گے''۔

اب بڑے آدمیوں کی مہربانیاں سمجھ میں آ جاتی ہیں۔ میں سمجھ گئی کہ یہ چودہ برس کی چھوکری بھی میرے بالوں کے پیچھے پڑ جائے گی۔ میں نے کار میں بیٹھنے سے انکار کیا تو رئیس احمد فدوی بھی التجا کرنے لگے کہ میں مہ جبیں کی بات مان لوں۔ مہ جبیں نے گاڑی سے اتر کر خوشامدانہ انداز میں میرا ہاتھ تھام لیا۔ مجھے مجبوراً بیٹھنا پڑا۔ وہ بھی کار کی پچھلی سیٹ پر میرے پاس آ کر بیٹھ گئی اور بیٹھتے ہی بولی۔

''اللہ باجی! آپ کے بال کتنے خوبصورت ہیں۔ انہیں دیکھ کر میں ریشم کو بھول جاتی ہوں''۔

''لیکن میں اپنے بال نہیں کٹواؤں گی''۔

میری صاف گوئی پر پہلے تو وہ دونوں چونک گئے۔ پھر رئیس احمد فدوی نے جلدی سے کہا ''دیٹس آل رائٹ۔ ہم کسی اسنیک بار میں اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے''۔

''مگر میں نے تو بات ختم کر دی ہے''۔

''ٹھیک ہے ہم دوسری بات کریں گے۔ کل میڈم سے مہ جبیں کی ملاقات ہوئی تھی۔ میڈم نے بتایا ہے کہ تمہارا منگیتر سعودی عرب جانا چاہتا ہے شاید تمہیں اور تمہارے منگیتر کو اخبار پڑھنے سے دلچسپی نہیں ہے ورنہ تمہیں اخبار کے ذریعے پتہ چل جاتا کہ کچھ فراڈ پارٹیاں لوگوں سے بڑی

بڑی رقمیں لے کر انہیں غیر قانونی طریقے سے لانچ میں لے جاتی ہیں اور کسی ویران صحرا میں لے جا کر چھوڑ دیتی ہیں''۔

میں نے کہا''ہاں میں نے سنا ہے مگر واجد کہتے ہیں کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ سب ہی فراڈ نہیں ہوتے۔ پھر یہ کہ وہ مرد ہو کر انجانے خطرات سے ڈر جائیں تو کبھی ایک شاندار مستقبل نہیں بنا سکیں گے''۔

''لیکن جمیلہ! اگر میں ایسے انتظامات کر دوں کہ خطرات کا شبہ ہی نہ رہے اور ایک پیسہ خرچ کیے بغیر واجد وہاں پہنچ کر سات ہزار روپے ماہوار کمانے لگے تو کیسا ہو؟''

میں نے بڑی بے یقینی سے پوچھا''سات ہزار روپے ماہوار؟ مم..... مجھے یقین نہیں آتا۔ آپ یہ ملازمت کس طرح دلوائیں گے؟''

رئیس احمد فدوی نے فخریہ انداز میں کہا''مڈل ایسٹ میں میرا بہت بڑا کاروبار ہے۔ میں یہیں سے تقرری کا لیٹر دوں گا۔ واجد کے یہاں سے جانے کے تمام اخراجات میں برداشت کروں گا۔ تمہاری تسلی کے لیے واپسی کا ٹکٹ بھی اس کے ہاتھ پر رکھ دوں گا۔ اگر وہ ملازمت اس کے مزاج کے خلاف ہو تو وہ کسی وقت بھی بہ آسانی واپس آ سکے گا۔ اور کوئی شرط ہو تو بتاؤ؟''

میں بری طرح الجھ کر رہ گئی۔ بچپن سے جن بالوں کو اپنا غرور بناتی آئی تھی، میں انہیں واجد کے لیے اپنے ماتھے پر شکن لائے بغیر کٹوا سکتی ہوں مگر ایک خوف میرے دل میں ہے کہ ان بالوں کے بغیر واجد کو الوداع کہنے ائیر پورٹ پر جاؤں گی تو ملاقات کے آخری لمحے اور جدائی کی پہلی گھڑی میں میرے پاس ایسا کوئی حسن نہیں ہوگا جسے وہ آنکھوں میں سجا کر لے جائیں۔ میں بہت جلد بھولنے والی چیز بن جاؤں گی۔ کوئی عورت نہیں چاہتی کہ اس کا چاہنے والا نظروں سے اوجھل ہوتے ہی اسے بھول جائے۔ میں کیا کروں؟ اپنی محبت کو باندھ کر رکھنے کے لیے میرے پاس صرف زلفوں کی زنجیر ہے۔

''جمیلہ باجی! مہ جبیں نے کہا''آپ گھبراتی کیوں ہیں؟ بال کاٹنے کے بعد دوبارہ بڑھ سکتے ہیں۔ جب آپ کے واجد صاحب سال دو سال بعد واپس آئیں گے تو آپ کے بالوں میں پھر یہی حسن اور نکھار پیدا ہو چکا ہوگا''۔

''میں اپنی پریشانی کسی کو نہیں سمجھا سکتی۔ ایک شرط پر تمہاری بات مان سکتی ہوں۔ وہ یہ کہ جس دن واجد یہاں سے جائیں گے اس کے دوسرے دن میں تمہیں یہ بال کاٹ کر دے دوں گی''۔

''ڈن''مہ جبیں نے خوش ہو کر رئیس احمد فدوی سے کہا''کیوں ڈارلنگ؟''

''یس ہنی! اٹ از ڈن''رئیس احمد فدوی نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔

میں حیرانی سے دونوں کا منہ تکنے لگی، کیونکہ میں انہیں باپ بیٹی سمجھ رہی تھی لیکن وہ ایک دوسرے کو ڈارلنگ اور ہنی کہہ رہے تھے۔ میں نے کہا''معاف کیجئے گا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ دونوں میں رشتہ کیا ہے؟''

''کیوں نہیں۔ یہ میری جان سے زیادہ عزیز شریک حیات ہے''۔

''اور یہ میرے سرتاج ہیں''مہ جبیں نے کہا۔

میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔ چودہ برس کی بیوی، ساٹھ برس کا شوہر۔ دونوں کو دیکھ کر اس رشتے کا یقین نہیں آ رہا تھا مگر سوچ کر یقین کرنا پڑا کہ اتنی کم سن بیوی کو خوش کرنے کے لیے ہی ایک بوڑھا خاوند میرے بالوں کو اتنے مہنگے داموں خرید رہا ہے اور اس قدر ماڈرن ہونے کے باوجود اپنی بیوی کی کم سنی چھپانے کے لیے اسے برقعہ پہنا رہا ہے تاکہ لوگ انہیں باپ بیٹی نہ سمجھیں جبکہ ہم یہی سمجھ رہے تھے"۔

جمیلہ یہ کہہ کر خاموش ہوگئی۔ ہمیں بھی تھوڑی دیر کے لیے چپ سی لگ گئی۔ ہم کہہ بھی کیا سکتے تھے۔ قانون کے مطابق لڑکی سولہ برس سے کم ہو تو نکاح نہیں ہوتا مگر رئیس احمد فدوی جیسے ساٹھ برس کے دولت مند چودہ برس کی تو کیا چار برس کی بچی کو بھی بیوی بنالیں تو ہم ان کا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟ جمیلہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آئینے میں دیکھنے لگی۔ تھریڈنگ کے بعد اس کی سانولی رنگت نکھر آئی تھی اس نے بل ادا کرتے ہوئے کہا۔

"اگر رئیس احمد فدوی کے وعدے کے مطابق واجد اس ماہ کی پندرہ تاریخ کو سعودی عرب چلے گئے تو میں سولہ تاریخ کو بال کٹوانے آجاؤں گی"۔

وہ سر جھکا کر جانے لگی۔ اس لمحے مجھے یوں لگا جیسے وہ اپنی موت کا دن اور تاریخ مقرر کر کے جا رہی ہو۔ بار بر ماسٹر رمزی نے پوچھا۔

"باجی آپ سولہ تاریخ کو صبح کو آئیں گی یا شام کو؟"

وہ شام کو آنے کی بات کہہ کر دروازے سے باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد ماسٹر رمزی نے میرے قریب آ کر آہستگی سے کہا۔

"یہاں آنے والی خواتین کے لیے بہ خبر بے حد دلچسپ ہوگی۔ آج سے ہم ہر خاتون کے سامنے گفتگو کے دوران سولہ تاریخ کا ذکر ضرور کریں گے مگر یہ نہیں بتائیں گے کہ جمیلہ صبح آئے گی یا شام کو....."

"ایسا کہنے نہ کہنے سے کیا فرق پڑے گا؟" میں نے پوچھا۔

"بہت فرق پڑے گا۔ تم نہیں جانتے یہ بزنس پالیسی ہے، سولہ تاریخ کو دیکھ لینا عورتیں یہاں صبح سے آ کر بیٹھ جائیں گی۔ کوئی بال کٹوانے، کوئی بالوں کے اسٹائل میں چینج لانے یا ہیئر کلرنگ کے لیے یا وگ سیٹ کرانے کے بہانے یہاں جمیلہ کو دیکھنے آئیں گی لہٰذا اس روز ہماری چاندی ہوگی"۔

میں سمجھ گیا۔ کچھ خواتین اس لیے آئیں گی کہ انہوں نے جمیلہ کے بالوں کے لیے اونچی اونچی بولیاں دی تھیں اور جمیلہ نے انکار کیا تھا۔ اب وہ طعنے دینے یا چپکے چپکے ہنسنے آئیں گی کہ اسے آخر بکنا پڑا۔ کچھ اس کی صورت دیکھنے آئیں گی کہ وہ بال کٹنے کے بعد کیسی بدصورت لگتی ہے۔ اپنی خوبصورتی پر ناز کرنے کے لیے بے حد ضروری ہے کہ دوسروں کی بدصورتی کا تماشہ دیکھا جائے۔

جب وہ دن گزر گیا اور دکان بند کرنے کا وقت آیا تو ماسٹر رمزی دن بھر کی آمدنی کا حساب کرنے لگا۔ میں نے اس سے کہا۔

"مے سٹر! صبح تمہاری بات ادھوری رہ گئی تھی۔ تم ثمینہ کے متعلق بھی کچھ کہنا چاہتے تھے"۔

ماسٹر رمزی آمدنی کا حساب بھول گیا۔ نوٹ گنتے گنتے ثمینہ کے نام نے گنتی بھلا دی۔ اس نے سر اٹھا کر آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ثمینہ ایک تحریک ہے جو محبت کے نام سے میرے اندر پیدا ہوئی ہے۔ اس تحریک نے مجھے فٹ پاتھ سے اٹھا کر اس اونچے مقام تک پہنچا دیا۔ جب میں لندن میں اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے جدوجہد کر رہا تھا تو میرے دل میں خیال آیا کہ اب ثمینہ کے والد کو معلوم ہو جانا چاہیے کہ میری حیثیت بدل گئی ہے، میں نے انہیں بڑی عاجزی سے خط لکھا۔ انہیں سمجھایا کہ میں اپنی محنت سے کس مقام پر پہنچ رہا ہوں۔ اگر اشرف المخلوقات بننے کے لیے محنت اور ایمانداری لازمی ہے تو مجھے اشرف اور محنتی سمجھ کر ثمینہ کو انعام کے طور پر میرے نکاح میں دے دیں''۔

اس نے نوٹوں کو سمیٹ کر جیب میں رکھنے کے بعد کہا ''انعام میں یہ کاغذ کے ٹکڑے مل جاتے ہیں مگر محبت نہیں ملتی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ میرے خط کا جواب آئے گا۔ اگر آئے گا بھی تو اس میں میرے لیے غصہ بھری گالیاں لکھی ہوں گی مگر خلاف توقع اس کے باپ نے بڑی عاجزی اور نرمی سے لکھا کہ میں اسے رشتہ مانگنے کے لیے خط لکھ کر اس کی بیٹی کو بدنام نہ کروں۔ اس نے اپنے خط میں مجھے بیٹا کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

''بیٹے! ثمینہ جب سے جوان ہوئی تب سے ہم اسے سہاگن بنانے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ خواب اس لیے دیکھ رہے ہیں کہ اپنی برادری سے باہر ہم اس کی شادی نہیں کر سکتے۔ جب میں دولت مند تھا۔ ان دنوں ثمینہ ٹی بی کی مریضہ تھی۔ اس کے باوجود ہماری برادری کے کتنے ہی نوجوانوں کا رشتہ آتا تھا لیکن ہم پہلے اس کا علاج مکمل کرانا چاہتے تھے لہذا رشتہ مانگنے والے ثمینہ کی صحت یابی کا انتظار کرنے لگے۔ اسی انتظار میں وہ پچیس برس کی ہوگئی، ہم اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ ہمارا سکہ کھرا ہے پچیس برس کے بعد بھی وہ ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔

مگر اچانک ہی کاروبار میں ایسا نقصان ہوا کہ گھر کا سامان بکنے لگا۔ ثمینہ تو تندرست ہوگئی مگر غریبی کا روگ لگ گیا۔ اب پتہ چل رہا ہے کہ غریب اس دنیا کی سب سے گھناؤنی اور چھوت بیماری ہے۔ رشتہ مانگنے والے ثمینہ کی ٹی بی سے نہیں بھاگتے تھے لیکن غریبی سے گھبرا کر بھاگ رہے تھے۔

ایسے وقت تم رشتہ مانگنے آئے تو میں غصہ سے پاگل ہوگیا۔ میں نے تمہیں برتری کے زعم میں گالی دی۔ اس وقت تک یہ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اپنی ہی برادری والوں کی بے رخی میرے لیے کتنی بڑی گالی بن گئی ہے۔ اسی لیے اب میں تمہیں گالی نہیں دے رہا ہوں۔ ہاتھ جوڑ کر التجا کر رہا ہوں اگر تمہارا خط کسی کے ہاتھ لگ جائے تو ثمینہ خواہ مخواہ بدنام ہو جائے گی۔ اب بھی ہم اسی امید پر جیئے جا رہے ہیں کہ کبھی تو ہماری برادری سے کوئی ثمینہ کو اپنی دلہن بنانے کے لیے آئے گا۔ خدا کے لیے ہمیں اس امید کے سہارے جی لینے دو۔

ایک بوڑھے باپ کا خط پڑھ کر میں ثمینہ کی عمر کا حساب کرنے لگا۔ ثمینہ مجھ سے ایک برس چھوٹی ہے۔ میں اسے بچپن سے جانتا ہوں۔ میں اکتیس برس کی عمر میں لندن گیا تو وہ تیس برس کی کنواری تھی اور جب لندن سے سات برس بعد اس کے باپ کو خط لکھا تو وہ سینتیس برس کی ہو چکی تھی اور اب دس برس بعد آیا ہوں تو وہ چالیس برس کی کنواری اب تک برادری سسٹم کی مٹھی میں سہاگن بننے کے خواب دیکھ رہی ہے''۔

ماسٹر رمزی پھر ریوالونگ چیئر پر آ کر آرام سے بیٹھ گیا پھر ایک گہری سانس لینے کے بعد بولا ''میں نے اپنی برادری والوں میں برتری حاصل کرنے کے لیے جھوٹی شان دکھائی کہ ایک انگریز قوم کی لڑکی بیاہ کر لایا ہوں لیکن اس سے مجھے کچھ حاصل نہ ہوا۔ میری برادری کے لوگ مجھ سے خوش نہیں ہیں۔ سوئٹی بھی اب جا چکی ہوگی اور ثمینہ رسم و رواج کے اندھے کنویں میں پڑی ہوئی ہے۔ ساری زندگی جدوجہد کرنے کے بعد میں خالی ہاتھ ہوں''۔

میں نے کہا ''مے سٹر! اگر تم پہلے ہماری برادری میں کسی لڑکی سے شادی کر لیتے تو یہ ناکامی اور مایوسی نہ ہوتی''۔

''یہ تو وہی بات ہوئی کہ گھر میں روٹی کھا لیتے تو باہر بھوکے نہ مرتے۔ لیکن محبت ایک روٹی کا ٹکڑا نہیں ہوتی کہ گھر کے چولہے پر ہی پک کر پیٹ میں اتر جائے۔ محبت تو کہیں بھی ہو سکتی ہے، کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ کوئی بھی برادری ہو، کوئی بھی مذہب ہو وہ محبت سے خالی نہیں ہوتا۔ جو لوگ اپنا اجلا پن قائم رکھنے کے لیے رسم و رواج کی چار دیواری پر سفیدی پھیرتے رہتے ہیں ان کے گھروں کی بوڑھی کنواریاں اپنے سفید بالوں کو گنتی رہتی ہیں اس کے باوجود میں کہوں گا کہ محبت کی حرارت جوان ہوگی اور مجھے سدا جوان رکھنے کے لیے یہ خیال کافی ہے کہ وہ میرے لیے کنواری بیٹھی ہے''۔

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ ہم نے تمام بتیاں بجھا دیں۔ تمام آئینے تاریکی میں اندھے ہو گئے۔ جب صبح ہوگی تو پھر انہیں انسانی چہروں کی بصیرت حاصل ہوگی۔ ہم دکان بند کر کے اپنے اپنے گھروں کی طرف چلے گئے۔

☆ ☆ ☆

قلمکار کلب پاکستان

.....اگر آپ میں لکھنے کی صلاحیت ہے اور آپ مختلف موضوعات پر لکھ سکتے ہیں؟

☆.....آپ اپنی تحریریں ہمیں روانہ کریں، ہم ان کی نوک پلک سنوار دیں گے۔

.....آپ شاعری کرتے ہیں یا مضمون و کہانیاں لکھتے ہیں؟

☆.....ہم انہیں مختلف رسائل و جرائد میں شائع کرنے کا اہتمام کریں گے۔

.....آپ اپنی تحریروں کو کتابی شکل میں شائع کرانے کے خواہشمند ہیں؟

☆.....ہم آپ کی تحریروں کو دیدہ زیب و دلکش انداز میں کتابی شکل میں شائع کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔

.....آپ اپنی کتابوں کی مناسب تشہیر کے خواہشمند ہیں؟

☆.....ہم آپ کی کتابوں کی تشہیر مختلف جرائد و رسائل میں تبصروں اور تذکروں میں شائع کرنے کا اہتمام کرتے ہیں۔

اگر آپ اپنی تحریروں کے لیے مختلف اخبارات و رسائل تک رسائی چاہتے ہیں؟

تو..... ہم آپ کی صلاحیتوں کو مزید نکھارنے کے مواقع دینا چاہتے ہیں۔

مزید معلومات کے لیے رابطہ کریں۔

ڈاکٹر صابر علی ہاشمی

قلمکار کلب پاکستان

0333 222 1689

qalamkar_club@yahoo.com

ہر ماہ کی طرح اس ماہ کی بھی سولہ تاریخ آ گئی۔ اس صبح سب سے پہلے میڈم فیروزہ آئیں اور ماسٹر رمزی سے خوشامدانہ لہجے میں کہنے لگیں۔

''ماسٹر! تم بہت بڑے فن کار ہو اگر چاہو تو جمیلہ کی لانبی زلفوں سے دو وگیں تیار کر سکتے ہو''۔

''مشکل ہے میڈم! جناب رئیس احمد فدوی صاحب نے زلفوں کا پورا لاٹ خرید لیا ہے''۔

''خریدنے سے کیا ہوتا ہے تم ان سے کہنا کہ ایک ہی وگ تیار ہو گی۔ میں تمہیں ابھی پانچ ہزار روپے دیتی ہوں۔ تم ان کے علم میں لائے بغیر دوسری وگ تیار کر کے مجھے دے دو''۔

وہ اپنے پرس سے روپے نکال کر گننے لگی۔ ماسٹر رمزی نے کہا۔

''آپ اور مہ جبیں ہماری مستقل گاہک ہیں اگر مہ جبیں نے آپ کو جمیلہ کے بالوں کی وگ میں دیکھ لیا تو وہ ہم سے ناراض ہو جائے گی''۔

''تم فکر نہ کرو، اگر کبھی اس نے دیکھ لیا تو میں کہہ دوں گی کہ میں نے یہ وگ کسی دوسرے ملک سے منگوائی ہے، کیا اتنی بڑی دنیا میں جمیلہ جیسے بال اور کہیں نہیں پائے جا سکتے؟''

وہ پانچ ہزار کی رقم ماسٹر کے ہاتھ پر رکھ کر چلی گئی۔ یہ اگرچہ مہ جبیں سے بے ایمانی ہوتی مگر بے ایمانی کہاں نہیں ہوتی؟ جمیلہ سے کب ایمانداری کا سودا ہوا تھا۔ اپنے بے ایمانی کو جائز اور وقت کا تقاضا ثابت کرنے کے لیے اسی طرح سارے جہاں کی بے ایمانیوں کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

شام تک عورتیں آتی رہیں اور جمیلہ کے انتظار میں ہماری آمدنی کا ذریعہ بنتی رہیں۔ شام وہ آئی تو اس کے لبوں پر اداس اداس مسکراہٹ تھی۔ اداس اس لیے تھی کہ اس کا واجد جا چکا تھا اور مسکراہٹ اس لیے تھی کہ وہ اپنے محبوب کے لیے قربانی دینے آئی تھی۔ اس کے ساتھ مہ جبیں اور رئیس احمد فدوی بھی تھے۔ ہم نے وقت ضائع نہیں کیا۔ جمیلہ ایک آئینے کے سامنے بیٹھ گئی تو ماسٹر رمزی نے اس کے بالوں کو شانوں کے نیچے ایک فیتے سے باندھ دیا۔ بیوٹی پارلر کی محدود فضا میں گہری خاموشی چھا گئی۔ جہاں ہمیشہ عورتوں کو خوب صورت بنایا جاتا ہے وہاں ایک عورت کو اس کی اکلوتی خوبصورتی سے محروم کر کے بدصورت بنایا جا رہا تھا۔

بندھے ہوئے فیتے کے نیچے بالوں پر قینچی چلنے لگی۔ کرر کرر کی آواز سے قینچی جمیلہ کے ریشمی دل کو کاٹتی جا رہی تھی۔ آئینے میں ماسٹر رمزی، مہ جبیں اور رئیس احمد فدوی جیسے کتنے ہی قاتلوں کے چہرے نظر آ رہے تھے۔ ذرا سی دیر میں کٹے ہوئے گیسو آئینہ کے سامنے اس طرح بچھا کر رکھ دیے گئے جیسے جمیلہ کی لاش رکھی گئی ہو۔ میں نے گھبرا کر آئینے میں اسے دیکھا تو نہ دیکھا گیا۔ جو لڑکی مردہ ہو کر بھی زندہ رہے وہ بڑی بھیانک نظر آتی ہے۔ آپ اپنے مشاہدے کو کام میں لائیں تو یہ حقیقت سمجھ میں آ جائے گی کہ بالوں کو بڑھانے یا گھٹانے سے یا ان کا اسٹائل بدلنے سے چہرے کس طرح بدل جاتے ہیں۔ جمیلہ کا چہرہ وہی تھا مگر چہرے کی جوانی اور تازگی مر گئی تھی۔ اب وہ کم عمر دوشیزہ کی بجائے عمر رسیدہ عورت دکھائی دے رہی تھی۔ گھٹائیں چھٹ جانے کے بعد آسمان ننگا ہو جائے تو دیکھنے کے لئے کچھ نہیں رہ جاتا۔

ایک ایک کر کے سارے تماشائی چلے گئے۔ ماسٹر رمزی نے رئیس احمد فدوی کو سمجھا دیا کہ وگ بنانے کے دوران بہت سے بال ضائع ہو جاتے ہیں لہذا اتنے بالوں سے صرف ایک ہی وگ تیار ہو سکے گی۔ مہ جبیں نے اس بحث کو طول نہیں پکڑنے دیا۔ وہ ایک وگ کے لیے راضی ہو گئی

کیونکہ ایک وگ سے اس کی ضد پوری ہو رہی تھی۔ وہ اپنے بوڑھے خاوند کو لے کر چلی گئی۔ جمیلہ اس وقت بھی گم صم آئینے کے سامنے بیٹھی خود کو دیکھ رہی تھی، خود کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

''باجی!'' میں نے آواز دی تو چونک گئی۔ خالی خالی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔

''سب چلے گئے؟''

''ہاں باجی! سب چلے گئے''۔

''کسی نے مجھے پہچانا نہیں ہوگا؟''

بڑا ہی زہریلا سوال تھا۔ مطلب نکل جانے کے بعد کون پہچانتا ہے۔ ہم بے بسی سے اس کا منہ تکنے لگے۔ وہ اپنے چہرے پر ہاتھ پھرتی ہوئی بولی ''اب میرے چہرے سے میری عمر کا پتہ چل رہا ہوگا۔ میں پورے اکتیس برس کی ہوں''۔

یہ کہہ کر اس نے اپنے ہینڈ بیگ سے برقع نکالا پھر اسے پہننے لگی۔ برقع ایسے ہی وقت کام آتا ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ برقع میں چھپنے والی نے اپنی عمر کیوں نہیں چھپائی اگر وہ نہ بتاتی تو ہم اسے زیادہ سے زیادہ پچیس برس کی کنواری سمجھتے مگر وہ کچھ اور سمجھانے کے لیے اکتیس کا ہندسہ ہمارے ذہن میں چھوڑ گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کہا۔

''مے سٹر! یہ اچھا نہیں ہوا۔ جمیلہ کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے میرا سر مونڈ دیا گیا ہو بے چاری کو بدصورت بنا کر دنیا والوں کو کیا ملا؟''

''کسی کو بگاڑ کر ایک عجیب طرح کی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ تہذیب کی ابتدا سے پہلے انسان ہنسنا نہیں جانتا تھا۔ ایک بار ایک شخص نے کسی بات پر دوسرے شخص کے چہرے پر کالک مل دی۔ اس کالک زدہ چہرے کو دیکھ کر سب ہی ہنسنے لگے۔ تب سے یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ کسی پر کیچڑ اچھال کر یا بدصورت بنا کر اس کے کپڑے اتار کر یا اس سے اپنے مقام سے گرا کر خوب ہنسی آتی ہے۔ آج تک جتنے چٹکلے یا لطیفے گھڑے گئے ہیں ان پر غور کرو تو پتہ چلتا ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کی حماقتوں کی تشہیر کر کے یا اس کی کوئی بدصورتی پیش کر کے یا اس کی توہین کر کے دوسروں کو ہنساتا ہے۔ سب سے قہقہہ آور لطیفے وہ ہوتے ہیں جن میں عورت کی توہین کی جاتی ہے، بے شک ماؤں کے متعلق لطیفے گھڑے گئے ہوں گے مگر وہ قابل اشاعت اس لئے نہیں ہوتے کہ انسان اس سے پیدا ہوتا ہے اور ان کا دودھ پیتا ہے۔ بس اسی مقام پر ہماری خودغرضی کا ثبوت مل جاتا ہے''۔

ماسٹر رمزی بڑے موڈ میں بولتا رہا۔ وہ اس لیے اچھے موڈ میں تھا کہ اس روز توقع سے زیادہ کمائی ہوئی تھی۔ میڈم فیروزہ سے جو پانچ ہزار کی اوپری آمدنی ہوئی تھی اس میں سے مجھے پانچ سو دے کر بولا ''جاؤ موج کرو اور یہ نہ سوچو کہ ایک کو ذبح کرنے سے سب کی بقرعید ہو جاتی ہے''۔

پندرہ دنوں میں دو وگیں تیار ہوئیں۔ رئیس احمد فدوی ایک وگ کی بنوائی کے پانچ سو روپے دے کر اسے اپنی کم سن بیگم کے لیے گھر لے گیا۔ دوسرے میڈم فیروزہ آئیں تو ان کے پیچھے پھکرو (فخرو) بھی ویٹنگ روم میں پہنچ گیا۔ پتہ نہیں دل کو دل سے کیسے راہ ہو جاتی ہے۔ وہ چھوکرا اس بوڑھی کے پیچھے کچے دھاگے سے بندھا آتا تھا۔ اس روز میڈم خوشی سے کھلی جا رہی تھی۔ ماسٹر رمزی نے کہا۔

''میڈم! آپ کے لیے وگ تیار ہے مگر ہم یہاں ڈلیوری نہیں دیں گے۔ آپ اپنا پتا بتا دیں۔ میرا آدمی وہاں جا کر آپ کو وگ

سیٹ کرنا بتا دے گا''۔

میڈم نے اپنے پرس میں سے ایک کارڈ نکال کر دیتے ہوئے کہا۔

''آج شام کو پانچ بجے تم اپنے آدمی کو بھیج دو۔ اس کے جو پیسے ہوں گے، میں وہیں ادا کر دوں گی''۔

یہ کہہ کر وہ ویٹنگ روم میں چلی گئی کیونکہ فخرو وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ ان کا خاموش عشق سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ میڈم کوئی سا انگلش میگزین اٹھا کر ایک صوفے میں بیٹھ جاتی تھی اور بار بار مسکرا کر یوں پہلو بدلتی تھی جیسے ہر پہلو سے اپنی بوڑھی جوانی کی نمائش کر رہی ہو اور فخرو جیسا ناتجربہ کار چھوکرا احساس کمتری میں مبتلا رہتا تھا۔ آخر اس روز میڈم کو ہی ایک قدم آگے بڑھنا پڑا۔

میں نے پارٹیشن کے شیشے کے پار دیکھا۔ جب ویٹنگ روم سے سب چلے گئے تو میڈم اپنی جگہ سے اٹھ کر فخرو کے پاس گئیں۔ اپنا پرس کھول کر ایک کارڈ نکالا پھر اسے فخرو کو دیتے ہوئے کچھ کہا۔ اس کے بعد جواب سنے بغیر وہاں سے چلی گئیں۔ فخرو خوشی سے کانپ رہا تھا، اس کا چہرہ تانبے کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے بہت بڑی دولت مل گئی ہے۔ الو کا پٹھا۔

ماسٹر رمزی کے وعدے کے مطابق میں وگ لے کر میڈم کی کوٹھی میں پہنچا تو ملازم نے مجھے ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ تھوڑی دیر بعد ملازم میرے لیے چائے لے کر آیا۔ میں نے پوچھا۔

''میڈم کیا کر رہی ہیں؟''

''سولہ سنگھار کر رہی ہیں'' اس نے بے زاری سے جواب دیا۔

''تو پھر تم ہی یہاں بیٹھ کر باتیں کرو۔ کچھ تو وقت گزرے گا۔ یہ بتاؤ کیا میڈم اتنی بڑی کوٹھی میں تنہا رہتی ہیں؟ مجھے یہاں کوئی ان کا رشتے دار نظر نہیں آ رہا ہے''۔

ملازم ایک ٹھنڈی سانس لے کر قالین پر بیٹھ گیا، پھر کہنے لگا۔

''میڈم کسی رشتے دار کو یہاں بغیر اجازت آنے نہیں دیتیں۔ انہیں تنہا رہنے میں مزہ آتا ہے''۔

''کیا انہوں نے کبھی شادی نہیں کی؟''

''بارہ برس پہلے ان کا ایک شوہر اور ایک بچہ تھا۔ شوہر غریب تھا مگر غیرت مند تھا۔ وہ میڈم کو منع کرتا تھا وہ کلب وغیرہ نہ جایا کریں۔ اس بات پر آئے دن جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔ وہ ایک غریب شوہر کو حکمران کی حیثیت سے برداشت نہ کر سکیں۔ طلاق لے کر انہیں یہاں سے نکال دیا''۔

''اور بچہ؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ بھی اپنے باپ کی گود میں چلا گیا۔ پتہ نہیں وہ باپ بیٹے کہاں چلے گئے۔ بیٹا اب گیارہ برس کا ہو گیا ہو گا مگر میڈم کی آنکھ سے کبھی اس کے لیے آنسو کا ایک قطرہ نہیں نکلا۔ یہ دیکھ کر بھی یقین نہیں آتا کہ کوئی ماں ایسی سنگدل بھی ہو سکتی ہے''۔

میں نے چائے کا آخری گھونٹ پی کر پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''ہوسکتا ہے کہ وہ کبھی تنہائی میں اپنے بچے کو یاد کر کے روتی ہو۔عورت کبھی ممتا سے خالی نہیں ہوتی''۔

''بھئی آپ مجھ سے زیادہ نہیں جانتے۔جو عورت اس عمر میں بھی سنگھار میز کے سامنے اپنے ہی آپ کو دیکھتی رہتی ہو، وہ کسی عاشق کے بارے میں تو سوچ سکتی ہے کسی بچے کے بارے میں سوچ کر بوڑھی نہیں بن سکتی۔میں اپنی زبان بند رکھنا چاہتا ہوں۔اگر یہ زبان کھل گئی تو.....''

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میڈم نے بیڈ روم سے آواز دی کہ مجھے اندر بھیج دیا جائے۔میں اندر پہنچا تو خواب گاہ تیز قسم کی ولایتی خوشبو سے مہک رہی تھی۔میڈم نے جوانی کا ہر رنگ اپنے اوپر لیپنے پوتنے کے لیے بڑا گہرا میک اپ کیا تھا۔یعنی بڑھاپے سے جوانی کی طرف آنے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش میں نہ ادھر کی رہی تھی نہ ادھر کی۔ان کے ہونٹوں کی لہو رنگ لالی بتا رہی تھی کہ وہ اپنے گیارہ برس کے بچے کا خون چوس کر بیٹھی ہیں۔

میں نے سنگھار میز کے پاس پہنچ کر پلاسٹک کی ڈمی پر کپڑا ہٹایا اور جمیلہ کے باتوں کی وگ ان کے سامنے رکھ دی۔

''اوہ، کتنی خوبصورت وگ ہے'' وہ بالوں پر ہولے سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

''اس پلاسٹک کی ڈمی پر یہ بال اتنے خوبصورت لگ رہے ہیں، جانے میرے سر پر کیسا جادو جگائیں گے۔چلو اسے جلدی سے سیٹ کر دو''۔

اس لمحے میڈم مجھے پلاسٹک کی ڈمی نظر آئیں جو صرف کرائے کی خوبصورتی سے سنواری جاتی ہے۔میں نے اس وگ کو اٹھا کر ان کے سر پر رکھ دیا۔احتیاط سے سیٹ کرنے لگا۔جمیلہ کے سیاہ بالوں کا کفن پہنانے لگا۔وہ بہت خوش تھی۔بار بار آئینے میں خود کو شوخ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔پھر وہ بڑے اعتماد سے بولیں۔

''آج وہ مجھے دیکھتے ہی دیوانہ ہو جائے گا''۔

''کون؟'' میں نے پوچھا۔

''وہی جو تمہارے سیلون میں آتا ہے۔آج بھی آیا تھا۔میں نے اسے چھ بجے آنے کے لیے کہا ہے۔عجیب بھولا بھالا سا جوان ہے مجھ سے بات کرتے ہوئے شرماتا ہے اسی لیے میں آج تک اس کا نام نہ پوچھ سکی''۔

''اس کا نام پھکرو ہے'' میں نے کہا ''یعنی فخر الدین مگر وہ خود اپنا نام صحیح طور پر ادا نہیں کر سکتا۔اپنے آپ کو پھکرو کہتا ہے نرا جاہل ہے''۔

میڈم نے آئینے میں سے گھور کر مجھے دیکھا۔پھر شاید خیال آیا کہ گھور کر دیکھنے سے آنکھوں کا میک اپ بگڑ جائے گا، ابھی ابھی مصنوعی پلکیں لگائی ہیں وہ اپنی جگہ سے ڈھیلی پڑ جائیں گی۔وہ آہستگی سے بولیں۔

''اگر وہ جاہل ہے تو تمہیں اس کی توہین نہیں کرنی چاہیے۔میں اسے پڑھاؤں گی، اسے اونچی سوسائٹی کے قابل بناؤں گی۔جب وہ عمدہ سا سوٹ پہن کر میرے ساتھ کار میں گھومے گا تو ساری دنیا حاسد بن کر ہمیں دیکھتی رہے گی۔شاید میں اب تک اسی لیے کنواری تھی کہ مجھے فخر الدین جیسا محبوب ملنے والا تھا، بلکہ ملنے والا ہے''۔

مجھے بڑا غصہ آیا، کم بخت ہمیں اندھا سمجھتی تھی کہ ہم اسے کھلی آنکھوں سے دیکھتے نہیں ہیں۔ اس کی عمر اور اس کے جھوٹے کنوارے پن کو نہیں سمجھتے ہیں۔ میں نے بڑے تحمل سے پوچھا۔

''اگر آپ فخر الدین سے شادی کرنا چاہتی ہیں تو میں پیشگی مبارکباد دینا چاہتا ہوں''۔

وہ فوراً ہی بوڑھی اداؤں سے جوان لڑکیوں کی طرح شرمانے لگی۔ میں نے کہا۔

''فخر الدین آپ سے زیادہ شرمیلا ہے۔ اگر آپ بھی شرمائیں گی تو پھر بات آگے نہیں بڑھے گی۔ آپ ہاں یا نہ میں جواب دیں''۔

انہوں نے بدستور شرماتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے پھر کہا'' آپ دونوں کا جوڑا بڑا ہی رومانٹک ہے، بڑی اچھی ازدواجی زندگی گزرے گی۔ پھر آپ ایک بچے کی ماں بن جائیں گی''۔

''آں..... ب..... بچہ.....'' وہ آگے کچھ نہ کہہ سکیں، اچانک ہی گیارہ برس پہلے کا پھندا ان کے گلے میں پڑ گیا۔ اگر کوئی سنگدل ماں ہو، اس کے دل میں بچے کی یاد اور آنکھوں میں آنسو نہ ہوں، تب بھی زندگی کے کسی موڑ پر ایک لمحے کے لیے اس کی کوکھ میں درد ضرور اٹھتا ہے۔ صرف ایک لمحے کے لیے میڈم کا چہرہ دھواں دھواں سا ہوا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل کر مسکرانے لگیں۔ اسی وقت ملازم نے آکر بتایا کہ کوئی پکھر الدین نام کا لڑکا ملنے آیا ہے۔ وگ ان کے سر پر سیٹ ہو چکی تھی وہ دائیں بائیں گھوم کر آئینہ میں دیکھتے ہوئے بولیں۔

''ونڈر فل۔ میں کتنی بدل گئی ہوں۔ خود پر مرمٹنے کو جی چاہ رہا ہے۔ اب تم ڈرائنگ روم میں بیٹھو، اگر سیٹنگ میں دوبارہ گڑبڑ ہوئی تو میں تمہیں بلاؤں گی، فکر نہ کرو، تمہیں نقصان نہیں ہوگا میں ڈبل معاوضہ دوں گی''۔

میں نے ڈرائنگ روم کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ ملازم فخرو کو خواب گاہ کی طرف لے جا رہا تھا۔ میں نے فخرو کی عمر کا حساب لگایا۔ وہ بیس بائیس برس کا جوان ہوگا۔ میڈم کی آدھی عمر سے بھی کچھ کم ہوگا۔ مگر اس وقت یہ صداقت نظر آ رہی تھی کہ عشق دماغی طور سے اندھا ہوتا ہے۔

ملازم نے آکر مجھ سے چائے کے لیے پوچھا تو میں نے انکار کر دیا۔ وہ کسی کام سے کوٹھی کے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد کوٹھی کی ویرانی اور سناٹے میں یہ تجسس بڑھنے لگا کہ میڈم کی خواب گاہ میں کیا ہو رہا تھا؟ مجھے وہ تماشہ دیکھنا چاہیے، اگرچہ یہ غیر اخلاقی حرکت ہوگی لیکن خواب گاہ میں کون سے اخلاق کا مظاہرہ کیا جا رہا ہوگا؟ تھوڑی دیر تک میں نے خود کو اس حرکت سے باز رکھنے کی کوشش کی پھر ناکام ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ ڈرائنگ روم اور بیڈ روم کے درمیان ایک کاریڈور تھا۔ جب میں کاریڈور میں پہنچا تو خواب گاہ کا دروازہ بند نظر آیا۔ مگر کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور وہاں سے میڈم کی آواز منتشر ہو رہی تھی۔

''تم بہت شرمیلے ہو۔ میں چار ماہ سے انتظار کر رہی تھی کہ تم آگے بڑھو گے، کچھ بولو گے۔ آخر میں نے تمہیں بلایا ہے تو تم یہاں تک آئے ہو۔ کیا مجھ سے ڈر لگتا ہے؟''

میں نے آگے بڑھ کر کھڑکی کے پردے کی آڑ سے دیکھا سامنے ہی ایک صوفے پر میڈم، فخرو کے ساتھ پھیل کر بیٹھی ہوئی تھی اور فخرو بالکل سمٹا ہوا سا کہہ رہا تھا۔

''آں ہاں ڈر لگتا ہے کیونکہ میں گریب ہوں اور آپ.....''

میڈم نے فوراً ہی بات کاٹ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا''ایسی بات نہ کرو اگر تم غریب ہو تو میں غریب پرور ہوں۔ میں تمہیں اچھی طرح بولنا سکھاؤں گی۔ تمہیں ایک سے ایک عمدہ لباس پہناؤں گی، میری دولت تمہاری ہوگی۔ میں بھی تمہاری ہوں گی، تم اپنے آپ کو چھوٹا سمجھنا چھوڑ دو''۔

''چھوڑ دوں گا، میں کیا کروں۔ بچپن سے مجھے محبت نہیں ملی۔ میرا باپ شرابی، جواری تھا۔ وہ میری بیمار ماں پر جلم کرتا تھا۔ جلم کی بھی ایک انتہا ہوتی ہے وہ برداشت نہ کر سکی۔ جب میں پندرہ برس کا تھا تو وہ مر گئی۔ اس کے بعد میں گھر سے بھاگ گیا محبت کی تلاش میں.....''

وہ فخرو کا ہاتھ محبت سے اپنے ہاتھ میں لے کر بولی''تم بہت دکھی ہو، میں تمہارے دکھ سمیٹ لوں گی''۔

''آپ بڑی مہربان ہیں۔ پہلے ہی دن آپ کو دیکھا تو ایک دم سے اپنی امی کا چہرہ سامنے آ گیا مگر میں ڈرتا تھا کہ میں گریب ہوں اور آپ.....''

میڈم گھبرا کر بولیں''یہ تم کیسی بکواس کر رہے ہو؟''

''اب میں بکواس نہیں کروں گا۔ خود کو چھوٹا نہیں سمجھوں گا۔ مجھے اپنے سینے سے لگا لیجئے امی.....''

تڑاخ کی زوردار آواز کے ساتھ فخرو کے منہ پر طمانچہ پڑا۔

''سور کے بچے! مجھے امی کہتا ہے۔ کیا میں تجھے بوڑھی نظر آتی ہوں؟ ذلیل کتے! میں تیرا منہ نوچ لوں گی، تیری زبان جلا ڈالوں گی''۔

وہ غصے کی شدت سے سچ مچ اس کا منہ نوچنے لگیں۔ اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر جھٹکے دینے لگیں۔ وہ اپنے بچاؤ کے لیے ادھر ادھر یوں ہی ہاتھ چلا رہا تھا کہ ہاتھوں کی زد میں آ کر جمیلہ کے بالوں کی وگ گر پڑی تھی، ململ کا باریک کرتہ پھٹ رہا تھا، چہرے سے میک اپ کا پلاسٹر اکھڑ رہا تھا مگر میڈم کو ہوش نہیں تھا۔ وہ پاگل ہو رہی تھی۔

''دو ٹکے کا چھوکرا باتیں کرنے کی تمیز نہیں ہے۔ اپنی حیثیت سے اونچا اڑنے آیا ہے۔ کتے کمینے۔ اتنے دنوں سے تو مجھے ماں سمجھ کر دیکھ رہا تھا۔ میں تیری آنکھیں پھوڑ دوں گی''۔

ماں کی گالی سے بڑی اور کوئی گالی نہیں ہوتی۔ فخرو کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس نے ماں کہہ کر کون سی گالی دے دی ہے۔ اگر اسے اتنی ہی عقل ہوتی تو وہ ایک دولت مند، فیشن زدہ عورت کے چہرے پر اپنی ماں کا چہرہ نہ دیکھتا۔ ماں سے مشابہت رکھنے والا چہرہ غریبوں کی بستی میں تلاش کرتا۔ بہت دیر تک مار کھانے کے بعد آخر اس نے بوکھلا کر میڈم کو دھکا دیا۔ وہ صوفے پر گر پڑیں۔ وہ بھاگتا ہوا خواب گاہ سے باہر کاریڈور میں آیا۔ مجھے دیکھ کر ایک ذرا ٹھٹک گیا۔ اس کی سہمی ہوئی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ چہرے پر لانبے ناخنوں کی خراشیں پڑ گئی تھیں۔

اس کے گالوں اور ہونٹوں پر جا بجا خون کے ننھے دھبے نظر آ رہے تھے۔ وہاں سرخ لہو کی بجائے سرخ لبوں کے بوسے نظر آ سکتے تھے اگر وہ صرف ماں نہ کہتا، محبوب کہہ دیتا۔

وہ اپنے چہرے کو پونچھتا ہوا وہاں سے بھاگ گیا۔ میں پلٹ کر کھڑکی کے پار دیکھنے لگا۔ وہ صوفے پر جس انداز میں گری تھی، اسی طرح

پڑی ہوئی دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رو رہی تھی۔ دور ایک ریکارڈ پلیئر سے انگریزی گانے کی دھیمی دھیمی سی آواز ابھر کر میڈم کی سسکیوں سے ہم آہنگ ہو رہی تھی۔ ان کے پیچھے دیوار پر ایک نیم عریاں حسین عورت عمر خیام کے زانو پر سر رکھے لیٹی ہوئی شراب کے بھرے ہوئے جام کی طرح چھلک رہی تھی اور صوفے پر جوانی کے خالی جام سے آنسو چھلک رہے تھے۔

تب ریکارڈ پلیئر سے ایک خاص میوزک کی ترتیب کے ساتھ قہقہے سنائی دینے لگے۔ میڈم بوکھلا کر چاروں طرف یوں دیکھنے لگیں جیسے دنیا والے ان پر ہنس رہے ہوں۔ اس وقت صاف طور پر ان کا چہرہ نظر آیا۔ آنسوؤں سے کاجل دھل کر رخساروں پر کالک پھیلا رہا تھا۔ مصنوعی پلکیں جھڑ گئی تھیں آنکھوں کا شاعرانہ حسن مر گیا تھا۔ ہونٹوں کی سرخی پھیل گئی تھی۔ چہرے کے نقوش ٹیڑھے میڑھے ہو گئے تھے جمیلہ کے بال سر سے اڑ گئے تھے۔ کسی سے بھیک مانگ کر خوب صورتی لاؤ یا بیوٹی پارلر سے خریدو، وہ زیادہ دیر تک ساتھ نہیں دیتی۔ جو اصل چہرہ ہے وہ بہت جلد بے نقاب ہو جاتا ہے۔

اچانک ہی وہ اپنے خضاب رسیدہ بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر قہقہے لگانے لگیں۔ ریکارڈ پلیئر کی موسیقی سے ابھرنے والے قہقہوں کے پیش منظر میں وہ ایک چڑیل کی طرح ہی ہی ہی ہنستی جا رہی تھی ''ہی ہی ہی..... یہ جوانی جاتی ہے تو پھر آتی کیوں نہیں'' ہی ہی ہی..... اور جب آتی نہیں ہے تو پھر جاتی کیوں ہے۔ ہی ہی ہی..... میں نے اپنے بچے کی محبت کا گلا گھونٹ دیا تا کہ مجھے کوئی بچے والی نہ سمجھے۔ ہی ہی ہی..... میں نے شوہر کو چھوڑ دیا تا کہ کنواری نظر آؤں۔ میں بیوی ہوں، شوہر سے خالی۔ ہی ہی ہی..... میں ماں ہوں بچے سے خالی۔ میں کنواری ہوں، جوانی سے خالی۔ ہی ہی ہی..... اری او حرام زادی جوانی! میری دولت لے کر ایک بار ایک لمحے کے لیے آ جا۔ نہیں تو چھوکرے ماں کہہ کر گالی دیتے رہیں گے''۔

میڈم کی حالت دیکھ کر میں نے سوچا۔ اب اپنی محنت کا معاوضہ نہیں ملے گا۔ میں ان سے معاوضہ مانگوں گا تو وہ مجھ سے جوانی مانگیں گی جبکہ ہم بیوٹی پارلر میں بیٹھ کر مصنوعی جوانی فروخت کرتے ہیں۔ یہ اس لیے کرتے ہیں کہ عارضی طور پر کسی کو جوان بنا کر اس کے بڑھاپے کا غم ہلکا کر دیں مگر غم ہلکا کہاں ہوتا ہے، وہ تو بوجھ بنتے بنتے پاگل بنا دیتا ہے۔ میں اس پاگل عورت کو اس کے حال پر چھوڑ کر چلا آیا۔

اس دن کے بعد میڈم نے ہماری دکان میں آنا چھوڑ دیا۔ شاید اس خیال سے کہ وہاں فخرو سے سامنا ہو گا۔ فخرو بھی میڈم کے ڈر سے ہماری دکان کا راستہ بھول گیا۔ ہمیں گاہکوں کے چھوٹنے کا زیادہ افسوس نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ پرانے جاتے ہیں تو نئے آتے رہتے ہیں۔ نئے گاہک اپنے جلو میں نئی داستانیں لے کر آتے ہیں۔ کیونکہ بیوٹی پارلر اور ہیئر ڈریسنگ سیلون ایسی جگہ ہے جہاں مرد، عورتیں اپنا کوئی عیب، اپنی کوئی بدصورتی یا اپنی عمر چھپانے آتے ہیں۔ بہرحال مجھے موجودہ داستان سے نمٹنے دیجئے۔

اچھے اور خوبصورت کردار ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔ جمیلہ مجھے ہمیشہ یاد آتی تھی۔ اس کے بغیر مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں اپنے خون کے رشتے سے کٹ گیا ہوں۔ میں ہر روز اس کا انتظار کرتا تھا۔ وہ ہم سے ناراض نہیں ہو سکتی تھی کیونکہ ہم نے اس کی رضامندی سے اس کے بال کاٹے تھے۔ دو ماہ گزر گئے پھر چار ماہ گزر گئے۔ وہ نہیں آئی۔ مہ جبیں اکثر آتی تھی میں نے اس سے پوچھا۔

''باجی! کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ جمیلہ باجی آج کل کہاں رہتی ہیں؟''

یہ سوال کرتے وقت میں آئینے میں دیکھ رہا تھا کیونکہ بلجیم کے آئینے اتنے صاف اور شفاف ہوتے ہیں کہ جواب دینے والا اپنے چہرے

کے تاثرات کو چھپانا چاہے تو نہیں چھپا سکتا۔ وہ جمیلہ کا نام سن کر بہت ہولے سے چونک گئی۔ پھر بہت جلد سنبھل کر تجاہل عارفانہ سے پوچھا۔

''کون جمیلہ؟''

اس سوال میں کتنا غرور تھا، ایک دولت مند لڑکی کے لیے جمیلہ یاد رکھی جانے والی لڑکی نہیں تھی۔ میں نے کہا۔

''وہی جمیلہ باجی جن کے بالوں کی لٹ آپ اکثر.....''

''اوہ اچھا اس کالی کلوٹی بدصورت سی لڑکی.....کو پوچھ رہے ہو۔ کیا میں نے ایسی لڑکیوں کا ٹھیکہ لے رکھا ہے؟ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟ اپنا کام کرو''۔

میں چپ چاپ اس لڑکی کے بال سیٹ کرنے لگا۔ جی چاہتا تھا کہ اس کا گلا دبا دوں مگر اس کے گلے میں ہیرے کا نیکلس تھا۔ ہماری کمزور انگلیاں اتنی قیمتی گردن کو نہیں دبوچ سکتیں لہذا صبر کرنا پڑتا ہے لیکن مہ جبین نے جس طرح جھنجھلا کر جواب دیا تھا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک بدصورت لڑکی سے تھوڑی سی خوبصورتی ادھار لے کر احساس کمتری کا شکار ہو گئی ہے۔

تقریباً دس ماہ بعد ایک دن اچانک ہی جمیلہ آ گئی۔ میں اسے دیکھتے ہی خوشی سے اچھل پڑا۔ ماسٹر رمزی نے اسی وقت دکان کھولی تھی۔ اس لیے کوئی گاہک نہیں تھا۔ صرف وہ تھی اور ہم تھے۔ دوسرے گاہکوں کے آنے تک اطمینان سے باتیں کر سکتے تھے۔ میں نے آئینے کے سامنے ایک ریوالونگ چیئر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آیئے باجی! آپ ایک مدت کے بعد آئی ہیں''۔

''ہاں۔ ایک مدت تک مجھے تھریڈنگ کی ضرورت نہیں پڑی۔ کوئی مجھے دیکھنے والا نہ تھا''۔

وہ کرسی پر آئینے کے سامنے اپنے روبرو بیٹھ گئی۔ بیٹھنے سے پہلے میں نے اس کے بالوں کو دیکھا۔ اس کی زلفیں بڑھتی ہوئی کمر تک پہنچ گئی تھیں۔ ان میں وہی حسن اور ریشم جیسی ملائمت تھی۔ میں نے پوچھا۔

''کیا آپ کے واجد صاحب واپس آ گئے؟''

''وہ گئے کب تھے''۔

''کیا مطلب۔ کیا وہ سعودی عرب نہیں گئے تھے؟''

''ہاں گئے تھے مگر ایک ہفتے میں واپس آ گئے۔ انہوں نے مجھ بال کٹی کو دیکھا تو بددل ہو گئے۔ ناراض ہو گئے کہ میں نے بال کیوں کٹوائے حالانکہ وہ سب کچھ جانتے تھے۔ میں نے پوچھا۔ آپ اتنی جلدی کیوں آ گئے۔ انہوں نے کوئی معقول جواب نہیں دیا۔ یہ کہہ کر چلے گئے کہ واپس آ کر اطمینان سے جواب دیں گے۔

مگر وہ پندرہ دن تک غائب رہے۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ میں ان کے گھر گئی تو دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر انہیں کیا پریشانی ہے؟ مجھے کیوں نہیں بتاتے؟ میں تو ہمیشہ آڑے وقت میں ان کام آتی رہی۔ اگر رئیس احمد فدوی نے ملازمت کا فریب دیا تھا تو مجھے

بتانا چاہیے تھا۔ میں ان سے نمٹ لیتی لیکن کوئی ایسی بات نہیں تھی ایک دن میں نے.....''

کہتے کہتے اس کے حلق میں آواز اٹک گئی ''ایک دن میں نے واجد کو مہ جبیں کے ساتھ شاپنگ کرتے دیکھا''۔

''مہ جبیں کے ساتھ؟'' میں نے اور ماسٹر رمزی نے ایک ساتھ حیرانی سے کہا۔

''ہاں شاپنگ سینٹر کے باہر رئیس احمد فدوی کار کی اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ واجد اور مہ جبیں ہنستے ہوئے باتیں کرتے ہوئے دکان سے باہر آئے اور کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ واجد اتنا قیمتی سوٹ پہنے ہوئے تھا جیسے واقعی سات ہزار ماہوار کما رہا ہو، کار میں بیٹھنے سے پہلے انہوں نے مجھے دیکھا مگر انجان بن گئے۔ میں گم صم کھڑی رہ گئی۔ میں نے بیچ بازار میں اپنے آنسو کیسے ضبط کیے، یہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ گھر آ کر اتنا روئی کہ واجد نے کبھی ہنسایا بھی نہ ہوگا''۔

''یہ آپ بڑا ظلم ہوا ہے باجی! واجد صاحب کو شرم آنا چاہیے''۔

''ہاں انہیں شرم آئی تھی۔ اسی لیے وہ اپنی صفائی پیش کرنے دوسری صبح میرے پاس آئے اور سر جھکا کر کہنے لگے ''تمہیں معلوم ہے جمیلہ! جب تم مجھے الوداع کہنے ایئر پورٹ آئی تھیں تو رئیس احمد فدوی اور مہ جبیں بھی وہاں موجود تھے۔ مہ جبیں مجھ سے بڑی لگاوٹ کی باتیں کر رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا ''مائی گڈنس جمیلہ نے ہمیں کبھی یہ نہیں بتایا کہ تم اتنے ہینڈسم ہو''۔

میں نے مسکرا کہا ''یہ آپ کا حسن نظر ہے''۔

وہ بڑی بے باکی سے کہنے لگی ''مگر تمہارے پاس حسن نظر کی کمی ہے اسی لیے تو جمیلہ پر مرمٹے ہو۔ اگر میں تمہیں یہاں اچھی ملازمت دلا دوں تو کرو گے؟ یہاں میرے ساتھ تمہارا اچھا وقت گزرے گا۔ تم اونچی سوسائٹی میں پہنچ جاؤ گے''۔

''محترمہ! ہر شخص اونچا اڑنا چاہتا ہے''۔

میں مہ جبیں سے کھل کر باتیں نہ کر سکا کیونکہ جمیلہ تم آ گئی تھیں۔ اسی روز میں فلائٹ کے ذریعے جدہ چلا گیا۔ تیسرے دن مہ جبیں اپنے بوڑھے شوہر کے ساتھ وہاں پہنچ گئی تو میں یہی سمجھا کہ رئیس احمد فدوی اپنے کاروبار کے سلسلے میں آئے ہیں کیونکہ وہ آتے ہی جنرل منیجر کے کمرے میں چلے گئے۔ میں آؤٹ ڈور لوکیشن میں بجلی کی زیر زمین وائرنگ کے نقشے کو سمجھنے میں مصروف تھا کہ مہ جبیں وہاں پہنچ گئی۔ اس نے نقشے کو میرے سامنے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

''کیا جانوروں کی طرح دھوپ میں کام کر رہے ہو، چلو میں تمہیں انسان بننا سکھاتی ہوں''۔

وہاں سینکڑوں لوگ دھوپ میں کام کر رہے تھے، مہ جبیں کی نظروں میں کوئی بھی انسان نہیں تھا۔ وہ میرے باس کی بیوی تھی اس لیے مجھے کام چھوڑ کر اس کے ساتھ جانا پڑا۔ وہ ایک کار میں بٹھا کر ایک چھوٹی سی شاندار کوٹھی میں لے گئے۔ اس کار کو ڈرائیور چلا رہا تھا اور وہ میرے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھی انگریزی میں باتیں کر رہی تھی تاکہ ڈرائیور نہ سمجھ سکے۔ اس کی باتوں اور حرکتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ میری بھوکی ہے اور محض میری خاطر وہاں تک آئی ہے۔

کوٹھی میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے بیرونی دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔ میں نے پریشان ہو کر کہا ''آپ کی بے تکلفی مجھے مہنگی پڑے گی۔ میری ملازمت خطرے میں پڑ جائے گی''۔

جمیلہ! تم نے اسے دیکھا ہے وہ چھوٹے سے قد کی لڑکی ہے تمہاری طرح میرے کاندھے تک نہیں آتی۔ اس نے ایک اسٹول پر کھڑے ہو کر کہا ''یہاں آؤ'' میں قریب گیا تو وہ میری گردن میں بانہیں ڈال کر بولی ''ملازمت کی تم فکر نہ کرو۔ یہ ملازمت بھی میں نے دلوائی ہے۔ وہ بڈھا رئیس احمد فدوی میرے اشاروں پر ناچتا ہے، تم میرا ساتھ دو گے تو ہم دونوں مل کر اسے نچائیں گے''۔

ہم تقریباً چھ گھنٹے تک اس کوٹھی میں بند رہے۔ کیسٹ ریکارڈر سے ڈانس کے لیے فاسٹ ٹمپو کا آرکسٹرا ابھرتا رہا اور ہم اس بڈھے کو نچانے سے پہلے خود ناچتے رہے۔ مہ جبیں خوشی سے پاگل ہو رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ بوڑھا فدوی ڈانس نہیں کر سکتا ہے۔ دو چار اسٹیپنگ کے بعد ہی ہانپنے لگتا ہے۔ زندگی میں اور ہے کیا؟ ایک نوجوان خوبرو پارٹنر اور اس کے بعد ڈانس اینڈ بی میری.....''

شام کو رئیس احمد فدوی ورکنگ لوکیشن سے واپس آیا تو مہ جبیں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ چپ چاپ اپنے بیڈ روم میں چلا گیا۔ ایک گھنٹے تک مہ جبیں مجھ سے دور رہی پھر رئیس احمد فدوی نے مجھے اپنے بیڈ روم میں بلایا۔ میں کمرے میں پہنچا تو مہ جبیں اس کے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی، میں دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ رئیس احمد فدوی نے کہا۔

''مسٹر واجد! آج میں نے اپنے جنرل منیجر سے تمہارے متعلق بات کی ہے اس نے کہا ہے کہ یہاں کام زیادہ نہیں ہے اس لیے تمہاری یہاں ضرورت نہیں ہے، گھبرانے کی بات نہیں، ہم نے جمیلہ سے جو وعدہ کیا ہے وہ پورا کریں گے''۔

مہ جبیں نے کہا ''ڈارلنگ! تم جمیلہ سے کیا ہوا وعدہ نہیں بلکہ میری خواہش کے مطابق ایسا کر رہے ہو۔ اپنے الفاظ واپس لو ورنہ میں ابھی چلی جاؤں گی''۔

وہ جانے کے لیے اٹھ گئی۔ بڈھے نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا ''سوری، مجھے معاف کر دو۔ تم تو جانتی ہو کہ میں تمہاری مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا۔ میں تمہارے حکم کے مطابق واجد کو اپنے ساتھ واپس لے جاؤں گا''۔

مہ جبیں نے اپنی بات منوالی اور میں ایک ہفتے کے اندر اس کے ساتھ یہاں واپس آ گیا۔ یہاں میں رئیس احمد فدوی کا سیکرٹری ہوں لیکن حقیقتاً مہ جبیں کا بوائے فرینڈ ہوں۔ وہ بوڑھا ہوس پرست، دولت مند اپنی حسین اور کم سن بیوی کو کھونا نہیں چاہتا۔ سوچتا ہے کہ وہ کسی کے ساتھ بھاگ جائے گی تو دنیا یہی کہے گی کہ بوڑھا تھا اس لیے جوان بیوی پر لگام نہ ڈال سکا۔ وہ یہ بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا لہٰذا اس نے مجھے اپنا سیکرٹری بنا کر لگام ڈال دی ہے''۔

واجد اپنی آپ بیتی سنا رہے تھے اور میں چپ چاپ سن رہی تھی۔ میں کہہ بھی کیا سکتی تھی۔ جنہیں میں نے ٹوٹ کر چاہا اور جن کے لیے اپنی ایک خوبصورتی کو توڑ کر بدصورت بن گئی، جب انہوں نے خود ایک الگ راستہ چن لیا تو میں کیا بول سکتی تھی۔ انہوں نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا۔

''تم بولتی کیوں نہیں؟ کچھ بولو، مجھے جتنی باتیں سنا سکتی ہو سناؤ۔ میں صرف بے وفا نہیں، احسان فراموش بھی ہوں مگر کچھ کہنے سے پہلے یہ

سمجھ لینا کہ فی زمانہ یہی ہوتا ہے۔ آگے بڑھتے وقت پیچھے نہیں دیکھا جاتا، اوپر چڑھتے وقت نیچے گرنے والوں کو نہیں پوچھا جاتا۔ اس کے باوجود میں تم سے ملنے آ گیا ہوں"۔

"آپ نے بڑا احسان کیا مگر اخلاقی قدروں کو بھلا کر یہاں نہ آتے تو اچھا ہوتا"۔

"اخلاق اور انسانیت کا معیار دولت والے ہی بناتے ہیں۔ یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ میں یہ کہنے آیا ہوں کہ میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھول سکتا۔ میں تم سے شادی کروں گا۔ شادی سے پہلے گھر جائیداد اور دولت کے ذرائع کس طرح پیدا کرنے چاہیے یہ میں جانتا ہوں۔ اس لیے تم میری بیوی بن کر رہو گی اور مہ جبیں گرل فرینڈ بن کر رہا کرے گی"۔

میں نے غصے سے چیخ کر کہا" چلے جاؤ یہاں سے اگر لوگ ایسے ہی جیتے ہیں تو میں تمہاری اس دنیا میں جینے سے انکار کر دوں گی۔ میں مر جاؤں گی مگر تمہارے ساتھ کھڑے ہو کر سانس لینا بھی گوارا نہ کروں گی۔ گیٹ آؤٹ....."

مرد ہزار بار گیٹ آؤٹ کہہ دے تب بھی عورت اس کے قدموں سے نہیں جاتی۔ میں نے ایک بار کہا تو وہ چلے گئے۔ اس لیے کہ گیٹ کے باہر دولت اور خوش حالی ہاتھ پھیلائے کھڑی تھی۔ کہتے ہیں زلفوں کی زنجیر بڑی مضبوط ہوتی ہے مگر میں نے وہ بھی اس کے لیے کاٹ ڈالی....."

وہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے آئینے کو دیکھنے لگی۔ یقیناً آئینہ دھندلا رہا ہوگا۔ ماسٹر رمزی نے کہا" اسے بھول جایئے کب تک روتی رہیں گی"۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی" میں صرف اپنے لیے نہیں اس کے لیے بھی رو رہی ہوں کہ اب وہ اس دنیا کے چکلے میں اپنی جوانی کے دوران بکتا رہے گا"۔

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ آئینہ خانہ خالی ہو گیا۔

O☆O

﴿ختم شد﴾

تم کون پیا؟

رومانی معاشرتی اصلاحی ناول نگاروں میں ایک نمایاں نام.....دور حاضر کی چند مقبول ترین مصنفات میں سے ایک.....جو چلے تو جاں سے گزر گئے، میرے خواب ریزہ ریزہ اور اک دیا جلائے رکھنا جیسے شہرہ آفاق ناولوں کی خالق ماہا ملک کا تازہ ترین شاہکار.....تم کون پیا.....ایک دل گداز ناول جو عورت ذات کے مختلف رشتوں کے روپ دکھاتا ہے.....عورت جو اپنے ہر رشتے میں پیار، محبت، ایثار اور قربانی ہے۔

ناول تم کون پیا کتاب گھر کے رومانی معاشرتی اصلاحی ناول سیکشن میں دستیاب ہے۔